نئی پود
تصنیف
ایوان تورگنیف
ترجمہ
انتظار حسین

نئی پود

تصنیف

ایوان تورگنیف

ترجمہ

انتظار حسین

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Ivan Turgenev
Nai Pood/ Ivan Turgenev,
tr. Intizar Hussain.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2005.
272pp.
1. Urdu Literature - Novel.
I. Title.

2005
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-1723-7

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore. Pakistan. Phone 7667970

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

''میں اب دوسرا رستہ اختیار کروں گا۔
مجھے چاہیے کہ پرانی طرز کو ہمیشہ کے لیے سلام کروں
اور اس دوسرے رستے کی تلاش میں نکلوں۔ میں
ایک مدت سے یہ کر رہا ہوں کہ انسانی سیرت سے
عطر نکال کے چھوٹی چھوٹی شیشیوں میں بھرتا ہوں
اور اپنے معزز قارئین کے شامہ کی لذت کا سامان کرتا
ہوں.......لیکن سوال یہ ہے کہ میں کوئی عظیم اور سنجیدہ
چیز تخلیق کر بھی سکتا ہوں؟''

تورگنیف

ایوان سیر گوچ تورگنیف 1818ء میں وسطی روس اوریل میں پیدا ہوا اور 1883ء میں پیرس میں اس کا انتقال ہوا۔ ماسکو، سینٹ پیٹرسبرگ اور برلن میں تعلیم پائی۔ پہلے شعر میں طبع آزمائی کی۔ 1844ء میں نثر کی طرف راغب ہوا۔ اگلے سال مشہور مغنیہ پالین گارشیا سے لگاؤ ہوگیا جو آخر دم تک باقی رہا، لیکن جس کا نتیجہ حسرت و ناکامی کے سوا کچھ نہ نکلا۔ ''نئی پود'' اس کا چوتھا ناول ہے جو 1862ء میں شائع ہوا۔ اس کا شائع ہونا تھا کہ تورگنیف پر لعنت کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ ناول کے انکار پسند ہیرو بازاروف کو انقلاب پسندوں نے اپنے آپ پر طنز سمجھا، لیکن آگے چل کر نئی نسل کے نوجوانوں نے اسے اپنے مزاج کا نمائندہ قرار دیا اور اس کی پیروی کے شوق میں اپنے آپ کو انکار پسند (Nihilst) کہنے لگے۔

(1)

''کیوں بھئی پیاتر۔ دکھائی دیا یا نہیں؟''

یہ 20 مئی 1859ء کا ذکر ہے۔ ایک شخص ننگے سر ایک میلا کچیلا کوٹ اور چیک کا پتلون پہنے س..... کے اڈے پر کھڑا تھا۔ اس کی عمر چالیس سے نکلتی ہوئی ہوگی۔ یہ فقرہ اسی نے کہا تھا۔ اس کا روئے سخن دراصل اپنے نوکر کی طرف تھا اور اس نوکر کی کیفیت یہ تھی کہ وہ گول ہو رہا تھا۔ اس کی مسیں بھیگ چلی تھیں۔ ٹھوڑی پہ چند ایک سفیدی مائل بال اُگ آئے تھے اور آنکھیں چیاں سی اور میلی میلی۔ کانوں میں اودے رنگ کی بالی' لمبے گھنگھریالے چیکٹ بال' چال ڈھال میں اک ذرا شائستگی..... یہ تمام باتیں صاف غمازی کر رہی تھیں کہ یہ ملازم نئی ترقی یافتہ نسل کا ایک فرد ہے۔ بڑی بے فکری سے اس نے سڑک پر ایک نظر ڈالی اور جواب دیا۔

''نئیں صاب۔ وہ تو نئیں دکھائی دیتے۔''

''نہیں دکھائی دیتے؟'' اس کے آقا نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

اور ملازم نے پھر جواب دیا ''نئیں صاب۔''

اس کے آقا نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور ایک چھوٹی سی بنچ پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے پاؤں سکیڑ لیے اور بڑے غور سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اسے یوں بیٹھا رہنے

دیجیے۔ اس موقعہ کو غنیمت جانئے اور لگے ہاتھوں اس سے متعارف ہوتے چلئے۔

اس شخص کا نام نکولائی پیئر وچ کرسانوف تھا۔ پوسٹنگ اسٹیشن سے بارہ میل پرے اس کی بڑی معقول جائداد تھی۔ دوسو آدمی اس کی رعیت میں شامل تھے یا خود اس کے الفاظ میں یوں کہہ لیجیے کہ یہ جائداد تقریباً پانچ ہزار ایکڑ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے کاشتکاروں سے اپنی زمین بانٹ لی تھی اور ایک ''فارم'' قائم کر دی تھی۔ اس کا باپ ہمیشہ ملازمت میں جتا رہا۔ وہ فوج میں جنرل تھا۔ یہ 1912ء کی بات ہے۔ پہلے وہ ایک بریگیڈ کا کمانڈر تھا۔ پھر ڈویژن کمانڈر ہو گیا۔ ہمیشہ صوبوں میں تعینات رہا۔ چونکہ ذی مرتبہ آدمی تھا' اس لیے اس نے خاصے نمایاں کام انجام دیئے۔ یوں وہ بالکل اجڈ تھا اور تعلیم واجبی واجبی ہی پائی تھی' مگر دل کا برا نہیں تھا۔ یوں سمجھئے کہ وہ صحیح معنوں میں روسی تھا۔ اپنے بڑے بھائی پافل کی طرح نکولائی پیئر وچ کی پیدائش بھی جنوبی روس ہی میں ہوئی تھی۔ بڑے بھائی کا تو خیر بعد میں ذکر آئے گا۔ یہاں ذکر نکولائی پیئر وچ کا ہے۔ چودہ سال تک اس کی تعلیم گھر پہ ہی ہوئی تھی۔ سستے قسم کے معلموں اور بے فکرے لیکن چاپلوس فوجی افسروں اور فوجی عملہ کے سارے ملازمین کا جمگھٹا رہتا تھا۔ اس کی ماں کولیازیں خاندان کی چشم و چراغ تھی۔ جب لڑکی تھی تو اگاتھے کہلاتی تھی۔ جب جنرل کے گھر کی رونق بنی تو ایگاتھوکلیا کو زمنشن کرسانوف کہلانے لگی۔ وہ ان فوجی بیگمات میں سے تھی جو اپنے شوہروں کے عہدوں کے جاہ و حشم اور فرائض میں برابر کا حصہ بٹاتی ہیں۔ وہ ہمیشہ بھڑک دار اور سرسراتے ہوئے ریشمیں ملبوس میں دیکھی گئی۔ گرجا میں سب سے پہلے بڑھ کر صلیب کو بوسہ دیتی تھی۔ زبان قینچی کی طرح چلتی تھی اور اس زور شور سے بولتی تھی کہ سارا گھر سر پر اٹھا لیتی تھی۔ بچوں کو ہدایت تھی کہ وہ صبح اٹھ کر اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیں۔ رات کو سوتے وقت انہیں دعائیں دے کر سلاتی تھی۔ سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ زندگی میں اس کے لیے سکھ ہی سکھ تھا۔ نکولائی پیئر وچ تھا تو ایک جنرل کا بیٹا مگر ہمت و شجاعت سے تو اسے دور کا بھی واسطہ نہ تھا بلکہ وہ تو بزدل کے خطاب کا زیادہ مستحق تھا۔ بہرصورت وہ ایک جنرل کا نورنظر تھا اور اس لیے طے یہ ہوا تھا کہ پافل کی طرح اسے بھی فوج میں ملازمت دلا دی جائے' مگر ان حضرت نے ٹھیک اس دن جب ان کے کمیشن میں لیے جانے کی خبر آئی' اپنی ٹانگ توڑ لی اور دو ماہ

تک چار پائی کی زینت بنے رہے۔اس کے بعد جب اٹھے تو پاؤں میں لنگ آ گیا جس نے مرتے دم تک پیچھا نہ چھوڑا۔ باپ نے بھی سمجھ لیا کہ کمبخت نالائق ہے اور یہ سوچ کر اس نے اسے سول سروس کی اجازت دے دی۔ جب اٹھارواں برس لگا تو وہ اسے لے کر سیدھا پیٹرسبرگ پہنچا اور یونیورسٹی میں داخل کرا دیا۔ اتفاق دیکھئے کہ اسی زمانے میں اس کا بھائی گارڈ افسر ہو گیا اور دونوں بھائی ایک ہی جگہ برابر دو کمروں میں رہنے لگے۔ ننھیال میں ان کے ایک دور کے بھائی الیا کولیازین تھے اور بڑے معقول عہدے پر فائز تھے۔ وہ ان دونوں بھائیوں کے نگران مقرر ہوئے۔ لڑکوں کا انتظام کر کے والد صاحب اپنی نوکری اور اپنی بیوی کے پاس پلٹے اور اس کے بعد وہ کبھی کبھار اپنے بیٹوں کو بادامی کاغذوں کا ایک طومار لپیٹ کر بھیج دیتے تھے، جن میں منشیانہ خط میں کچھ کیلا کانٹی ہوتی تھی۔ صفحوں کے بالکل آخر میں سب سے نیچے بڑے اہتمام سے اور بڑے منشیانہ انداز میں ''پیاتر کرسانوف جنرل میجر'' کے الفاظ لکھے رہتے تھے۔ 1835ء میں نکولائی پیئر وچ یونیورسٹی سے گریجوایٹ بن کر نکلا اور اسی سال جنرل کرسانوف پنشن یافتگان کی صف میں داخل ہو گئے۔ بیگم کو ہمراہ لے کر وہ پیٹرسبرگ پہنچے اور وہاں رہ پڑنے کی ٹھانی، مگر ابھی ٹاورشسکی گارڈنز میں ایک مکان خریدنے کے انتظامات ہو ہی رہے تھے اور انگریزی کلب میں ابھی شامل ہوئے ہی تھے کہ یکایک انہیں مرگی کا دورہ پڑا اور وہ آناً فاناً چٹ پٹ ہو گئے..... ایگاتھوکلیا کوزمنشنا بھی ان کے پیچھے پیچھے ملک عدم کو سدھاریں۔ پیٹرسبرگ کی غیر دلچسپ فضا انہیں راس نہ آئی۔ رجمنٹ سے الگ رہ کر ان کے لیے جینا اجیرن ہو گیا اور آخر تنہائی کے غم میں گھل گھل کر وہ اس دنیا سے چل بسیں۔

نکولائی پیئر وچ کی سنیے۔ ابھی والدہ زندہ ہی تھیں اور اس حادثے سے انہیں خاصا ملال بھی ہوا تھا کہ پیئر وچ کا ایک چھوٹے موٹے افسر پریپلونسکی کی بیٹی سے عشق لڑ گیا۔ لونڈیا خوبصورت تھی بلکہ عرف عام میں یوں کہیے کہ روشن خیال لڑکی تھی۔ اخبارات میں سائنس کے جو کالم ہوا کرتے تھے،ان میں شائع ہونے والے خشک مضامین پڑھنے کی اسے بڑی لت تھی۔ اِدھر سوگ کی مدت ختم ہوئی اور اُدھر پیئر وچ نے اس سے بیاہ رچایا۔ اس کے باپ نے جو بہت بھاگ دوڑ کر کے سول سروس میں اسے نوکری دلا دی تھی، اسے

اس نے خیر باد کہا اور اپنی ماشا کے ساتھ گلچھڑے اڑانے لگا۔ پہلے اس نے لینی انسٹی ٹیوٹ کے قریب ایک دیہاتی بنگلہ میں ڈیرا جمایا۔ پھر شہر میں جا کر ایک صاف ستھرے زینے اور بنے سنورے ڈرائنگ روم والے فلیٹ کو کرائے پر لیا اور پھر وہ گاؤں میں آ گیا اور وہاں مستقل طور پر رہ پڑا۔ تھوڑے ہی دن ہوئے ہوں گے کہ اس کے گھر ایک بیٹا ارکادی پیدا ہوا۔ دونوں میاں بیوی بڑی ہنسی خوشی سے دن گزارتے تھے۔ ایک دوسرے سے دم بھر کو جدا نہ ہوتے تھے۔ ساتھ پڑھتے تھے' ساتھ گاتے بجاتے تھے۔ وہ اپنے پھولوں کی دیکھ بھال کرتی تھی اور مرغیوں کی خبر رکھتی تھی۔ وہ کبھی بھولا بھٹکا شکار پہ نکل جاتا تھا اور جائداد کا کام دیکھ بھال لیتا تھا اور اس امن واطمینان کے ماحول میں ارکادی کی پرورش ہو رہی تھی۔ دس سال خواب کی طرح گزر گئے۔ 1847ء میں کرسانوف کی بیوی اللہ کو پیاری ہوگئی۔ اس حادثے نے اس کی کمر توڑ دی۔ چند ایک ہفتے گزرے ہوں گے کہ اس کے بال سفید پڑ گئے۔ اس نے ہمت باندھی کہ لاؤ کہیں اور نکل جاؤں اور دل اور سا کر آؤں..... مگر پھر 1842ء کا سال آن دھمکا۔ طوعاً و کرہاً اسے گاؤں واپس جانا پڑا۔ ایک طویل مدت تک اس پر بے حسی کی کیفیت طاری رہی مگر پھر رفتہ رفتہ اس نے اپنی زمین کے انتظام کی درستی میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ 1855ء میں وہ اپنے بیٹے کو یونیورسٹی لے کر آیا۔ تین جاڑے اس نے اس کے ساتھ پیٹرسبرگ میں گزار دیئے اور اس شان سے کہ گھر سے قدم باہر نہ نکالا۔ وہ تو بس ارکادی کے دوستوں سے جان پہچان کرنے میں مصروف رہتا تھا مگر پچھلے جاڑوں میں وہ وہاں نہیں جا سکا تھا اور یہ مئی 1859ء کی بات ہے کہ وہ یوں کھڑا دیکھا گیا۔ اس کے سر کے بال اب خاصے سفید ہو چلے تھے۔ اس کا جسم پلپلا ہو گیا تھا۔ کمر ذرا ایک جھک گئی تھی۔ وہ یہاں کھڑا اپنے بیٹے کا انتظار کر رہا تھا جس نے ان دنوں ڈگری حاصل کی تھی۔ اسی طرح جس طرح اس نے ایک زمانے میں ڈگری حاصل کی تھی۔

اسے ملازم کا پاس ادب کہہ لیجیے اور غالباً ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ مالک کی آنکھوں کے سامنے رہنے سے گھبراتا تھا اور اس لیے وہ پھاٹک پہ جا کھڑا ہوا تھا اور وہاں کھڑا پائپ پی رہا تھا۔ نکولائی پیئر وچ سر جھکا کر زمین پہ پڑتے ہوئے قدموں کو تکنے لگا۔ ایک چیتوں والی بڑی سی مرغی اطمینان سے ٹہلتی ہوئی اس کی طرف آ رہی تھی۔ ایک مٹیالے رنگ

کی بلی نے گھور کر اسے دیکھا اور پھر جھینپ کے انداز میں جنگلے کے گرد البیٹ کھانے لگی۔
سورج پوری شدت سے چمک رہا تھا۔ پوسٹنگ اسٹیشن کے نیم تاریک راستے سے گرم ڈبل روٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی تھی۔ نکولائی پیئر وچ تصور کی دنیا میں جا پہنچا تھا۔ ''میرا بیٹا..... گریجوایٹ..... ارکیشا.....'' یہ خیالات تھے جو بار بار اس کے ذہن میں وارد ہوتے تھے۔ اس نے ان خیالات سے ہٹ کر کچھ اور سوچنے کی کوشش کی مگر ہر بار وہی خیالات آ دھمکتے تھے۔ اسے اپنی مرحوم بیوی یاد آ گئی..... بڑے غمگین لہجہ میں وہ بڑبڑانے لگا۔ ''اسے یہ بہار دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔'' گہرے نیلے رنگ کا ایک موٹا تازہ کبوتر سڑک پر اڑتا نظر آیا۔ اس نے تیزی سے ایک غوطہ کھایا اور کنوئیں کے قریب میلے پانی کے ایک گڑھے پہ حلق تر کرنے جا پہنچا۔ نکولائی پیئر وچ اسے غور سے دیکھنے لگا مگر یکا یک قریب آتے ہوئے پہیوں کی گڑگڑاہٹ پہ اس کے کان کھڑے ہوئے۔

''اجی یوں لگے ہے کہ وے آ گئے۔'' ملازم نے دروازے پہ کھڑے اچانک آواز لگائی۔

نکولائی پیئر وچ اچھل پڑا اور سڑک پہ نظریں دوڑائیں۔ تین گھوڑوں کی ایک گاڑی آتی دکھائی دے رہی تھی۔ گاڑی میں اس نے ایک طالب علم کی ٹوپی کی نیلی دھاری کی، ایک چہیتی صورت کی ایک اڑتی ہوئی سی جھلک دیکھی۔

''ارکاشا۔ ارکاشا۔'' کرسانوف چلّانے لگا اور پھر ہاتھ ہلا ہلا کر اس نے بھاگنا شروع کر دیا..... اور چند لمحوں بعد اس کے ہونٹ نوجوان گریجوایٹ کے گرد آلود، دھوپ سے تمتماتے ہوئے ڈاڑھی مونچھ کے جھمیلے سے آزاد رخساروں پر چسپاں تھے۔

(2)

''ابا جان۔ میں ذرا کپڑے تو جھاڑ لوں۔ میری وجہ سے آپ بھی گرد میں اٹے جا رہے ہیں۔'' باپ کی گرمجوشیوں کا یہ جواب ارکادی نے جس لہجہ میں دیا، اس میں خوشی کی لہک صاف نمایاں تھی۔ سفر سے اس کی آواز میں تھکن ضرور پیدا ہو گئی تھی، لیکن اس میں ایک

کھلنڈرا پن تھا، گھنٹی کی آواز کی سی چمک تھی۔

''کوئی بات نہیں ہے۔ کوئی بات نہیں ہے۔'' اور نکولائی پیئر وچ شفقت آمیز انداز میں مسکرانے لگا۔ اس نے اپنے بیٹے کے کپڑوں کو اور پھر اپنے کوٹ کو ایک دو مرتبہ جھٹک کر جھاڑا۔ پھر وہ پیچھے کی طرف ہٹ کر کہنے لگا۔ ''بیٹا میں تمہیں ایک نظر دیکھ تو لوں۔'' مگر فوراً ہی وہ لپک جھپک اسٹیشن کے احاطہ کی طرف چلا اور چلّانے لگا۔

''ارے بھئی اِدھر۔ اُدھر۔ گھوڑوں کو فوراً لے آؤ۔''

نکولائی پیئر وچ تو بیٹے سے بھی زیادہ بے قرار ہوا جا رہا تھا۔ وہ اک ذرا گھبرا بھی گیا تھا اور کچھ کچھ جھینپ بھی رہا تھا۔ ارکادی نے اسے ٹوکا۔ ''ابا جان میرے دوست بازاروف سے تو مل لیجیے۔ ان کے متعلق خطوں میں تو آپ کو بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ ان کی مہربانی ہے کہ انہوں نے ہمارے ساتھ ٹھہرنے کا اقرار کر لیا ہے۔

نکولائی پیئر وچ جلدی جلدی آگے بڑھ کر اس لمبے تڑنگے شخص کے قریب پہنچا، جس نے ایک موٹا سا ڈھیلا ڈھالا جھالر والا کوٹ پہن رکھا تھا اور جو ابھی ابھی گاڑی سے اترا تھا۔ اس نے بڑی گرمجوشی سے اس سے مصافحہ کیا، اگرچہ بازاروف نے اک ذرا تکلف سے ہاتھ بڑھایا تھا۔ یوں بھی اس کے ہاتھوں کے دستانے تو غائب ہی تھے۔

''بڑی خوشی ہوئی۔ آپ کی کرم فرمائی کا بے حد ممنون ہوں..... آپ کا اسم شریف۔ آپ کے والد کی تعریف۔''

''یوگین وسل یوچ'' بازاروف کی آواز تھی تو ڈھیلی ڈھالی، لیکن اس میں مردانہ پن ضرور جھلک رہا تھا۔ اس نے اپنے کوٹ کے کھڑے کالر کو پلٹا اور یوں نکولائی پیئر وچ کو اس کا پورا چہرہ دیکھنے کا موقع میسر آیا۔ چہرہ لمبوترا اور سوتا ہوا تھا۔ چوڑی پیشانی، بڑی بڑی سبزی مائل آنکھیں، ناک ابتدا میں تو چپٹی ہی تھی لیکن نوک پہ جا کر نوکیلی ہو گئی تھی۔ مونچھیں بھورے رنگ کی تھیں اور نیچے کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔ چہرے سے خود اعتمادی اور ذہانت ٹپکتی تھی اور وہ آسودہ مسکراہٹ مستزاد جس نے پورے چہرے کو لَو دے دی تھی۔

نکولائی پیئر وچ پھر بولا: ''یوگین وسل یوچ۔ ہمارے یہاں آپ کا دل تو نہیں گھبرائے گا۔''

بازاروف کے لب ہلتے تو محسوس طور پر دیکھے گئے مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہاں بس اپنی ٹوپی اتار لی۔ اس کے بال لمبے لمبے اور گھنے تھے مگر اس کے باوجود اس کے سر کے گومڑے صاف نظر آ رہے تھے۔

نکولائی پیئر وچ اب اپنے بیٹے سے مخاطب ہوا اور پوچھنے لگا: ''تو بھئی ارکادی گھوڑے ابھی جوت دیئے جائیں یا تم ستاؤ گے۔''

''اب تو بس گھر جا کر ہی ستائیں گے۔ گھوڑے جتوا ہی دیجیے۔''

باپ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''ہاں ہاں۔ فوراً۔ ابھی لو۔ اے پیاتر۔ ارے سن رہا ہے۔ لونڈے باشا فٹافٹ گاڑی تیار کر لے۔''

پیاتر ٹھہرا نئے زمانے کا ملازم۔ وہ بھلا اپنے نوجوان آقا کے ہاتھوں کو بوسہ کیوں دینے لگا تھا۔ اس نے دور ہی سے کھڑے کھڑے ایک سلام جھکا دیا اور پھر پھاٹک کی پرلی طرف کہیں غائب ہو گیا۔

''میں تو گاڑی لے کر آیا تھا مگر تمہاری کوچ کے لیے بھی تین گھوڑے موجود ہیں۔'' نکولائی پیئر وچ تو آج ذرا ذرا سی بات پہ ہنگامہ پیدا کرنے پہ تلا ہوا تھا مگر ارکادی بدستور پانی پینے میں مصروف رہا۔ اسٹیشن کی انچارج عورت نے ایک لوہے کے ڈول میں پانی لا کر اسے دے دیا تھا اور بازاروف نے پائپ سلگا کر پینا شروع کر دیا۔ وہ ٹہلتا ٹہلتا اس ڈرائیور کے قریب جا پہنچا جو گھوڑے جوتنے میں مصروف تھا۔

نکولائی پیئر وچ نے پھر شور مچایا: ''ارے بھئی گاڑی میں تو بس دو نشستیں ہیں۔ تمہارے دوست کیسے.....؟''

اور ارکادی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا: ''وہ کوچ میں چلا جائے گا۔ اس سے تکلف برتنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو لاکھ روپے کا آدمی ہے۔ تصنع اور تکلف تو اس میں نام کو نہیں۔ آپ اسے ذرا دیکھئے گا۔''

نکولائی پیئر وچ کا کوچوان گھوڑوں کو لے کر آ پہنچا تھا۔ بازاروف اس سے کہنے لگا: ''ڈڈھیل میاں ذرا جلدی کر دنا۔''

پاس ہی ایک اور ڈرائیور اپنے کھال کی کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے کھڑا تھا۔

اس نے ٹکڑا لگایا: ''ابے میٹیا سن رااے بے۔ میاں نے تجھے کیا کہا۔ ڈ ڈھیل ہے نا تو۔''

میٹیا نے اپنے ٹوپ کو ایک جنبش دی اور پھر گھوڑا جوتنا شروع کر دیا۔

نکولائی پیئر وچ چلّانے لگا: ''ارے بھئی جلد کرونا۔ جلدی۔''

چند منٹ میں گھوڑے جت گئے۔ باپ بیٹے گاڑی میں ڈٹ گئے۔ پیا تر چڑھ کر آگے بیٹھ گیا۔ بازاروف اچک کر کوچ میں جا بیٹھا اور اپنا سر چمڑے کے گدے پہ ٹکا لیا اور دونوں گاڑیاں روانہ ہو گئیں۔

(3)

''اچھا تو پھر تم نے بی اے کر ہی لیا اور اب تم واپس آ ہی گئے۔'' نکولائی پیئر وچ کی عجب حالت ہو رہی تھی۔ کبھی وہ ارکادی کے کاندھے اور کبھی گھٹنے چھوتا تھا اور بار بار کہہ رہا تھا: ''اچھا تو تم آ گئے۔''

''تایا جان کیسے ہیں۔ اچھے ہیں نا۔'' ارکادی اگرچہ بچوں کی طرح دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں، مگر پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ گفتگو جذباتیت کی نہج سے ہٹ کر روزمرہ کی باتوں کی شکل اختیار کر لے۔

''ہاں ہاں خدا کا فضل ہے بلکہ وہ تو تم سے ملنے کے لیے میرے ساتھ آنے کا ارادہ کر رہے تھے مگر پھر کسی وجہ سے یہ ارادہ ترک کر دینا پڑا۔''

''اور آپ میرا انتظار کب سے کر رہے تھے؟'' ارکادی نے ایک اور سوال کر مارا۔

''کوئی پانچ گھنٹے سے۔''

''ابا جان آپ بہت اچھے ہیں۔'' اور ارکادی نے یکایک پہلو بدلا اور باپ کے گال پہ چٹاخ سے ایک پیار کیا۔ نکولائی پیئر وچ کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

''میں نے تمہارے لیے ایک بڑا اچھا گھوڑا رکھ چھوڑا ہے۔'' وہ کہنے لگا: ''چل کر تم دیکھ ہی لو گے اور تمہارے کمرے میں ابھی انہیں دنوں کاغذ لگوائے گئے ہیں۔''

''اور بازاروف کے لیے بھی کوئی کمرہ وِمرہ ہے؟''

''اس کے لیے بھی انتظام ہو ہی جائے گا۔''

''ابا جان۔ اس کی خوب خاطر کرنا۔ آپ کو کیسے بتاؤں۔ بس اس کی دوستی پر میں جان دیتا ہوں۔''

''کیا ابھی حال ہی میں تمہاری اس سے دوستی ہوئی ہے؟''

''جی ہاں۔ ابھی تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے۔''

''ہاں جب ہی تو میں کہوں کہ پچھلے جاڑوں میں تو مَیں نے اسے دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ پڑھتا کیا ہے؟''

''اس کا خاص مضمون تو نیچرل سائنس ہے مگر ویسے وہ ہر چیز جانتا ہے۔ اگلے سال وہ ڈاکٹری پاس کر لے گا۔''

''اچھا تو وہ ڈاکٹری پڑھتا ہے۔'' نکولائی پیئر وچ یہ کہہ کے تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد اس نے ہاتھ باہر نکالے اور اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''پیاتر۔ یہ ہمارے کاشتکار ہی جا رہے ہیں نا؟''

پیاتر نے اس کے اشارے کی سمت میں دیکھا۔ چند گاڑیاں تھیں جن میں بے لگام کے گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ ایک پتلی سی پگڈنڈی پہ وہ سرپٹ دوڑے چلی جا رہی تھیں۔ ہر گاڑی میں ایک ایک دو دو کاشتکار کھال کے بغیر بٹنوں کے کوٹ پہنے ہوئے تھے۔

''جی صاب۔'' پیاتر نے جواب دیا۔

''وہ جا کہاں رہے ہیں۔ شہر کو؟''

''ہاں جی شہر ہی جا رئے ہوں گے یا شاید تاڑی خانے جا رئے ہوں۔'' اس کے لہجہ میں ایک حقارت کا احساس جھلک رہا تھا۔ اس کا رخ اک ذرا کوچوان کی طرف ہو گیا۔ گویا وہ اس سے کچھ کہے گا، مگر کوچوان اسی طرح پتھر بنا بیٹھا رہا۔ یہ شخص پرانی وضع کا آدمی تھا۔ نئی تانتی کے نئے خیالات کا وہ بالکل روادار نہیں تھا۔

نکولائی پیئر وچ نے اپنے بیٹے کی طرف متوجہ ہو کر پھر باتیں چھیڑ دیں۔ ''اس سال کاشتکاروں سے بڑی جھڑ جھڑ کرنی پڑی۔ وہ محصول ادا نہیں کریں گے۔ بھلا ایسے لوگوں

کا کیا علاج ہے؟''

''مگر آپ اپنے کرائے کے مزدوروں سے بھی مطمئن ہیں؟''

''ہاں اں۔'' نکولائی پیئر وچ نے منہ ہی منہ میں کہا۔ ''آفت یہ ہے کہ انہیں میرے خلاف بھڑکایا جا رہا ہے اور وہ جی لگا کر کام نہیں کرتے۔ اوزار توڑ پھوڑ ڈالتے ہیں مگر خیر انہوں نے زمین تو خاصی اچھی طرح جوت دی ہے۔ حالات ذرا درست ہو جائیں تو پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کھیتی باڑی سے تمہیں اب دلچسپی رہی یا نہیں؟''

''یہ خراب بات ہے کہ آپ نے کوئی سائبان نہیں بنوایا۔'' ارکادی آخری سوال کا جواب گول کر گیا تھا۔

نکولائی پیئر وچ بولا: ''بالکنی کی شمالی سمت میں مَیں نے کینوس کی ایک بڑی سی چھت پٹوادی ہے۔ اب ہم باہر کھلی ہوا میں بھی کھانا کھا سکتے ہیں۔''

''پھر تو وہ بالکل گرمیوں کا بنگلہ بن جائے گا..... خیر یہ تو سب فضول باتیں ہیں۔ مگر یہاں بڑی کھلی فضا ہے۔ کیسی بھینی بھینی خوشبو آ رہی ہے۔ جیسی خوشبو یہاں ان سبزہ زاروں میں تیر رہی ہے، ایسی خوشبو تو دنیا میں کہیں بھی نہیں ہو گی۔ اور پھر آسمان کو دیکھو۔''

ارکادی بولتے بولتے اچانک رک گیا۔ اس نے کنکھیوں سے پیچھے دیکھا اور پھر خاموش ہو گیا۔

نکولائی پیئر وچ کہنے لگا: ''تم یہاں پیدا بھی تو ہوئے ہو۔ اسی لیے تو تمہیں یہاں کی ہر چیز میں خاص.....''

''چھوڑیئے بھی ابا جان۔ کوئی کہیں بھی پیدا ہو، اس سے فرق کیا پڑتا ہے۔''

''پھر بھی.....''

''اجی نہیں اس سے مطلق کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

نکولائی پیئر وچ نے نظر بھر کر بیٹے کو دیکھا اور چپ ہو گیا اور جب دوبارہ گفتگو شروع ہوئی تو گاڑی آدھ میل آگے نکل چکی تھی۔

''میں نے تمہیں لکھ دیا تھا یا نہیں، کچھ یاد نہیں پڑتا۔'' نکولائی پیئر وچ کہنے لگا: ''وہ تمہاری بوڑھی نرس یگور وفنا تھی نا۔ اس کا انتقال ہو گیا۔''

''اچھا؟ ہا بیچاری مرگئی۔ اور پروکوفش تو ابھی زندہ ہے نا؟''

''ہاں زندہ ہے اور ایسا زندہ ہے کہ رتّی بھر اس میں فرق نہیں آیا۔ جیسے پہلے بڑبڑاتا رہتا تھا' اب بھی اسی طرح بڑبڑاتا رہتا ہے۔ بس یوں سمجھو کہ میرینو میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔''

''آپ کا کارندہ وہی ہے نا؟''

''بھئی حالات اب بہت بدل گئے ہیں۔ میں نے طے کرلیا ہے کہ کسی آزاد کاشتکار کو نہ رکھا جائے یا کم از کم انہیں ذمہ داریاں اور فرائض نہ سونپے جائیں۔'' (ارکادی نے پیاتر پر نگاہ ڈالی) نکولائی پیئر وچ نے آہستہ سے کہا: ''دراصل وہ تو آزاد ہو چکا ہے۔ دیکھو نا وہ اب صرف ملازم ہے۔ اب تو میں نے شہر کے ایک شخص کو کارندہ رکھ لیا ہے۔ خاصا چلتا ہوا آدمی نظر آتا ہے۔ میں اسے ڈھائی سو روبل سالانہ دیتا ہوں۔ لیکن.....'' نکولائی پیئر وچ پیشانی اور بھوؤں پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس کی یہ حرکت ہمیشہ کسی اندرونی الجھن کی غماز ہوتی تھی۔ ''میں ابھی کہہ رہا تھا کہ میرینو میں تبدیلیاں نہیں ہوئی ہیں..... یہ کچھ زیادہ صحیح نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں تمہیں پہلے سے بتادوں اگرچہ.....''

وہ ایک لمحہ کے لیے ہچکچایا اور پھر فرانسیسی میں کہنے لگا: ''کٹر قسم کا دقیانوسی تو میری اس بے تکلفی کو نازیبا ہی بتائے گا' لیکن اوّل تو یہ کہ یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ پھر دوسرے یہ کہ تمہیں خوب معلوم ہے کہ باپ بیٹوں کے تعلقات کے بارے میں میرے خیالات ہمیشہ سے کچھ مختلف رہے ہیں مگر یہ بھی صحیح ہے کہ تمہارا مجھے الزام دینا بجا ہوگا۔ اس عمر میں..... مختصر یہ کہ..... وہ..... وہ لڑکی ہے نہیں جس کا تذکرہ غالباً تم سن بھی چکے ہو۔''

ارکادی نے بڑی بے تکلفی سے پوچھا: ''فینشکا؟''

نکولائی پیئر وچ جھینپ گیا۔ ''آہستہ نام لو نا..... بات یہ ہے.....اب وہ میرے ساتھ ہی ہے۔ میں اسے گھر لے آیا ہوں..... وہاں دو چھوٹے چھوٹے کمرے تو ہیں ہی مگر خیر وہ تو سب کچھ بدلا جاسکتا ہے۔''

''ابا جان۔ آپ کمال کرتے ہیں۔ آخر کیوں۔ کس لیے؟''

''بھئی تمہارے ہمراہ تمہارے دوست بھی تو ہیں نا..... ذرا کچھ برا سا معلوم ہوگا.....''

''آپ بازاروف کی مطلق فکر نہ کریں۔ وہ اس قسم کی باتوں سے بے نیاز ہے۔''
''مگر تم بھی تو..... میرا مطلب ہے کہ چھوٹے گھر کی حالت تو بہت خستہ ہے۔''
ارکادی ٹوکتے ہوئے بولا: ''ابا جان۔ آپ حد کرتے ہیں۔ آپ تو گویا معذرت کر رہے ہیں۔ آپ کو شرم بھی تو نہیں آتی۔''
نکولائی پیٹر وچ اور جھینپ گیا اور کہنے لگا۔ ''ہاں ہاں مجھے شرم تو آنی چاہیے۔''
''ابا جان آپ تو فضول باتیں کیا کرتے ہیں۔'' ارکادی محبت آمیز انداز میں مسکرانے لگا۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ ''بھلا اس میں ملامت کی کیا بات ہے۔'' اور اپنے شفیق نرم دل باپ کو دیکھ کر اس کا دل محبت کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔ ان جذبات کی تہہ میں فوقیت کا ایک خفیہ احساس بھی کام کر رہا تھا۔ اپنی آزاد خیالی کے احساس سے اس نے غیر ارادی طور پر لذت لینی شروع کر دی۔ اس نے وہی فقرہ ایک مرتبہ پھر دہرایا۔ ''ابا جان چھوڑیے یہ ذکر۔''
نکولائی پیٹر وچ اب تک انگلیوں سے اپنی پیشانی رگڑے جا رہا تھا۔ انگلیوں کے درمیان سے اس نے ارکادی پہ ایک نظر ڈالی اور اس کے دل میں ایک کسک سی ہوئی..... مگر فوراً ہی اس نے اپنے آپ کو الزامات دینے شروع کر دیئے۔
بہت دیر خاموش رہنے کے بعد وہ کہنے لگا: ''لو بھئی وہ ہمارے کھیت آ گئے۔''
''اور وہ سامنے ہمارا جنگل ہے؟ ہیں نا؟'' ارکادی پوچھنے لگا۔
''ہاں۔ میں نے بس اس کی لکڑی بیچی ہے۔ اس سال کٹ جائے گی۔''
''آپ نے لکڑی کیوں بیچ ڈالی؟''
''روپے کی جو ضرورت تھی۔ پھر یہ کہ زمین تو اب کاشتکاروں کے نیگ چڑھ جائے گی۔''
''جو آپ کو محصول ادا نہیں کرتے؟''
''یہ ان کا فعل ہے مگر خیر کبھی نہ کبھی تو وہ محصول ادا کریں گے ہی۔''
''اس جنگل کا مجھے بہت دکھ ہے۔'' اور یہ کہہ کے ارکادی اپنے ارد گرد دیکھنے لگا۔ اس وقت جس نواح میں ہو کر گاڑیاں گزر رہی تھیں' اس کے منظر کو دلفریب تو کہا

نہیں جا سکتا تھا۔ دور تک کھیت ہی کھیت نظر آتے تھے جنہوں نے بڑھتے بڑھتے افق کے کناروں کو جا چھوا تھا۔ جا بجا وہ بتدریج بلند ہوتے چلے گئے تھے اور پھر یہ بلندی آہستہ آہستہ نشیب میں منتقل ہو گئی تھی۔ بعض مقامات پر جنگل بھی دکھائی دے رہے تھے اور گھاٹیاں پیچ کھاتی ہوئی دور تک چلی گئی تھیں اور ان میں لگی ہوئی اِکّا دُکّا چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کو دیکھ کر کیتھرین کے زمانے کے وہ پرانی طرز کے نقشے آنکھوں میں پھر جاتے تھے، جن میں یہ مناظر بڑے واضح انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ راستے میں مختلف مناظر آئے اور گزر گئے۔ اتھلے کناروں والے چھوٹے موٹے نالے اور تنگ نالیوں والی ننھی منی جھیلیں اور مختصر سے گاؤں..... نیچے جھونپڑے جن میں سے بہتوں کی چھتیں گر چکی تھیں اور گودام گھر جن کی جھکی ہوئی دیواروں پہ سبزے کا جال پھیلا ہوا تھا اور کھتے کے ویران احاطوں کے آس پاس چوپٹ کھلے ہوئے دروازے اور گرجا گھر۔ چند ایک گرجا گھر اینٹوں سے بنے تھے اور اب جا بجا ان کی دیواروں سے سخت سیمنٹ اتر گیا تھا۔ بعض گرجائیں لکڑی کے تختے کھڑے کر کے بنائی گئی تھیں اور اب ان کی صلیبیں سرنگوں پڑی تھیں اور وہ قبرستان جن پر ویرانی برس رہی تھی۔ اکادی کا دل ڈوبنے لگا۔ اس پہ مستزاد یہ کہ جو کسان نظر آئے وہ بھی پھٹے حالوں سے اور بیمار ٹھگنے ٹٹوؤں پر سوار چلے جاتے تھے۔ سڑک کے کنارے پر بید کے درخت یوں لگتے تھے گویا شکستہ حال فقیر قطاریں باندھے کھڑے ہیں۔ ان کے تنوں کی چھالیں اتر چکی تھیں۔ ان کی شاخیں ٹوٹ چکی تھیں۔ بھوک سے بیتاب دبلی پتلی مریل گائیں نالیوں کے آس پاس گھاس پہ بری طرح جتی ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر گمان گزرتا تھا گویا کوئی مہیب جن تھا جس کے خونیں پنجوں سے ابھی ابھی انہیں چھڑایا گیا ہے اور بہار کے اس خوشگوار موسم میں ان مریل بھوکے مویشیوں کو دیکھ کر بے ساختہ جاڑوں کے وہ کٹھن دن یاد آتے تھے جو جاڑے پالے اور برف باری اور طوفانوں کی فوج لے کر آئے تھے اور جو کسی طرح ٹلنے کا نام نہ لیتے تھے۔ ارکادی سوچنے لگا: ”نہیں۔ یہ خطہ تو ہرگز دولت مند نہیں۔ اسے دیکھ کر نہ تو افراط کا احساس پیدا ہوتا ہے نہ صنعت و حرفت نظر آتی ہے۔ یوں تو یہ ڈھرّہ نہیں چل سکتا۔ یہاں تو اصلاحات کی سخت ضرورت ہے۔ مگر اصلاحات کیسے ہوں، یہ کام کیسے شروع کیا جائے۔“

یہ خیالات تھے جو ارکادی کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے لیکن اِدھر وہ ان خیالات میں غرق تھا اور اُدھر بہار کا جلوہ ایک خمار بن کر حواس کو اپنی گرفت میں لیے لے رہا تھا۔ فضا نے ہری بانات کا جوڑا پہن رکھا تھا اور اس جوڑے پہ سنہری چھوٹ پڑ رہی تھی۔ ہوا کے نرم گرم جھونکوں نے ایک لطیف تنفس کی کیفیت اختیار کر لی تھی اور اس لطیف تنفس کے لمس سے درختوں' جھاڑیوں اور گھاس کی پتیاں ہولے ہولے کانپ رہی تھیں۔ سنہری شعاعوں کی لو سے ان کے کنارے عجب انداز سے دمک اٹھے تھے۔ طائروں کا نہ ختم ہونے والا تھرتھراتا ہوا نغمہ ہر طرف سے ایک سیلاب بن کر امنڈا چلا آ رہا تھا۔ مرغابیاں چلّاتی ہوئی فضا میں بلند ہوتی تھیں اور نشیب میں پھیلے ہوئے مرغزاروں پہ منڈلانے لگتی تھیں یا پھر وہ چپ چاپ کسی گھاس کے قلعہ پر اتر پڑتیں اور دوڑتی چلی جاتیں۔ اناج کے اگتے ہوئے چھوٹے چھوٹے پودوں کے درمیان کوے پھدکتے پھر رہے تھے۔ کبھی کبھی ان کی سیاہ منقاریں ہری ہری نرم کونپلوں کو چھو لیتی تھیں اور پھر وہ سفیدی مائل گچھوں میں کہیں گم ہو جاتے تھے' کھو جاتے تھے۔ کبھی کبھار ان کے سر گچھوں میں سے ایک ذرا بلند ہوتے اور پھر ڈوب جاتے۔ ارکادی دیکھتا رہا' تکتا رہا اور اس کے خیالات کی رو آہستہ آہستہ دھیمی ہوتی گئی' ڈوبتی گئی..... اس نے اپنا کوٹ اتار ڈالا اور اپنے باپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔ اس پہ بچوں کی سی ایک معصوم کیفیت طاری تھی۔ اور اس کے باپ نے اسے ایک مرتبہ پھر بے تحاشا سینے سے چمٹا لیا۔ نکولائی پیئر وچ کہنے لگا: ''بس اب تو گھر قریب ہی ہے۔ اس پہاڑی سے ذرا نکلے اور گھر نظر آنے لگے گا۔ ارکاشا اب ہم دونوں ساتھ ساتھ رہا کریں گے۔ تم کھیتی باڑی میں میرا ہاتھ بٹاؤ گے۔ اس کام سے تمہیں کوفت تو نہیں ہو گی۔ اب ہمیں آپس میں گھل مل کر رہنا چاہیے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہیں نا؟''

''جی ہاں درست ہے۔'' ارکادی بولا: ''مگر آج کا دن کس قدر سہانا ہے۔''

''بیٹا۔ تمہارے آنے کی خوشی میں۔ بہار آج اپنے جوبن پہ ہے۔ اگرچہ میں پشکن کی بات کا قائل ہوں۔ اس نے کہا ہے نا۔

موسم بہار' محبت کے رسیلے دنوں والے موسم بہار
میرے لیے تو درد و الم کا پیام بن کر آتا ہے

''ارکادی۔'' کوچ میں بیٹھے بیٹھے بازاروف نے آواز دی۔ ''یار پائپ کا ہے سے جلاؤں۔ ذرا دیا سلائی تو بھیج دو۔''

نکولائی پیئر وچ ٹھنک گیا۔ ارکادی نے ایک ذرا تعجب اور ہمدردی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس کی باتیں سننی شروع کر دی تھیں۔ وہ بھی چونک پڑا۔ اس نے جیب سے جھٹ چاندی کی دیا سلائی نکالی اور پیاتر کے ہاتھ اسے بازاروف کے پاس بھیج دیا۔

بازاروف نے پھر آواز لگائی: ''سگار لو گے؟''

''شکریہ۔'' ارکادی نے جواب دیا۔

پیاتر جب واپس آیا تو اس نے دیا سلائی کے ساتھ ساتھ ارکادی کو ایک موٹا سا سیاہ سگار بھی دیا اور ارکادی نے بڑی چابکدستی سے دھواں اڑانا شروع کر دیا۔ تمباکو سستے قسم کا تھا۔ اس کی خوشبو اتنی تیز اور اتنی ناخوشگوار تھی کہ نکولائی پیئر وچ کو جس نے بچپن سے اب تک کبھی تمباکو نوشی نہیں کی تھی، مجبوراً اپنا منہ پھیر لینا پڑا۔ مگر اس نے حتی الامکان بڑے غیر محسوس طریقے سے یہ کام سرانجام دیا۔ اسے اندیشہ تھا کہ اس کے بیٹے کے دل کو ٹھیس نہ لگ جائے۔

پاؤ گھنٹہ گزرا ہوگا کہ دونوں گاڑیاں ایک نئے کاٹ کے مکان کی سیڑھیوں کے سامنے آ کر رکیں۔ مکان پہ بھورا رنگ پھرا ہوا تھا۔ البتہ اس کی آہنی چھت کا رنگ سرخ تھا۔ یہ دراصل میرینو تھا جو ''نیودک'' کے نام سے بھی مشہور تھا اور کسانوں نے اس کا نام ''پاورٹی فارم'' رکھ چھوڑا تھا۔

(4)

خادموں کا کوئی لمبا چوڑا گروہ بھاگتا دوڑتا اور استقبال کرتا نظر نہیں آیا۔ بارہ سال کی ایک چھوٹی سی لڑکی ضرور دکھائی دی تھی۔ پھر پیاتر سے ملتا جلتا ایک نوجوان لڑکا گھر سے نکلا۔ یہ پافل پیئر وچ کرسانوف کا نوکر تھا۔ ایک سفید فوجی بٹنوں والا خاکی کوٹ اس نے پہن رکھا تھا۔ اس نے چپ چاپ گاڑی کا دروازہ کھولا اور کوچ کے گرد پوش کے بٹن

کھول دیئے۔نکولائی پیئر وچ اپنے بیٹے اور بازاروف کو ہمراہ لے کر ایک تاریک سے ہال میں پہنچا۔ہال تقریباً خالی پڑا تھا۔اس کے دروازے کے پرے انہوں نے ایک نئی طرز کے سجے بنے ڈرائنگ روم میں ایک نوجوان عورت کی اڑتی ہوئی سی ایک جھلک دیکھی۔

نکولائی پیئر وچ نے ٹوپی اتار کر اپنے بالوں کو پیچھے جھٹکا اور کہنے لگا: ''لو بھئی گھر آ گئے۔خدا کا شکر ہے۔اب ہم کھانا کھائیں گے اور پھر آرام کریں گے۔''

''ہاں اگر ناشتہ آ جائے تو کوئی مضائقہ تو نہیں ہے۔'' بازاروف نے ایک انگڑائی لی اور صوفے پر دراز ہو گیا۔

''ہاں ہاں۔ہم کھانا ہی کیوں نہ کھائیں۔'' نکولائی پیئر وچ نے بلاوجہ بلاسبب زمین پر پیر مارنے شروع کر دیئے تھے۔''اور لو۔پروکوفش بھی کیسے موقعہ سے آیا ہے۔''

کمرے میں ایک شخص داخل ہوا۔اس کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ ہو گی۔ دبلا پتلا جسم' سفید بال' سیاہ رنگ' پیتل کے بٹنوں والا ایک بادامی رنگ کا کوٹ بر میں۔ گلے میں گلابی رومال لپٹا ہوا۔وہ ایک بناوٹی سے انداز میں مسکرایا اور ارکادی کے ہاتھ چومنے کی نیت سے آگے بڑھا۔پھر نو وارد مہمان کو سلام کر کے وہ پیچھے ہٹ کر دروازے پہ کھڑا ہو گیا اور ہاتھ پیچھے باندھ لیے۔

نکولائی پیئر وچ کہنے لگا: ''پروکوفش۔یہ تمہارے میاں آ گئے ہیں۔اب یہیں رہا کریں گے.....کیسے لگ رہے ہیں؟''

''اجی میاں تو بہت اچھے لگ رہئے ہیں۔'' یہ کہہ کے بوڑھا پھر دانت چبانے لگا۔مگر پھر اس نے جلدی سے بھنویں سکیڑ لیں اور اک ذرا مرعوب کن انداز میں کہنے لگا:

''میاں کے لیے کھانا لاؤں؟''

''ہاں ہاں کھانا لاؤ۔مگر پٹ یوگین وسل یوچ آپ پہلے اپنے کمرے میں ہو آئیں نا!''

''نہیں صاحب۔شکریہ۔اس تکلف میں کیا رکھا ہے۔بس ذرا میرا یہ بکس وہاں بھجوا دیجیے اور میرا یہ کوٹ بھی۔'' اور اس نے اپنا اوورکوٹ اتارنا شروع کر دیا۔

''ہاں ہاں ضرور۔پردکوفش ذرا آپ کا کوٹ لینا۔'' (پروکوفش اک ذرا گڑبڑا سا

گیا۔ بازاروف کا ''چغہ'' اس نے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر سر سے بلند کر لیا اور اسے لے کر پنجوں کے بل کمرے سے باہر نکل گیا) ''اور ارکادی تم۔ منٹ دو منٹ کے لیے تم تو اپنے کمرے میں جاؤ گے نا؟''

''جی ہاں میں ذرا نہاؤں گا۔'' اس جواب کے بعد ارکادی دروازے کی طرف چلنا ہی چاہتا تھا کہ اتنے میں ایک متوسط قد کا شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے سیاہی مائل انگریزی سوٹ اور بکری کی کھال کا جوتا پہن رکھا تھا۔ گلے میں فیشن ایبل قسم کا گلوبند پڑا تھا۔ یہ پافل پیئر وچ کرسانوف تھا۔ اس کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ نظر آتی تھی۔ اس کے گھنے بھورے بالوں پہ سیاہ چھوٹ پڑ رہی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد ضرور تھا' مگر جھریوں سے پاک تھا۔ چہرے کے غیر معمولی حد تک واضح اور ترشے ہوئے خطوط کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی نرم و نازک چھینی سے انہیں سنوارا گیا ہے۔ وہ اس بات کی صاف غمازی کر رہے تھے کہ یہ چہرہ کسی زمانے میں بڑا حسین و جمیل ہو گا۔ اس کی کالی کالی روشن بادامی آنکھوں میں ایک عجب کیفیت نمایاں تھی۔ جوانی کا رنگ و روپ بالعموم تیس سال بعد ڈھل جایا کرتا ہے مگر ارکادی کے تایا میں اب تک جوانی کی وہ سج دھج' وہ آن بان اور وہ رئیسوں والا ٹھسا باقی تھا۔

پافل پیئر وچ نے پتلون کی جیب سے اپنا نرم و نازک ہاتھ نکالا۔ لمبے لمبے گلابی ناخنوں نے ہاتھ کے حسن میں اور اضافہ کر دیا تھا اور پھر اس سفید براق کف نے بھی اس حسن کو چمکایا تھا' جس میں صرف ایک بڑا سا بٹن لگا ہوا تھا۔ اس نے بھتیجے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یورپی انداز میں مصافحہ کرنے کے بعد اس نے روس کی رسم کے مطابق اسے تین مرتبہ بوسہ دیا۔ یعنی یوں کہیے کہ اس نے اپنی معطر مونچھوں سے تین مرتبہ اس کے رخساروں کو چھوا اور کہنے لگا: ''خوش آمدید۔''

نکولائی پیئر وچ نے بازاروف سے اس کا تعارف کرایا۔ پافل پیئر وچ نے سر کی ایک ہلکی سی جنبش اور خفیف سی مسکراہٹ کو بہت کافی سمجھا۔ جہاں تک مصافحہ کا معاملہ ہے تو ہاتھ بڑھانا تو درکنار اس نے تو ہاتھ کو الٹا جیب میں ٹھونس لیا۔

پافل نے کاندھوں کو مچکایا اور ذرا جنبش کر کے کہنے لگا: ''میں نے تو یہ سمجھ لیا تھا کہ

تم آج نہیں آ ؤ گے۔ سڑک پہ کوئی واقعہ تو پیش نہیں آیا؟'' اس کے لہجہ میں ایک ترنم کی سی کیفیت تھی اور اس کے سفید سفید دانت چمک رہے تھے۔

ارکادی نے جواب دیا: ''جی نہیں کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ دراصل ہم آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ مگر اس وقت تو ہماری آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ پروکوفش ذرا جلدی کرو۔ میں ابھی آیا۔''

بازاروف..... ایکاایکی صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا اور آواز دے کر بولا: ''ٹھہرو بھئی۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' اور دونوں وہاں سے باہر چل دیئے۔

پافل پیئر وچ پوچھنے لگا: ''یہ صاحب کون ہیں؟''

''ارکیشیا کا دوست اور بقول اس کے بڑا دانا بینا آدمی ہے۔''

''ہمارے یہاں رہے گا؟''

''ہاں۔''

''یہ گھامڑ آدمی ہمارے ساتھ رہے گا؟''

''کیا ہرج ہے؟''

پافل پیئر وچ میز پر انگلیاں بجانے لگا۔ ''میرا خیال ہے ارکادی میں اب بڑی شائستگی آ گئی ہے۔ خیر خوشی اس بات کی ہے کہ وہ واپس آ گیا۔''

کھانے کے دوران میں زیادہ بات چیت نہیں ہوئی۔ بازاروف خاص طور پر خاموش رہا۔ البتہ کھانے پہ اس نے بڑھ بڑھ کے ہاتھ مارے۔ مگر نکولائی پیئر وچ نے باتوں کے دفتر کھول ڈالے۔ اس نے اپنی کاشتکاری کی زندگی کے متعلق مختلف واقعات سنائے۔ حکومت کے آمدہ اقدامات پر بحث کی۔ کمیٹیوں، وفود اور مشینیں لگانے کی ضرورت پر روشنی ڈالی۔ پافل پیئر وچ کھانے کے کمرے میں آہستہ آہستہ ٹہلتا رہا۔ (اس نے کھانا مطلق نہ چکھا تھا۔) کبھی کبھی وہ سرخ شراب کے ایک دو گھونٹ لیتا تھا یا پھر کبھی کبھار ''اُف۔ ہوں۔ شش'' قسم کے کلمات اس کی زبان سے نکل جاتے تھے۔ ارکادی نے پیٹرسبرگ کی ایک دو خبریں سنائیں مگر وہ ایک بے کلی سی محسوس کر رہا تھا۔ اس قسم کی بے کلی ایسے لوگوں کو عام طور پر آ گھیرتی ہے جن کا بچپن نیا نیا ختم ہوا ہو اور جنہیں کسی ایسے ماحول میں واپس آنا پڑے

جہاں انہیں بچہ سمجھا جاتا رہا ہو اور بچوں کی طرح ان سے برتاؤ ہوتا رہا ہو۔ وہ خواہ مخواہ اپنے فقروں کو طول دے رہا تھا اور ''اباجان'' کے لفظ سے بھی کچھ اجتناب برت رہا تھا بلکہ کبھی کبھی تو وہ ''والد صاحب قبلہ'' کا جملہ بھی کہہ جاتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ پھر اسے چبا جاتا تھا۔ وہ جان بوجھ کر کچھ زیادہ بے اعتنائی اور بے تکلفی برتنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ گلاس میں خواہش سے زیادہ شراب ڈالتا تھا اور غٹ غٹ چڑھا جاتا تھا۔ پروکوفش کی آنکھیں بدستور اس پہ جمی رہیں اور وہ بدستور اپنے ہونٹ چباتا رہا۔ کھانے کے فوراً بعد محفل بچھڑ گئی۔

بازاروف ڈریسنگ گاؤن پہن کر ارکادی کے سرہانے آ بیٹھا۔ پائپ کا دھواں اڑاتا ہوا وہ کہنے لگا: ''یار یہ تمہارے تایا بھی خوب چیز ہیں۔ ذرا غور کیجیے کہ رہتے ہیں دیہات میں اور سج دھج یہ اختیار کر رکھی ہے۔ ان کے ناخن دیکھئے۔ بھئی ان کے ناخن تو کسی نمائش میں رکھوا دو۔''

ارکادی بولا: ''اماں تمہیں کیا پتہ۔ اپنے زمانے میں ہمارے تایا جان بڑے رنگیلے تھے۔ میں کسی وقت تمہیں ان کا پورا قصہ سناؤں گا۔ اللہ نے حسن کی دولت دی تھی جس عورت نے دیکھا ریجھ گئی۔''

''تو بس اتنی بات ہے۔ گویا یہ بناؤ سنگھار عہد رفتہ کی یاد میں ہوتے ہیں۔ مگر یہاں وہ کس پہ رنگ جما رہے ہیں۔ یہ واقعی بڑے افسوس کی بات ہے۔ میں تو ان کے نفیس کالر ہی کو دیکھتا رہا۔ بالکل سنگ مرمر کی پٹڑی کا شبہ ہوتا تھا اور ٹھوڑی کے شیو میں تو کمال کیا تھا مگر ارکادی نکولائی تم ہی سوچو کیا یہ صورت مضحکہ خیز نہیں ہے۔''

''ہاں خیر یہ چیز مضحکہ خیز تو ہے' مگر وہ آدمی غضب کے ہیں۔''

''ہاں عہد عتیق کی باقیات الصالحات ہیں' مگر یار تمہارے والد خوب آدمی ہیں۔ شعر و شاعری میں مست رہتے ہیں۔ زراعت کے متعلق خاک نہیں جانتے' مگر خیر دل کے تو اچھے ہیں۔''

''میرا باپ لاکھوں میں ایک آدمی ہے۔''

''اور تم نے یہ دیکھا کہ وہ جھینپو اور شرمیلے کتنے ہیں۔''

ارکادی نے اس شان سے سر ہلایا گویا وہ خود تو جھینپو اور شرمیلا ہے ہی نہیں۔

بازاروف نے پھر کہا: ''ویسے ہے یہ تعجب کی بات کہ یہ اگلے وقتوں کے آدرش پرست لوگ اپنے اعصابی نظام کو اتنا مانجھتے ہیں، اتنا مانجھتے ہیں کہ وہ درہم و برہم ہو جاتا ہے..... یوں توازن بگڑ جاتا ہے۔ اچھا بھئی سلام۔ ہم چلے۔ میرے کمرے میں ایک انگریزی واش اسٹینڈ رکھا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ دروازے کی کنڈی غائب ہے، لیکن خیر اس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ انگریزی واش اسٹینڈ تو ترقی کی علامت ہوا۔''

بازاروف تو چلا آیا اور ارکادی کا دل فرطِ مسرت سے جھومنے لگا۔ اپنے گھر سونے میں بھی کتنا لطف آتا ہے۔ بستر کی ایک ایک چیز جانی پہچانی ہوتی ہے۔ پیارے پیارے ہاتھوں کا سلا ہوا نرم لحاف۔ کسی محبوب نرس کے ہاتھوں کا سلا ہوا نرم گدا، رسیلے اور نہ تھکنے والے ہاتھ۔ ارکادی کو یگروفن یاد آ گئی۔ اس نے ٹھنڈا سانس بھرا اور دعا کرنے لگا کہ اللہ میاں اسے کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں..... اپنے لیے اس نے کسی قسم کی دعا کرنی مناسب نہ سمجھی۔

وہ اور بازاروف تو بہت جلد سو گئے، لیکن گھر میں رات گئے تک جاگ باگ رہی۔ بیٹے کی آمد نے نکولائی پیئر وچ کے دل میں ایک طوفان بپا کر دیا تھا۔ وہ بستر میں ضرور لیٹ گیا تھا، لیکن اس نے چراغ گل نہیں کیا۔ اس نے سر اپنے ہاتھ پہ ٹکا رکھا تھا اور خود یادوں کی دنیا میں گم تھا۔ اس کا بھائی پچھلے پہر تک جاگتا رہا۔ اپنے پڑھنے کے کمرے میں ایک چوڑی آرام کرسی پر وہ بیٹھا تھا اور سامنے آتش دان میں ہلکی ہلکی آنچ سے کوئلے سلگ رہے تھے اور یہ آنچ دھیمی ہوتی جا رہی تھی، سرد پڑتی جا رہی تھی۔ پافل پیئر وچ نے ابھی کپڑے نہیں اتارے تھے۔ بس اتنا کیا کہ بکری کے کھال والے جوتے کی جگہ لال چینی سلیپر پیروں میں ڈال لیے تھے۔ ''گالگنانی'' کا تازہ نمبر اس کے ہاتھ میں تھا، مگر وہ اسے پڑھ نہیں رہا تھا۔ اس کی آنکھیں تو انگیٹھی پہ جمی ہوئی تھیں جہاں ایک ہلکا نیلا شعلہ جھلملا کر بجھنے لگتا تھا اور پھر بھڑک اٹھتا تھا..... یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کن خیالات میں گم تھا مگر اتنا ضرور پتہ چلتا تھا کہ وہ ماضی کے دھندلکوں میں ٹامک ٹوئیاں نہیں مار رہا ہے۔ اس کے چہرے پہ ایک قسم کے تناؤ اور کرختگی کی کیفیت طاری تھی اور یہ کیفیت وہ نہیں ہے جو یادوں میں کھوئے ہوئے شخص کے چہرے پہ ظاہر ہوتی ہے۔ ایک چھوٹے سے عقبی کمرے میں ایک بڑی سی چٹ پر

ایک نوجوان عورت پتلے رنگ کا جیکٹ پہنے اوراپنے سیاہ بالوں پہ ایک سفید رومال ڈالے بیٹھی تھی۔ یہ فینشکا تھی۔ وہ کچھ اونگھ سی رہی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس نے کہیں کان لگا رکھے ہیں۔ بار بار وہ اس کھلے ہوئے دروازے کے ادھر دیکھتی تھی جہاں ایک بچے کا جھولا نظر آ رہا تھااور جہاں سے ایک سوتے ہوئے بچے کی باقاعدگی سے سانس لینے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

(5)

صبح کو سب سے پہلے بازاروف کی آنکھ کھلی۔ وہ بستر سے اٹھ سیدھا باہر ہولیا۔ اس نے اپنے اردگرد ایک نظر ڈالی اور سوچنے لگا کہ ''یہ جگہ کچھ ایسی قابل تعریف تو نہیں ہے۔'' جب نکولائی پیئر وچ نے کسانوں سے اپنی زمین بٹوائی تو چار ایکڑ کے بالکل بنجر اور چٹیل میدان میں اسے اپنا نیا مکان بنوانا پڑا۔ اس نے ایک مکان' چند دفاتر اور فارم کی عمارتیں تعمیر کرائیں' ایک باغ لگایا' ایک جوہڑ کھدوائی اور دو کنوئیں بنوائے' لیکن پودے کچھ زیادہ پھلے پھولے نہیں۔ جوہڑ میں پانی فراہم تو ہوا لیکن برائے نام اور کنوؤں کا پانی کھاری نکلا۔ البتہ میول اور سوسن کے درختوں کا ایک کنج خوب سرسبز ہوا۔ یہ لوگ کبھی کبھی وہاں بیٹھ کر چائے پی لیتے تھے' کھانا کھاتے تھے۔ بازاروف نے چند ایک منٹ میں باغ کی ساری روشوں کا چکر لگا ڈالا۔ پھر وہ مویشیوں کے احاطہ اور اصطبل میں پہنچا۔ فارم کے دو لونڈوں سے اس کی مڈھ بھیڑ ہوگئی۔ ان سے اس نے فوراً یارانہ گانٹھ لیا اور ان کے ساتھ ساتھ وہ مینڈکوں کی تلاش میں ایک چھوٹے سے نالے کی طرف چل پڑا' جو گھر سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ہوگا۔

ایک لونڈا پوچھنے لگا: ''بابو جی۔ مینڈکوں کا تم کیا کرو گے؟''

''میں تمہیں بتاتا ہوں۔'' بازاروف نے جواب دیا۔ چھوٹے طبقہ کے لوگوں کا اعتبار حاصل کرنے میں اسے بڑا ملکہ تھا' حالانکہ اس نے اپنا رنگ چڑھانے کی کبھی کوشش نہیں کی بلکہ وہ تو ان سے الگ تھلگ ہی رہتا تھا۔ ''میں مینڈک کی چیر پھاڑ کرکے دیکھوں

گا کہ ان کے اندر کیا ہوتا رہتا ہے اور چونکہ ہم تم بھی مینڈکوں کی طرح ہیں، فرق بس اتنا ہی تو ہے کہ ہم ٹانگوں سے چلتے ہیں تو پھر مجھے یہ پتہ چل جائے گا کہ ہمارے اندر کیا ہوتا رہتا ہے۔''

''مگر یہ جان کے تم کیا کرو گے صاب؟''

''میرا مطلب یہ ہے کہ اگر کل کلاں کو تم بیمار پڑ جاؤ اور مجھے تمہارا علاج کرنا پڑے تو مجھ سے کوئی چونک نہ ہونے پائے۔''

''تو کیا تم ڈاکٹر صاب ہو؟''

''ہاں۔''

''ابے اودیکا۔ سن رااے بے۔ یہ میاں کھوے ہیں اور میں اور تو مینڈک ہیں۔ ہے نا لفظ کی بات۔''

''بھیا میں مینڈکوں سے بہت ڈروں ہوں۔'' دیکا بولا۔ دیکا اس وقت سات سال کے پیٹے میں تھا۔ اس کا سر موم کی طرح سفید تھا۔ پیر ننگے تھے۔ کھڑے کالر والی زرد قمیض اس نے پہن رکھی تھی۔

''ابے ڈرنے کی کیا بات ہے۔ وے کیا کاٹھے ہیں؟''

بازاروف کہنے لگا: ''اچھا اے فلسفیو۔ اب تم ذرا کانٹا ڈالو۔''

اس وقت نکولائی پیئر وچ بھی اٹھ بیٹھا تھا۔ وہ جب ارکادی کے پاس پہنچا تو وہ کپڑے بدل کر تیار ہو چکا تھا۔ باپ بیٹے دونوں وہاں سے اٹھ کر سائبان کے اندر چبوترے پر جا بیٹھے۔ میز پر چبوترے کے قریب سوسن کی شاخوں کے سائے میں سماوار چولہے پہ ابل رہی تھی۔ اتنے میں ایک چھوٹی سی لڑکی آئی۔ یہ لڑکی وہی تھی جو کل شام ان کی آمد کے موقع پر سب سے پہلے دروازے پر نمودار ہوئی تھی۔ بڑی تیز اور باریک سی آواز میں وہ کہنے لگی:
''فیدوسیہ نکولیونا کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ وہ نہیں آئیں گی۔ انہوں نے کہلا کے بھیجا ہے کہ آپ خود چائے بنالیں یا آپ کہیں تو دونیاشا کو بھیج دیں۔''

نکولائی پیئر وچ جلدی سے بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''میں خود ہاں میں خود ہی بنا لوں گا۔ ارکادی تم کیسی چائے پیتے ہو۔ کریم کی یا لیموں کی۔''

''کریم کی۔'' ارکادی جواب دے کر چپ ہو گیا اور اک ذرا خاموش رہنے کے بعد سوالیہ انداز میں بولا۔ ''ابا جان؟''

نکولائی پیئر وچ نے گھبرا کر بیٹے کو دیکھا۔ ''ہاں؟''

ارکادی کی آنکھیں جھک گئیں۔ وہ کہنے لگا: ''ابا جان اگر آپ کو میرا سوال بے تکا نظر آئے تو آپ مجھے معاف کر دیں مگر خود آپ کی کل کی بے تکلفی سے میری یہ ہمت ہوئی ہے..... آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟''

''کہو نا۔''

''میں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتا تھا..... کیا فین..... کیا وہ اس وجہ سے یہاں چائے پہ نہیں آئی ہیں کہ میں یہاں ہوں؟''

نکولائی پیئر وچ اک ذرا پرے سرک گیا۔

پھر وہ بولا: ''ممکن ہے ان کا خیال ہو..... وہ شاید شرماتی ہیں۔''

ارکادی نے باپ پہ اک تیز سی نگاہ ڈالی۔

''مگر انہیں شرمانے کی کیا ضرورت ہے۔ اوّل تو آپ کو میرے خیالات کا پتہ ہی ہے۔'' (خیالات کے لفظ کی ادائیگی پر ارکادی کو بڑا حظ محسوس ہوا) ''اور دوسرے یہ کہ کیسا ہی چھوٹا معاملہ کیوں نہ ہو، میری بھلا یہ مجال ہو سکتی ہے کہ میں آپ کو ٹوکوں، آپ کے کاموں میں دخل در معقولات کروں۔ پھر مجھے یہ اطمینان ہے کہ آپ کی نگاہِ انتخاب غلط نہیں ہو سکتی۔ وہ اس گھر میں آنے کے لائق ہی ہوں گی۔ جب ہی تو آپ انہیں اس گھر میں لائے ہیں۔ بہر حال ایک بیٹے کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ باپ پر روک ٹوک کرے اور بیٹا بھی اور کوئی نہیں میں اور باپ بھی کون آپ جیسا باپ جس نے کبھی بیٹے کو کسی بات پہ ٹوکا ہی نہیں۔''

شروع شروع میں تو ارکادی کی آواز کانپی تھی۔ وہ اس وقت اپنے آپ کو بڑا اعالی حوصلہ تصور کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ وہ وعظ قسم کی کوئی چیز کر رہا ہے، لیکن آدمی کی اپنی آواز اس پر عجب اثر کرتی ہے اور ارکادی نے آخری الفاظ بڑے تیقن بلکہ بڑے زور و اثر سے ادا کیے۔

''شکریہ۔ ارکیشا۔'' نکولائی پیئر وچ نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا اور اس

کی انگلیاں پھر پیشانی اور بھوؤں پہ بھٹکتی نظر آنے لگیں۔ ''تمہارا خیال درست ہے۔ واقعی اگر یہ لڑکی اس لائق نہ ہوتی..... یہ کوئی طفلانہ حرکت نہیں ہے۔ اس بارے میں تم سے بات کرنا میرے لیے دشوار ہو رہا ہے' لیکن تمہیں یہ تو سمجھ لینا چاہیے کہ تمہاری موجودگی میں اور خاص طور پر ایسی صورت میں کہ ابھی تمہیں آئے ہوئے پہلا ہی دن ہے' ان کے لیے یہاں آنا کتنا مشکل ہوگا۔''

ارکادی کے سینے میں عالی حوصلگی کا ایک تازہ طوفان اٹھا۔ وہ گرما کر بولا: ''تو پھر میں خود ہی ان کے پاس جاؤں گا۔'' اس نے ایک پھریری لی اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں انہیں سمجھاؤں گا کہ آپ کو مجھ سے شرمانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ارکادی۔ سنو تو سہی..... بھلا وہ کیسے..... وہاں..... میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا تھا.....''

مگر ارکادی کہاں سنتا تھا۔ وہ تو اڑا چلا گیا۔ نکولائی پیئر وچ اسے دیکھتا رہا اور الجھن نے اسے پھر آ گھیرا اور وہ دھم سے کرسی پہ گر پڑا۔ اس کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ کیا اس وقت وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اس کے اور اس کے بیٹے کے تعلقات میں اب ضرور غیریت پیدا ہو جائے گی۔ کیا اسے یہ خیال ستا رہا تھا کہ اگر وہ اس قصہ کو سرے سے چھیڑتا ہی نہیں تو ارکادی اس کی زیادہ عزت کرتا۔ کیا وہ اپنی کمزوری پر ملامت کر رہا تھا۔ یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ تمام خیالات اس کے ذہن میں کام کر رہے تھے' مگر ان کی حیثیت محسوسات کی تھی اور یہ محسوسات بھی بہت مبہم تھے۔ شرم و ندامت کے آثار بدستور اس کے چہرے سے عیاں تھے اور اس کا دل دھکڑ پکڑ کر رہا تھا۔

جلدی جلدی اٹھتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی اور اتنے میں ارکادی چبوترے پر آن موجود ہوا۔ ''ابا جان ہمارا میل ہوگیا۔'' اس کے چہرے پر ایک ایسی فتح مندی کا احساس جھلک رہا تھا' جس میں محبت و رفاقت کے جذبات بھی ملے ہوئے تھے۔ ''فیدوسیہ نکولیونا کی طبیعت واقعی ناساز ہے۔ وہ تھوڑی دیر میں آئیں گی' لیکن آپ نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ ہمارے بھیا ہوا ہے۔ میں نے اب اسے پیار کیا ہے۔ بھلا میں اسے رات ہی پیار کیوں نہ کرتا۔''

نکولائی پیئر وچ نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اٹھ کھڑا ہو اور اپنی آغوش وا کردے۔ ارکادی نے یکایک اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔

''یہ کیا ہو رہا ہے۔ بغل گیری کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔'' یہ پافل پیئر وچ کی آواز تھی جو پیچھے سے سنائی دی۔

اس وقت اس کے آنے سے باپ اور بیٹے دونوں ہی بہت خوش ہوئے۔ محبت و الفت کے مظاہرے میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں جن سے آدمی جلد از جلد رہائی پانے کی آرزو کرتا ہے۔

''تمہیں اس پہ تعجب کیوں ہے۔'' نکولائی پیئر وچ کھلا جا رہا تھا۔ ''یہ تو سوچو کہ میں کب سے آرکیشا کا انتظار دیکھ رہا تھا۔ کل سے اب تک مجھے اسے نظر بھر کے دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔''

پافل پیئر وچ بولا: ''مجھے مطلق تعجب نہیں ہے۔ خود مجھے اسے سینے سے لگانے کی خواہش ہو رہی ہے۔''

ارکادی بڑھ کر چچا کے سینے سے لگ گیا اور ایک مرتبہ پھر اس نے اپنے رخساروں پر مونچھوں کے معطر بالوں کا لمس محسوس کیا۔ پافل پیئر وچ میز پر بیٹھ گیا۔ اس نے انگریزی طرز کا ایک خوبصورت سا صبح کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر ایک چھوٹی سی ٹوپی بہار دکھا رہی تھی۔ ٹوپی اور وہ چھوٹا سا گلوبند جو بڑی لاپروائی سے گلے میں پڑا تھا' اسے دیکھ کر دیہاتی زندگی کی آزادی کا احساس پیدا ہوتا تھا' مگر قمیض کا وہ کرخت کالر اپنے اسی پرانے انداز سے شیو کی ہولی ٹھوڑی کے بالمقابل کھڑا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس مرتبہ سفید نہیں بلکہ پٹیوں دار تھا' لیکن صبح کے وقت تو اسی قسم کے کالر کا فیشن ہے۔

ارکادی سے وہ پوچھنے لگا۔ ''آپ کے وہ نئے دوست کہاں ہیں؟''

''وہ اس وقت گھر پہ نہیں ہے۔ اس کا معمول یہ ہے کہ وہ منہ اندھیرے اٹھتا ہے اور ٹہلنے نکل جاتا ہے۔ سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ ہم اس کی سرے سے فکر ہی نہ کریں۔ تکلف اسے مطلق پسند نہیں۔''

''ہاں یہ تو ظاہر ہے۔'' پافل پیئر وچ نے اپنے توس پر مکھن لگانا شروع کر دیا

تھا۔ ''وہ یہاں کچھ زیادہ دن ٹھہریں گے؟''

''غالباً۔ وہ اپنے والد کے پاس جا رہا ہے۔ رستے میں یہاں اتر پڑا ہے۔''

''اور ان کے والد کہاں رہتے ہیں؟''

''یہیں ہمارے صوبے میں، یہاں سے چونسٹھ میل کے فاصلہ پر۔ ان کی تھوڑی سی جائداد ہے۔ ویسے پہلے وہ فوج میں ڈاکٹر تھے۔''

''اچ..... چھا۔ ہوں۔ میں بھی تو سوچوں کہ میں نے یہ نام بازاروف کہاں سے سنا ہے۔ نکولائی تمہیں یاد ہے نا باوا جان کی ڈویژن میں ایک سرجن بازاروف تھا؟''

''مجھے کچھ خیال تو پڑتا ہے۔''

''ہاں ہاں۔ تھا۔ یقیناً تھا۔ تو وہ سرجن ان کا باپ تھا۔ ہوں۔'' پافل پیئر وچ نے مونچھوں کو ذرا بل دیا اور پھر بڑی بے تکلفی سے بولا: ''اور یہ صاحبزادے خود کیا ہیں؟''

''بازاروف کیا ہے؟'' ارکادی مسکرانے لگا۔ ''تایا جان آپ واقعی جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کیا ہے؟''

''بیٹا بتاؤ نا۔''

''وہ انکار پسند ہے۔''

''ہوں؟'' نکولائی پیئر وچ نے چونک کر پوچھا اور پافل پیئر وچ نے چاقو کی نوک پر اک ذرا سا مکھن لے کر اسے اوپر اٹھا لیا۔ اس پر ایک سکتہ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

ارکادی نے اپنا فقرہ پھر دہرایا۔ ''وہ انکار پسند ہے۔''

''انکار پسند۔'' نکولائی پیئر وچ کہنے لگا۔ ''یعنی نہیلسٹ (Nihilist)۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں یہ لفظ لاطینی لفظ ''نہل'' (یعنی انکار) سے نکلا ہے۔ اس لفظ کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ ایسا شخص جو..... کسی چیز کو تسلیم نہ کرے۔''

پافل پیئر وچ نے ٹکڑا لگایا۔ ''یوں کہیے کہ وہ شخص جو کسی چیز کا احترام نہیں کرتا۔'' اور وہ پھر مکھن توس کے سلسلہ میں مصروف ہو گیا۔

ارکادی بولا: ''وہ شخص جو ہر چیز کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔''

''بات تو وہی ہوئی نا؟'' پافل پیئر وچ نے جواب دیا۔

''نہیں بات تو وہ نہیں ہوئی۔ انکار پسند وہ شخص ہے جو کسی ہستی کے آگے سر نہیں جھکاتا' کسی اصول کو عقیدے کی بنیاد پر تسلیم نہیں کرتا' خواہ اس اصول کو کتنا ہی مقدس تصور کیا جاتا ہو۔''

''اچھا یونہی سہی' لیکن کیا یہ کوئی اچھی بات ہے؟'' پافل پیئر وچ نے سوال کیا۔

''چچا جان یہ تو آدمی آدمی پہ منحصر ہے۔ بعض لوگوں کے لیے یہ بات بڑی خوش کن ہوگی' بعض لوگوں کے لیے اذیت کا باعث بن جائے گی۔''

''خیر میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا مزاج اس سے سازگار نہیں ہے۔ ہم ٹھہرے اگلے وقتوں کے لوگ۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ان اصولوں کے بغیر جو بقول تمہارے عقیدے کی بنا پر تسلیم کیے جاتے ہیں' ہم ایک قدم نہیں اٹھا سکتے' سانس نہیں لے سکتے۔ تم نے تو خیر چولا ہی بدل لیا ہے۔ خدا تمہیں زندہ و تندرست رکھے۔ تم دن دونی رات چوگنی ترقی کرو اور جنرل بنو۔ ہم تمہیں بس دیکھ دیکھ کے خوش ہو لیا کریں گے..... ہاں وہ کیا لفظ تھا؟''

''انکار پسند۔'' ارکادی نے بہت واضح لہجہ میں جواب دیا۔

''ہاں ایک زمانے میں ہیگل پرست ہوا کرتے تھے اور اب یہ انکار پسند پیدا ہوئے ہیں۔ ہمیں بھی دیکھنا ہے کہ آپ لوگ خلا میں کیسے جیتے ہیں۔ اچھا بھیا ذرا گھنٹی بجاؤ۔ یہ میرا کوکو پینے کا وقت ہے۔''

نکولائی پیئر وچ نے گھنٹی بجا کر دونیاشا کو آواز دی' لیکن ہوا یہ کہ دونیاشا کی بجائے خود فینشکا وہاں آ گئی۔ فینشکا کے ابھی جوانی کے دن تھے۔ یہی کوئی تیسویں برس میں ہوگی۔ کھلتا ہوا رنگ' نرم و نازک جسم' کالے کالے بال' سیاہ آنکھیں' بچوں کے سے پھولے پھولے ہونٹ' ننھے منے نازک ہاتھ' لباس سادہ اور صاف تھا' گدگدے کاندھوں پر ایک نیا آسمانی رنگ کا رومال پڑا لہرا رہا تھا۔ کوکو کا ایک بڑا سا پیالہ لا کر اس نے پافل پیئر وچ کے سامنے رکھ دیا اور پھر وہ سٹپٹا سی گئی۔ گرمائے ہوئے خون کی گردش تیز ہوگئی اور اس موہنی مورت کی ملائم جلد پر سرخی کی ایک لہر دوڑتی چلی گئی۔ اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ اس نے اپنی انگلیوں کی پوریں ایک ذرا میز پہ ٹکا لیں اور کھڑی ہوگئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا وہ اس پہ شرمندہ ہے کہ یہاں وہ کیوں آئی اور اسی کے ساتھ اسے یہ احساس ہے کہ اسے یہاں آنے کا پورا حق ہے۔

پافل پیئر وچ کی بھنویں تن گئیں اور نکولائی پیئر وچ کچھ سٹپٹا گیا۔

''بیگم صاحب آداب۔'' اس کی آواز دبی دبی سی تھی۔

''آداب۔'' اس کی آواز ایسی بلند تو نہیں تھی، لیکن اس میں ایک جھنکار سی ضرور تھی۔ ایک نظر اس نے ارکادی پر ڈالی اور ارکادی اس کے جواب میں مسکرادیا۔ وہ بڑی آہستگی سے وہاں سے واپس چل دی۔ اس کی چال میں اک ذرا لڑکھڑاہٹ ضرور تھی، مگر اسے تو یہ لڑکھڑاہٹ بھی سجتی تھی۔

چبوترے پہ چند منٹ تک ایک سکوت طاری رہا۔ پافل پیئر وچ کوکو پینے میں مصروف تھا۔ یکا یک اس نے سر بلند کیا اور پھر دبی آواز میں بولا: ''لیجیے وہ حضرت انکار پسند صاحب تشریف لا رہے ہیں۔''

بازاروف دراصل باغ میں سے پھولوں کی کیاریوں پر سے گزرتا ہوا آ رہا تھا۔ اُس کا کوٹ اور پائینچے مٹی میں سَن گئے تھے۔ اس کے پرانے دہرانے گول ٹوپ کی چوٹی کے گرد گھاس کے تنکے چمٹے ہوئے تھے۔ سیدھے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ تھا اور اس بیگ میں کوئی زندہ چیز حرکت کرتی نظر آ رہی تھی۔ وہ جلدی سے چبوترے کے قریب آیا اور سر کو ایک ذرا جنبش دیتے ہوئے بولا: ''حضرات آداب عرض ہے۔ معاف کیجیے، چائے پہ مجھے دیر ہوگئی۔ میں ابھی واپس آیا۔ میں ذرا ان قیدیوں کو دفع کر آؤں۔''

''یہ کیا ہے..... جونکیں؟'' پافل پیئر وچ نے سوال کیا۔

''نہیں۔ مینڈک ہیں۔''

''آپ انہیں کھاتے ہیں یا سنگھواتے ہیں؟''

''تجربہ کرتا ہوں۔'' بازاروف نے بے توجہی سے جواب دیا اور گھر کی طرف چل دیا۔

پافل پیئر وچ کہنے لگا: ''اب جناب ان کی چیر پھاڑ کریں گے۔ اصولوں میں تو ایمان رکھتے نہیں، لیکن مینڈکوں میں ایمان رکھتے ہیں۔''

ارکادی نے بڑے دردمندانہ انداز میں چچا کو دیکھا۔ نکولائی پیئر وچ نے چپکے سے کندھے مچکائے۔ پافل پیئر وچ کو خود یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس کا لطیفہ ناکام رہا اور اس

نے مرغی خانے اور اس نئے کارندے کی باتیں کرنی شروع کر دیں جو کل شام اس سے یہ شکایت کرنے آیا تھا کہ فوما مزدور بڑا عیاش اور سر پھرا ہے۔ منجملہ اور باتوں کے اس نے یہ بھی کہا کہ "وہ تو لقمان بنا پھرتا ہے۔ ہر جگہ اپنی نالائقی کی داستانیں سناتا پھرتا ہے۔ وہ اس قابل ہرگز نہیں ہے کہ اسے رکھا جائے۔"

(6)

بازاروف واپس آ کر ناشتہ پر ڈٹ گیا اور جلدی جلدی چائے پینی شروع کر دی۔ دونوں بھائی چپ چاپ اسے دیکھتے رہے اور ارکادی کنکھیوں سے باپ کو دیکھ لیتا تھا اور پھر تایا کو۔

"کیا آپ یہاں سے کہیں دور ٹہلنے گئے تھے؟" نکولائی پیئر وچ نے آخر سوال کر ہی ڈالا۔

"وہ جو سفیدے کے درختوں کے قریب ایک چھوٹا سا نالہ ہے نہیں، وہاں تک گیا تھا۔ کوئی چھ مینڈک پکڑے ہیں۔ ارکادی۔ تم ان کی چیر پھاڑ کر لینا۔"

"تو آپ شکاری نہیں ہیں؟"

"جی نہیں۔"

"آپ کا خاص مضمون طبیعات ہے؟" اب پافل پیئر وچ کے بولنے کی باری آئی۔

"جی طبیعات۔"

"کہتے ہیں کہ اس شعبہ میں ٹیوٹنوں نے حال ہی میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔"

"جی ہاں۔ اس میدان میں استادی کا شرف جرمنوں کو ہی حاصل ہے۔" بازاروف نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

پافل پیئر وچ نے جرمن کی بجائے "ٹیوٹن" کا لفظ طنز کی نیت سے استعمال کیا تھا، مگر کسی نے اس پر توجہ ہی نہیں کی۔

’’آپ جرمنوں کے بڑے قدردان معلوم ہوتے ہیں؟‘‘ پافل پیئر وچ اب مبالغہ آمیز حد تک اخلاق برتنے پر اتر آیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں جھلا رہا تھا۔ بازاروف کی سرد مہری پر اس کا رئیسانہ مزاج گرم ہو گیا تھا۔ سرجن کا بیٹا نہ صرف یہ کہ اس سے مرعوب نہیں ہوا بلکہ اس نے تو جواب بھی بڑے بے ڈھب طریقے سے اور بڑے خشک انداز میں دیئے اور اس کے لہجہ میں پھکڑ پن تھا اور یہ پھکڑ پن بھی کچھ گستاخی کی حد تک پہنچ گیا تھا۔

’’وہاں کے سائنس دان گرہ کی رکھتے ہیں۔‘‘

’’میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ روس کے سائنس دانوں کے بارے میں آپ کی رائے کچھ زیادہ اچھی نہیں معلوم ہوتی۔‘‘

’’ممکن ہے۔‘‘

’’یہ خاکساری واقعی بڑی قابل قدر ہے۔‘‘ پافل پیئر وچ نے اک ذرا پھریری لی اور اپنا سر پیچھے کی طرف کر لیا۔ ’’لیکن یہ کیا بات ہے۔ ارکادی نکولائی ابھی ہمیں بتا رہا تھا کہ آپ تو کسی کی استادانہ حیثیت کے آگے سر ہی نہیں جھکاتے۔ تو کیا آپ نے ان کی حیثیت کو تسلیم نہیں کر لیا ہے؟‘‘

’’مگر میں نے ان کے آگے سر کب جھکایا ہے اور آخر مَیں کیوں کسی کو سند سمجھوں۔ وہ مجھ سے سچی بات کہتے ہیں۔ میں اسے مان لیتا ہوں۔ قصہ ختم ہوا۔‘‘

’’اور کیا سارے جرمن لوگ سچی باتیں کہتے ہیں؟‘‘ پافل پیئر وچ کے چہرے پر عناد کے ساتھ ساتھ دوری کا احساس بھی جھلکنے لگا تھا گویا کہ وہ یہاں سے اٹھ کر بادلوں کی بلندی پہ جا پہنچا ہے۔

’’سب تو نہیں کہتے۔‘‘ بازاروف نے یہ کہتے ہوئے ایک جمائی لی۔ بحث کو آگے چلانے پر وہ آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔

پافل پیئر وچ نے ارکادی کی طرف اس انداز سے دیکھا گویا کہہ رہا ہے کہ ’’یہ تمہارے دوست واقعی بڑے خوش اخلاق ہیں۔‘‘ اک ذرا کوشش کے بعد وہ پھر بولا۔ ’’میں ذرا زوال پسند واقع ہوا ہوں۔ جرمن مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ روسی جرمنوں کا میں ذکر نہیں کر رہا ہوں۔ ان کی فطرت سے تو ہم سب واقف ہیں مگر مجھے تو جرمنی کے جرمن بھی

پسند نہیں۔ پچھلے زمانے میں تو ان کے یہاں اِکّا دُکّا ٹھکانے کے آدمی تھے بھی' مثلاً شلر یا گوئٹے۔ یہ ہمارے بھائی صاحب تو ان کے بہت ہی قائل ہیں' مگر اب تو وہ نرے کیمیا گر اور مادہ پرست بن کر رہ گئے ہیں.....''

بازاروف بیچ میں بول اٹھا۔ ''اچھا کیمیا گر ہو تو وہ شاعر سے لاکھ درجہ بہتر اور مفید آدمی ہے۔''

پافل پیٹروچ کچھ اونگھ سا رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے نگاہیں اٹھائیں اور بولا۔ ''اخا تو آپ آرٹ کے قائل نہیں ہیں؟''

اور بازاروف حقارت آمیز لہجہ میں ہنس کر بولا۔ ''پیسہ پیدا کرنے کا آرٹ یا گولیوں کے اشتہار دینے کا آرٹ؟''

''آپ کو مذاق اڑانے میں خاصا لطف آتا ہے۔ آپ ان چیزوں سے منکر ہیں۔ چلئے مان لیا تو آپ صرف سائنس میں ایمان رکھتے ہیں؟''

''میں نے ابھی ابھی عرض کیا نا کہ میں کسی چیز میں ایمان نہیں رکھتا۔ اور سائنس کیا ہے؟ مختلف علوم تو ضرور ہیں جیسے مختلف پیشے اور معاش کے ذریعے ہوتے ہیں' لیکن سائنس کا بذاتِ خود تو کوئی وجود نہیں ہے۔''

''بہت خوب۔ اچھا یہ بتائیے کہ انسانی افعال کے بارے میں جو دوسری مسلمہ روایات ہیں' ان کے بارے میں آپ کا نقطہ نظر کیا ہے۔ کیا ان کے بارے میں بھی آپ نے منفی رویہ اختیار کر رکھا ہے۔''

''کیا مجھ سے جرح ہو رہی ہے؟''

پافل پیٹروچ کا رنگ اک ذرا پیلا پڑ گیا..... نکولائی پیٹروچ نے اس وقت گفتگو میں دخل دینا اپنا فرض سمجھا اور کہنے لگا۔ ''یوگینی وسل یوچ ہم پھر کسی دن تفصیل سے اس موضوع پر آپ سے گفتگو کریں گے۔ آپ کے خیالات سنیں گے اور اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں یہ سن کر بے حد خوش ہوا کہ آپ نیچرل سائنس پڑھ رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ لائی بگ نے زمین کو بہتر بنانے کے سلسلے میں بعض بڑی حیرت انگیز تحقیقات کی ہیں۔ آپ اس سلسلہ میں مجھے مشورے دے سکتے ہیں۔''

''نکولائی پیئر وچ یوں تو یہ خاکسار آپ کا خادم ہے مگر لائی بگ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ بہت آگے کی چیز ہے۔ بچہ پہلے الف ب ت سیکھتا ہے' پھر پڑھنا شروع کرتا ہے اور ہم سے ابھی اچھی طرح اس کی ابجد بھی نہیں آئی ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں۔ تم ہونا انکار پسند۔'' نکولائی پیئر وچ نے دل میں کہا اور پھر بلند آواز سے بولا: ''پھر بھی آپ مجھے یہ اجازت دیں گے کہ میں وقتاً فوقتاً آپ سے استفادہ کرتا رہوں۔ اچھا بھائی صاحب اب میں سمجھتا ہوں کہ کارندے سے چل کر بات کر لیں۔''

پافل پیئر وچ کرسی سے.....اٹھ کھڑا ہوا اور بغیر کسی کی طرف دیکھے ہوئے کہنے لگا: ''ہاں صاحب یہ بھی ایک حادثہ ہے کہ پانچ سال سے گاؤں میں عالم فاضل لوگوں سے الگ تھلگ پڑے ہیں۔ آدمی نرا احمق بن کر رہ جاتا ہے۔ لاکھ کوشش کیجیے کہ جو پڑھا لکھا ہے اسے نہ بھولیں مگر اچانک وہ آپ کو بتائیں گے کہ یہ سب بکواس ہے۔ دانا بینا لوگ اب اس قسم کی حماقتوں کو نہیں مانتے اور آپ معاف کیجیے گا آپ تو دقیانوس کے زمانے کی یادگار ہیں' مگر کیا کیا جا سکتا ہے۔ نوجوان واقعی ہم سے زیادہ سمجھ دار ہیں۔''

پافل پیئر وچ آہستہ سے مڑا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ نکولائی پیئر وچ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

اور جب دونوں بھائی دروازہ بھیڑ کر باہر نکل گئے تو بازاروف نے بڑے اطمینان سے ارکادی سے پوچھا: ''کیا ان کی ہمیشہ یہی کیفیت ہوتی ہے؟''

ارکادی کہنے لگا: ''یف گینی! میں اتنا ضرور کہوں گا کہ تم ان سے اچھی طرح پیش نہیں آئے۔ تم نے ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی۔''

''میں ان دیہاتی رئیسوں کو خاطر میں تو لانے سے رہا۔ اس ٹھسّے میں' ان چھیل چھبیلی اداؤں میں' اس ہرزہ سرائی میں کیا رکھا ہے۔ اگر شاہانہ مزاج پایا ہے تو پھر پیٹرسبرگ میں جا کر کیوں نہیں رہتے۔ مگر خیر ان کی باتیں بہت ہو گئیں۔ مجھے ایک بہت عجیب آبی کیڑا ملا ہے۔ میں تمہیں دکھاؤں گا۔''

ارکادی نے اپنی بات شروع کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں ان کا قصہ سناؤں گا؟''

''کیڑے کا قصہ؟''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ تایا جان کا قصہ سناؤں گا۔ پھر تمہیں معلوم ہوگا کہ تم جو سمجھتے ہو وہ اس قسم کے آدمی نہیں ہیں۔ فقرہ بازی سے زیادہ وہ ہمدردی کے مستحق ہیں۔''

''مجھے اس سے کب انکار ہے مگر تم خواہ مخواہ ان کی فکر میں کیوں دبلے ہوئے جا رہے ہو؟''

''یف گینی! آدمی کو انصاف پسندی سے کام لینا چاہیے۔''

''یہ کیسے؟''

''کیسے ویسے نہیں۔ سنو.....''

اور ارکادی نے اپنے تایا جان کا قصہ سنانا شروع کر دیا۔ آئندہ باب میں قاری کے لیے یہ قصہ نقل کیا جاتا ہے۔

(7)

پافل پیئر وچ کرسانوف کی تعلیم شروع میں چھوٹے بھائی کی طرح گھر پر اور پھر کور آف پیجز میں ہوئی۔ بچپن ہی سے وہ بلا کا خوبصورت تھا۔ خود اعتمادی اور پھر طنزیہ لہجہ جس میں مزاح کے تیر و نشتر بھی چھپے ہوتے تھے؛ جس نے دیکھا خوش ہوا' جہاں جایئے پافل موجود۔ چھوٹتے ہی فوج میں افسری ملی۔ محفلوں میں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی اور اس نے بھی حد کر رکھی تھی۔ عجب ٹھسّے سے رہتا تھا۔ جب دیکھو کوئی سنک سوار ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہر قسم کی حماقتیں بھی کرتا تھا' لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ان باتوں سے بھی اس کی شخصیت کی دلکشی میں اضافہ ہی ہوتا تھا۔ عورتیں تو اسے دیکھ کر ہوش و حواس کھو بیٹھتی تھیں۔ مرد اسے مغرور کہتے تھے اور دل ہی دل میں اس کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے۔ وہ اپنے بھائی کے ہمراہ رہتا تھا اور اگرچہ دونوں کی طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا مگر پھر بھی وہ اسے دل سے چاہتا تھا۔ نکولائی پیئر وچ ایک ذرا لنگڑا کر چلتا تھا۔ سبک سبک خوشگوار نقشہ جس پہ حزن کی ایک کیفیت جھلکتی رہتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی سیاہ آنکھیں۔ باریک

ملائم بال۔ طبیعت میں کاہلی ضرور تھی مگر پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ محفل میں جھینپا جھینپا رہتا تھا اور پافل پیئر وچ کی حالت یہ تھی کہ آندھی آئے مینہ برسے، شام کو اسے گھر سے نکلنا ضرور۔ ہمیشہ بے تکلفی اور پھکڑّ پن کی شیخیاں بگھارتا تھا اور پڑھنے لکھنے کے نام لے دے کے پانچ چھ فرانسیسی کتابیں پڑھی تھیں۔ اٹھائیسواں برس پورا نہ ہوا تھا کہ کپتان ہو گیا۔ ترقی کی روشن شاہراہیں اس کے قدم لینے کی منتظر تھیں، لیکن یکا یک رنگ میں بھنگ پڑ گیا۔

اس زمانے میں پیٹرسبرگ کی محفلوں میں کبھی کبھی ایک عورت شہزادی رے خاتون نظر آیا کرتی تھی جس کی یاد لوگوں کے دلوں میں اب تک باقی ہے۔ بڑی تعلیم یافتہ اور مہذب عورت تھی مگر شوہر نرا احمق الذی تھا۔ گود خالی تھی۔ اس کی زندگی کا بھی عجب طور تھا۔ سنکیوں کے سارے طریقے اختیار کر رکھے تھے۔ یکا یک سر میں سودا سمایا اور سفر پر نکل پڑی۔ پھر اچانک خفقان ہوا اور روس واپس۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ بڑی ہفت رنگن ہے۔ عاشقوں کو چٹکیوں میں اڑاتی ہے۔ اس نے ہر قسم کی عیاشی کی اور دل بھر کر کی۔ رقص اتنا کرتی تھی، اتنا کرتی کہ تھک کر چُور ہو جاتی۔ رات کے کھانے سے پہلے اس کے ڈرائنگ روم کی مدھم روشنی میں نوجوانوں کا جمگھٹا رہتا اور ان سے خوب ہنسی مذاق ہوتا، چہلیں ہوتیں۔ جب رات ہوتی تو زاروقطار آنسو جاری ہو جاتے اور دعائیں ہونے لگتیں۔ کسی چیز سے تسکین نہ ہوتی۔ اکثر یوں ہوتا کہ صبح تک کمرے میں ٹہلتی رہتی اور کفِ افسوس ملتی رہتی یا یوں ہوتا کہ انجیل لے کر بیٹھ جاتی اور اس کے چہرے پر زردی کھنڈ جاتی اور وہ بت بن جاتی۔ اِدھر دن نکلا اور اُدھر اس نے چولا بدلا اور پھر اسی ٹھسّے سے گھر سے نکلتی۔ ہنستی بولتی، ٹھٹھے لگاتی اور دل بہلانے کا جہاں برائے نام بھی سامان نظر آتا، وہاں دل کھول کر مزے اڑاتی۔ جسم میں بلا کی موزونیت تھی۔ اس کے سنہری رنگ میں رنگے ہوئے بال گھٹنوں سے نیچے تک لٹکے ہوئے یوں معلوم ہوتے گویا سونے کی بھاری بھاری لڑیاں لٹک رہی ہیں، مگر اسے حسین نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس کے پورے چہرے میں لے دے کے بس آنکھیں ایسی تھیں جن میں کچھ خوبی تھی، لیکن آنکھیں بھی کچھ ایسی اچھی تو تھیں نہیں۔ ان کا رنگ بادامی تھا اور وہ ایسی بڑی بڑی بھی نہیں تھیں، لیکن ان نگاہوں میں ایک برّاقی تھی، گہرائی تھی، بے نیازی تھی جس نے

بڑھتے بڑھتے نڈر پن کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ گھمبیر تا تھی جو گہری ہوتے ہوتے حزن کی کیفیت بن گئی تھی۔ یوں کہیے کہ وہ نگاہیں جادو بھری تھیں۔ جب وہ انتہائی لایعنی باتیں کرتی تھی تو اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں ایک عجیب و غریب قسم کی چمک پیدا ہو جاتی۔ لباس میں وہ بڑا اہتمام اور التزام برتتی تھی۔ پافل پیئر وچ کی اس سے مڈھ بھیڑ ایک مرتبہ بال روم میں ہوئی۔ دونوں نے ساتھ ساتھ رقص کیا۔ رقص کے دوران میں اس نے ایک بھی تو ڈھنگ کی بات نہیں کہی تھی مگر پافل تو اس پہ بری طرح لٹو ہو گیا۔ فتوحات تو وہ ہمیشہ ہی سے کرتا چلا آیا تھا۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی اس نے بہت جلد میدان مار لیا' لیکن یہ آسانی ایک اور مشکل کا پیش خیمہ بن گئی۔ یوں اس نے گنگا نہا لی تھی' لیکن اس کے دل کی آگ کسی طرح سرد ہونے میں نہ آتی تھی۔ الٹا یہ ہوا کہ اسے اچھا خاصا ایک روگ لگ گیا اور اس عورت سے تعلق شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ یہ عورت بھی عجیب و غریب تھی۔ جب وہ انتہائی حد تک سپردگی کے عالم میں ہوتی' اس وقت بھی یہ محسوس ہوتا رہتا کہ ابھی اس کی شخصیت میں ایک اور گوشہ چھپا ہوا ہے جو ایک بھید ہے اور جس تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اس روح میں کیا چھپا ہوا تھا۔ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ چند پُراسرار طاقتوں کے پھندے میں گرفتار ہے جو خود اس کے لیے ایک معمہ ہیں اور یوں لگتا تھا کہ ان طاقتوں کے ہاتھوں میں وہ ایک کھلونا بن کر رہ گئی ہے۔ اس کی عقل میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اس کی تلون مزاجیوں پہ غالب آ جاتی۔ اس کا پورا طرزِ عمل متضاد کیفیتوں کا ایک سلسلہ تھا۔ اس قسم کے خطوط جو اس کے شوہر کو بجا طور پر شک میں ڈال سکتے تھے' اس نے ایک ایسے شخص کو لکھے جو اس کے لیے قطعاً اجنبی تھا اور اس کی محبت میں ہمیشہ ایک حزن والم کی کیفیت جھلکتی رہتی تھی۔ جس شخص کو اس نے اپنا عاشق منتخب کیا تھا' اس سے ہنسنا بولنا تک چھوڑ دیا۔ بس بیٹھی بیٹھی اس کی باتیں سنتی رہتی اور کھوئے کھوئے سے انداز میں اسے تکتی رہتی۔ کبھی کبھی یکا یک یہ کھویا کھویا انداز بدلتا اور اس پہ دہشت طاری ہو جاتی، اس کے چہرے سے ایک وحشیانہ قسم کی موت کی سی کیفیت ظاہر ہونے لگتی۔ اس وقت وہ اپنے سونے کے کمرے میں جا کر بند ہو جاتی اور اس کی خادمہ جب دراڑ سے کان لگاتی تو اسے ہچکیوں کی دبی دبی آواز سنائی دیتی۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ کرسانوف سے اس کی بڑی میٹھی میٹھی باتیں ہوئیں اور جب وہ گھر لوٹا تو

اس نے بے کلی کی وہ تلخ اور دلگداز کیفیت محسوس کی جو ناکامی کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔

اس نے اپنے دل پہ جب ایک بار سا محسوس کیا تو وہ اپنے آپ سے پوچھنے لگا کہ ''آخر میں اور کیا چاہتا ہوں؟''

ایک مرتبہ اس نے اسے ایک انگوٹھی دی جس کے نگینے پہ ابوالہول کی تصویر کھدی ہوئی تھی۔

وہ پوچھنے لگی۔ ''یہ کیا ہے؟ ابوالہول؟''

اس نے جواب دیا۔ ''جی۔ اور یہ ابوالہول خود تم ہو۔''

''میں؟'' اس نے سوال کیا۔ پھر اس نے اپنی جادو بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ یہ میری کتنی بڑی تعریف ہے۔'' یہ فقرہ اس نے ایک بے معنی مسکراہٹ کے ساتھ ادا کیا۔ اگرچہ وہ عجیب وغریب کیفیت رکھنے والی نگاہیں اب تک اس کے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں۔

پافل پیئر وچ تو اس وقت بھی درد والم کا شکار تھا۔ جب شہزادی رے خاتون اس سے محبت کرتی تھی، لیکن جب وہ اس سے سرد مہری برتنے لگی اور یہ زمانہ جلد ہی آ گیا تو پھر تو اس کی حالت دیوانوں کی سی ہوگئی۔ آتش عشق اسے پھونکے ڈالتی تھی۔ ایک جلن تھی جو اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی مگر اس نے بھی اسے چین لینے ہی نہیں دیا۔ جہاں وہ جاتی سائے کی طرح اس کے پیچھے لگا رہتا۔ اس روش سے اس کا ناک میں دم آ گیا اور آخر کار وہ وہاں سے باہر چلی گئی۔ پافل کے دوستوں نے اسے بہتیرا سمجھایا بجھایا، بزرگوں نے تسلی تشفی کی مگر اس نے ایک نہ سنی اور ملازمت چھوڑ چھاڑ شہزادی کے پیچھے لگ گیا۔ چار سال تک وہ دوسروں ملکوں میں خاک پھانکتا پھرا۔ کبھی وہ اس کے پیچھے پیچھے پھرتا اور کبھی خود ہی اس سے کھنچ جاتا۔ اسے اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔ اپنی ہمت کی کمی پر اپنی ذات سے وہ متنفر ہو گیا لیکن سب بے سود۔ اس کی صورت، وہ حیرت بھری، بے معنی لیکن دلکش صورت اس کے دل کی گہرائیوں میں سما گئی تھی۔ بیڈن پہنچ کر ایک مرتبہ پھر ان کا ملاپ ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ شہزادی کا دل یوں ٹوٹ کر اس پہ کبھی نہیں آیا تھا، لیکن مہینہ بھر کے اندر اندر پھر دنیا بدل گئی۔ چراغ نے آخری سنبھالا لیا اور ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔ جب پافل نے دیکھا کہ جدائی

ناگزیر ہے تو اس نے چاہا کہ کم از کم اس سے دوستی تو قائم رہے۔ گویا ایسی عورت دوستی بھی کر سکتی ہے۔ وہ چپکے سے بیڈن چھوڑ کر چلی گئی اور اس کے بعد سے وہ مستقل طور پر کرسانوف سے پہلوتہی کرتی رہی۔ وہ روس واپس آ گیا اور اسی سابقہ انداز میں زندگی بسر کرنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن وہ پرانی صحبتیں اب بھلا کہاں تازہ ہوتی تھیں۔ اس پہ تو گویا جن سوار تھا۔ شہروں شہروں مارا پھرتا تھا، محفلوں میں وہ اب بھی شریک ہوتا تھا۔ دنیوی آدمیوں میں جو پھرتی ہوتی ہے، وہ بھی اس میں آ گئی تھی۔ دو تین نئے میدان مارنے کا بھی اسے فخر حاصل ہو گیا تھا، لیکن اب نہ تو اپنے آپ سے اور نہ دوسروں سے اسے کوئی توقع رہی تھی۔ کسی مہم کو اب اس کا جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ اب وہ بوڑھا ہو چلا تھا۔ اس کے بالوں کی سیاہی زائل ہونے لگی تھی۔ اس کی جلد کا رنگ زرد ہوتا جا رہا تھا۔ شام کو وہ برابر کلب میں آتا، لیکن بے کیفی وہاں بھی برقرار رہتی۔ کنواروں کی صحبتوں میں بیٹھ کر بحثیں کرتا۔ اس کے بغیر اس کی روٹی ہضم نہیں ہوتی تھی اور دنیا جانتی ہے کہ یہ بری لت ہے۔ رہا شادی کا معاملہ تو اسے بھول کر بھی یہ خیال نہیں آیا۔ دس برس اسی انداز سے گزر گئے۔ بڑی بے رنگی اور بدمزگی سے گزرے اور تیزی سے دہشت ناک حد تک تیزی سے گزرے۔ وقت کی رفتار روس میں جتنی تیز ہے شاید ہی کہیں اور ہو۔ بس پلک مارتے گزرتا ہے۔ سنتے ہیں کہ قید خانے میں اس کی رفتار اس سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے۔ ایک روز پافل پیئر وچ کلب میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ وہاں اسے اطلاع ملی کہ شہزادی رے اللہ کو پیاری ہو گئی۔ پیرس میں کم و بیش جنون کی حالت میں اس کا انتقال ہوا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بہت دیر تک کلب کے کمروں میں ٹہلتا رہا یا کبھی کبھی وہ تاش کھیلنے والوں کے پاس پہنچ کر چپ چاپ کھڑا ہو جاتا تھا۔ مگر کلب سے واپسی کا جو وقت تھا، اس کے معمول میں اس نے فرق نہیں آنے دیا۔ چند دن بعد اسے ایک پیکٹ موصول ہوا۔ اس میں وہ انگوٹھی رکھی تھی جو اس نے شہزادی کو دی تھی۔ ابوالہول پر اس نے صلیب کی شکل میں لکیریں کاڑھ دی تھیں اور اسے لکھا تھا کہ معمہ کا حل یہ صلیب ہے۔

یہ 1848ء کے آغاز کا ذکر ہے، اس وقت کا جب نکولائی پیئر وچ بیوی کے انتقال کے بعد پیٹرسبرگ پہنچا تھا۔ جب سے اس نے گاؤں میں رہنا شروع کیا تھا۔ اس

وقت سے شاید ہی کبھی پافل کو اس سے ملنے کا موقع ملا ہو۔ جن دنوں نکولائی پیئر وچ کی شادی ہوئی تھی، انہیں دنوں پافل پیئر وچ کی شہزادی سے ملاقات ہوئی تھی۔ جب وہ روس واپس آیا تو اس ارادے سے بھائی کے پاس گیا تھا کہ ایک دو مہینے اس کے ساتھ رہے اور اس کی خوشی سے خوش ہو' لیکن وہاں وہ ایک ہفتے سے زیادہ نہ ٹک سکا۔ دونوں بھائیوں کی حیثیتوں میں اب بڑا فرق پیدا ہو گیا تھا۔ 1848ء میں یہ فرق کچھ کم ہو گیا تھا۔ نکولائی پیئر وچ کی بیوی سدھار گئی۔ پافل پیئر وچ کی یادیں رخصت ہو گئیں۔ شہزادی کی موت کے بعد وہ یہ کوشش کرنے لگا کہ اس کا خیال ہی اس کے دل میں نہ آئے' لیکن نکولائی کو ہمیشہ یہ خیال ستاتا رہتا تھا کہ وہ بڑے اطمینان کی زندگی بسر کر چکا ہے۔ اس کا بیٹا اس کی آنکھوں کے سامنے جوان ہو رہا تھا۔ اس کے برخلاف پافل ایک تنہائی کا مارا کنوارا شخص تھا۔ وہ اس منزل میں قدم رکھ رہا تھا' جہاں تأسفات اور امیدوں کا غیر واضح دھندلکا منڈلاتا رہتا ہے۔ ان تأسفات میں امیدوں کی جھلک ہوتی ہے اور امیدوں میں تأسف کی کیفیت ہوتی ہے یعنی وہ وقت جب جوانی رخصت ہو چکی ہوتی ہے اور بڑھاپے کے آنے میں اک ذرا دیر ہوتی ہے۔

یہ وقت سب پر کٹھن گزرتا ہے' لیکن پافل پیئر وچ پر یہ اور بھی کٹھن گزرا۔ اس نے اپنے ماضی سے کیا دستبرداری اختیار کی ہر چیز سے ہی دستبردار ہو گیا۔

ایک روز نکولائی پیئر وچ اس سے کہنے لگا۔ ''میں اب آپ کو میر نیو آنے کی دعوت تو دوں گا نہیں۔ (بیوی کی یاد میں اس نے اپنی جائداد کا یہ نام رکھا تھا) بیگم کے زمانے میں جب آپ وہاں آئے تھے تو آپ کا دل ہی نہیں لگا اور اب تو آپ کو وہاں خفقان ہونے لگے گا۔''

پافل پیئر وچ نے جواب دیا۔ ''اس وقت نہ تو گرہ میں عقل تھی نہ طبیعت کو قرار تھا لیکن اب مجھے عقل تو خیر آئی ہو یا نہ آئی ہو' صبر ضرور آ گیا ہے بلکہ اب تو اگر تم مجھے اجازت دو تو میں تمہارے ساتھ ہی رہنا سہنا شروع کر دوں۔''

نکولائی پیئر وچ نے اس جواب پہ اسے سینے سے لگا لیا' لیکن پافل پیئر وچ نے اس گفتگو کے بعد بھی ڈیڑھ سال نکال دیا تب کہیں جا کر اس نے اپنے ارادے کو عمل میں

لانے کا تہیہ کیا، مگر گاؤں میں ایک مرتبہ آ بسنے کے بعد وہ وہاں سے نہیں گیا۔ یہاں تک کہ جب نکولائی پیئر وچ نے جاڑوں میں تین موسم پیٹرسبرگ میں جا کر بیٹے کے ساتھ گزارے تو بھی وہ گاؤں ہی میں رہا۔ اس نے کتابیں پڑھنی شروع کر دیں۔ انگریزی کتابوں پہ اس نے خاص طور پر توجہ کی۔ اس نے دراصل اپنی پوری زندگی ہی کو کم وبیش انگریزی سانچہ میں ڈھالا تھا۔ ہمسایوں سے بہت کم ملتا جلتا تھا۔ بس ایک مارشلوں کے انتخاب کے موقعہ پر وہ گھر سے نکلتا تھا۔ عام طور پر وہاں خاموش رہتا تھا۔ اتفاقیہ طور پر کبھی کبھار یوں بھی ہوتا تھا کہ وہ اپنی آزادخیالی کی باتیں شروع کر دیتا جنھیں سن کر دقیانوسی زمیندار بولا جاتے، لیکن ان موقعوں پر اس نے نئی تانتی کے نمائندوں سے رشتہ کبھی نہیں جوڑا۔ یہ دونوں گروہ اسے نک چڑھا سمجھتے تھے اور یہ دونوں گروہ اس کی عزت بھی کرتے تھے۔ اس وجہ سے کہ اس نے رئیسانہ ٹھاٹ اختیار کر رکھے تھے، اس وجہ سے کہ اس نے عشق کے بڑے میدان مارے تھے، اس وجہ سے کہ وہ بڑا بنا ٹھنا رہتا تھا اور ہمیشہ ہوٹل کے سب سے نفیس کمرے میں ٹھہرتا تھا، اس وجہ سے کہ وہ کھانا عام طور پر ڈھنگ کا کھاتا تھا اور ایک مرتبہ تو اس نے لوئیس فلپ کی میز پر ولنگٹن کے ساتھ کھانا کھایا تھا، اس وجہ سے کہ وہ ہمیشہ اپنے ساتھ ایک چاندی کا ڈریسنگ کیس اور ایک سفری حمام رکھتا تھا، اس وجہ سے کہ اس کے جسم سے ہمیشہ بہت بڑھیا قسم کے عطر کی لپٹیں اٹھتی رہتی تھیں، اس وجہ سے کہ وہ وہسٹ بڑی استادی سے کھیلتا تھا اور پھر وہ اس وجہ سے بھی اس کی عزت کرتے تھے کہ اس کی ایمانداری پہ کبھی حرف نہیں آیا۔ عورتیں اسے دل پھینک اور عاشق مزاج سمجھتی تھیں، لیکن عورتوں سے وہ ربط وضبط نہیں رکھتا تھا۔

ارکادی نے یہ پورا قصہ سنا ڈالا اور بعد میں کہنے لگا۔ ''یف گینی اب تم سوچو کہ تم نے میرے تایا جان کے متعلق رائے قائم کرنے میں کتنی ناانصافی برتی ہے اور یہ ذکر تو خیر فضول ہی ہے کہ انھوں نے ایک بار نہیں، کئی بار والد کی مدد کی۔ اپنا سارا روپیہ انہیں دے ڈالا۔ شاید تمھیں اس کا علم نہیں کہ ہماری جائداد کا بٹوارہ نہیں ہوا تھا۔ وہ تو ہر ایک کی امداد کرنے پر بس ادھار کھائے بیٹھے رہتے ہیں اور بہت سی باتوں کے علاوہ ایک بات یہ ہے کہ وہ کسانوں کا بہت ساتھ دیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان سے بات کرتے وقت وہ برا مناتے ہیں اور بہت ناک بھوں چڑھاتے ہیں.....''

بازاروف بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''ان کے اعصاب کچھ بگڑ گئے ہیں۔''

''ممکن ہے۔ مگر وہ دل کے بہت اچھے ہیں۔ اور حماقت سے تو وہ کوسوں دور ہیں۔ انہوں نے مجھے کس غضب کی نصیحتیں کی ہیں۔ بالخصوص.... بالخصوص عورتوں سے تعلقات کے بارے میں۔''

''بھئی ظاہر ہے کہ دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک کے پیتا ہے۔''

''بہرحال یہ یقین کرو کہ ان کا دل بہت اداس رہتا ہے۔ ان سے نفرت کرنا گناہ ہے۔''

بازاروف نے فوراً ٹوکا۔ ''ان سے نفرت کون کرتا ہے۔ پھر بھی مجھے یہ تو کہنا ہی پڑے گا کہ جو شخص پوری زندگی ایک پتے پہ یعنی عورت کے عشق پہ لگا بیٹھے اور جب وہ پتا ہار جائے تو منہ بگاڑنے لگے اور اپنا یہ حال کرلے کہ دنیا کے کسی کام ہی کا نہ رہے۔ ایسا شخص مرد تھوڑا ہی ہوا، بس مذکر کا صیغہ ہوا۔ تم کہتے ہو انہیں بڑا غم ہے۔ یہ تو تمہیں ہی بہتر معلوم ہو سکتا ہے مگر یہ طے ہے کہ جو خناس ان کے دماغ میں بس گیا ہے۔ اس سے انہوں نے ابھی پورے طور پر نجات نہیں پائی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اب تک بڑی نیک نیتی سے اپنے آپ کو ایک اعلیٰ قسم کی مخلوق سمجھتے ہیں۔ وہ بیہودہ رسالہ ''کالگنانی'' ان کے زیر مطالعہ رہتا ہے اور ہر مہینہ وہ کسی کسان کو کوڑوں کی سزا سے نجات دلانے کا فرض انجام دیتے ہیں۔''

ارکادی بولا۔ ''لیکن ان کی تربیت کو بھی تو نظر میں رکھو اور پھر یہ سوچو کہ کس زمانے میں انہوں نے ہوش سنبھالا تھا۔''

''تربیت؟'' بازاروف بیچ میں بول پڑا۔ ہر شخص کو اپنی تربیت آپ کرنی چاہیے۔ مثلاً میں نے اپنی تربیت آپ کی ہے اور جہاں تک زمانے کا معاملہ ہے تو میں زمانے کا محتاج کیوں رہوں؟ وہ خود میرا محتاج کیوں نہ ہو۔

''نہیں میری سرکار۔ بات یہ ہے کہ یہ محض اوچھا پن ہے۔ یہ ریڑھ کی ہڈی غائب ہونے کی نشانی ہے اور یہ عورت اور مرد کے پُراسرار تعلقات کے بارے میں کیا بات کا بتنگڑ کیا جا رہا ہے۔ ہم جسمانیات کے طلبا خوب جانتے ہیں کہ ان تعلقات کی کیا حیثیت ہے۔ تم آنکھ کی ہیئت ترکیبی کا مطالعہ کرو اور پھر دیکھو کہ جس طلسمی نگاہ کی تم بڑہانک رہے ہو اس کی کیا حقیقت ہے۔ یہ محض رومانیت ہے، بکواس ہے۔ جمالیات کی

اس پوٹ میں کیا رکھا ہے۔ اس سے کہیں بہتر یہ ہے کہ ہم آبی کیڑوں کی ہیئت ترکیبی کا مطالعہ کرلیا کریں۔''

اور دونوں دوست بازاروف کے کمرے میں داخل ہوگئے۔ کمرہ ڈاکٹری اور سرجری کی اشیاء کی ناخوشگوار بُو سے بسا ہوا تھا۔ اس بُو میں سستے تمبا کو کی بُو بھی ملی ہوئی تھی۔

(8)

نکولائی پیئر وچ اور کارندے کی گفتگو ہوتی رہی، لیکن پافل پیئر وچ وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ کارندہ تھا تو بالکل سینک سلائی اور آواز میں بھی بڑا مٹھاس اور دھیما پن تھا لیکن آنکھوں میں مکاری جھلکتی تھی۔ نکولائی پیئر وچ جو بات بھی کرتا، اس کے پاس نپا تلا ایک جواب تھا۔

''درست ہے سرکار۔'' اس کی ساری کوشش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح کسانوں کو چور اور شرابی ثابت کر دیا جائے۔ جائداد میں ابھی ابھی نئی اصلاحات کی گئی تھیں۔ نئی مشینیں بغیر گریس لگے ہوئے پہیوں کی طرح چرخ چوں چرخ چوں کرتی ہوئی چلتی تھیں اور لکڑی کے گھریلو فرنیچر کی طرح ٹیڑھی میڑھی ہو جاتی تھیں، چیخ جاتی تھیں۔ نکولائی پیئر وچ نے ہمت تو نہیں ہاری، لیکن اکثر وہ ٹھنڈی آہیں بھرتا ضرور نظر آتا تھا اور اس کے چہرے پر حزن وملال جھلکنے لگتا تھا۔ اس نے یہ بات تاڑ لی تھی کہ بغیر پیسہ کے یہ گاڑی نہیں کھنچ سکتی اور پیسہ قریب قریب سب ختم ہو چکا تھا۔

ارکادی نے سچ ہی کہا تھا۔ پافل پیئر وچ نے کئی بار بھائی کی مدد کی۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ نکولائی پیئر وچ اس ادھیڑ بُن میں ہے کہ کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے اور اس کی عقل کچھ کام نہیں کرتی۔ پافل پیئر وچ اسے فکر میں غلطاں دیکھ کر ارادتاً کھڑکی کی طرف ٹہل جاتا اور جیبوں میں ہاتھ ٹھونس کر بڑبڑانے لگتا ہے۔

''اچھا تو لو میں یہ رقم تمہیں پھر دیئے دیتا ہوں۔''

اور اسے روپیہ دے دیتا ہے، لیکن آج اس کی جیب خالی تھی اور اس نے وہاں

سے سرک جانا ہی مناسب سمجھا۔ کھیتی باڑی کے انتظام کی بے معنی تفصیلات سے اسے الجھن ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ نکولائی پیئر وچ اپنی انتہائی گرم جوشی اور جانفشانی کے باوجود درست انتظام نہیں کرتا۔ اگر چہ وہ واضح طور پر یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ نکولائی پیئر وچ نے کہاں کہاں چُوک کی۔ وہ اپنے دل کو یہ کہہ کے تسکین دے لیا کرتا تھا کہ ''اپنا بھائی کاروباری باتیں نہیں جانتا۔ وہ تو اس پہ مسلط ہو گئی ہیں۔'' اس کے برخلاف نکولائی پیئر وچ تو پافل پیئر وچ کی کاروباری قابلیت کا بڑا قائل تھا اور ہر کام میں اس سے مشورہ لیتا تھا۔ وہ کہنے لگتا۔ ''میں تو بہت کمزور ڈھیلا ڈھالا آدمی ہوں، ساری زندگی باولے پن میں گزار دی مگر آپ نے زمانے کا گرم وسرد دیکھا ہے۔ آپ کی نگاہ غضب کی تیز ہے۔ آدمی کو آپ فوراً تاڑ لیتے ہیں۔''

پافل پیئر وچ اس کا جواب یہی دیتا تھا کہ وہاں سے ہٹ جاتا تھا۔ ویسے اس نے بھائی کی بات کی تردید کبھی نہیں کی۔

نکولائی پیئر وچ کو یہاں چھوڑ کو وہ اس دالان میں جا نکلا جو مکان کے اگلے حصے کو پچھلے حصے سے الگ کرتا تھا۔ ایک نیچے سے دروازے پر پہنچ کر وہ ٹھٹک گیا۔ اس نے اپنی مونچھوں کو بل دیا اور پھر دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔

''کون ہے؟ اندر آجائیے۔'' یہ فینشکا کی آواز تھی۔

''میں ہوں۔'' اور یہ کہہ کر پافل پیئر وچ نے دروازہ کھولا۔

فینشکا اپنے بچہ کو لیے ہوئے ایک کرسی پہ بیٹھی تھی۔ وہ بچے سمیت جھٹ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے بچہ کو ایک لڑکی کے سپرد کیا جو اسے لے کر فوراً کمرے سے چلی گئی اور اس نے سٹر پٹرا اپنے رومال کو درست کیا۔

''معاف کیجیے۔ آپ کو زحمت ہوئی۔'' پافل پیئر وچ کی نگاہیں اور طرف تھیں۔ ''میں یہ پوچھنے آیا تھا..... آج شاید کسی کو شہر بھیجا جائے گا..... میرے لیے سبز چائے منگوا لیجیے۔''

''جی بہت اچھا۔ کتنی چائے منگائی جائے؟''

''میرے خیال میں یہی کوئی نصف پونڈ کافی ہوگی۔ اچھا اب تو آپ نے کمرے

کا چولا ہی بدل ڈالا ہے۔'' اور اس آخری فقرے کے ساتھ ساتھ اس کی نگاہیں تیزی سے اٹھیں اور انہوں نے پورے ماحول کا جائزہ لے ڈالا۔ اس تقریب سے ایک اڑتی سی نگاہ فینشکا کے چہرے پر بھی پڑی۔ فینشکا اس کی بات کو نہیں سمجھ سکی تو اس نے بات کی تشریح کی۔ ''اب تو پردے بھی پڑ گئے ہیں۔''

''جی پردے۔ جی ہاں۔ نکولائی پیئر وچ کی عنایت ہے۔ انہوں نے یہ پردے لا کر دیئے ہیں مگر انہیں تو بہت دن ہو گئے۔''

''جی ہاں۔ میں بھی تو بہت دنوں بعد یہاں آیا ہوں۔ اب کمرہ بہت اچھا ہو گیا۔''

''نکولائی پیئر وچ کی عنایت ہے۔'' فینشکا نے دھیرے سے کہا۔

''جس کٹیا میں آپ رہا کرتی تھیں' اس کی نسبت تو آپ کو یہاں بہت آرام ہوگا؟'' پافل پیئر وچ نے بڑی شائستگی سے یہ سوال کیا تھا' لیکن اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا تو نشان بھی نہیں تھا۔

''جی ہاں۔ یہاں بہت آرام ہے۔''

''اور اب وہاں کون رہتا ہے؟''

''وہاں اب دھوبنیں رہتی ہیں۔''

''اچھا۔''

پافل پیئر وچ چپ ہو گیا۔ فینشکا سوچنے لگی۔ ''اب یہ جا رہے ہیں۔'' لیکن وہ جانے والا کہاں تھا اور وہ اس کے سامنے پتھر بنی کھڑی رہی۔

آخر پافل پھر بولا۔ ''آپ نے بچہ کو باہر کیوں بھیج دیا۔ مجھے بچوں سے بہت لگاؤ ہے۔ ذرا اسے دکھایئے تو۔''

فینشکا خوش ہونے کے ساتھ ساتھ سٹپٹا بھی گئی تھی۔ پافل پیئر وچ سے وہ ڈری ڈری سی تھی۔ اسے اس سے بولنے کا موقع تو شاید کبھی بھی پیش نہیں آیا تھا۔

اس نے آواز دی۔ ''دونیاشا۔ ذرا میتیا کو یاں لے آؤ۔'' فینشکا گھر میں دراصل کسی سے بھی بے تکلف نہیں تھی۔ ''مگر ذرا ٹھہرو۔ اسے میں فراک پہنا دوں۔'' فینشکا دروازے کی طرف جانے لگی۔

''رہنے دیجیے۔ حرج ہی کیا ہے۔''

''میں ابھی آئی۔'' یہ کہہ کے فینشکا جلدی سے باہر نکل گئی۔

پافل پیئر وچ اکیلا رہ گیا اور اس نے بڑے غور اور توجہ سے ارد گرد نظر ڈالی۔ یہ چھوٹا سا نیچا کمرہ بڑا صاف ستھرا تھا۔ ہر چیز قرینے سے رکھی تھی۔

دیواروں کے برابر برابر بربط کی شکل کی پشتوں والی کرسیاں رکھی تھیں۔ جنرل صاحب خدا انہیں غریقِ رحمت کرے، جب پولینڈ کی مہم پر گئے تھے، اس وقت یہ کرسیاں خرید کر لائے تھے۔ ایک کونے میں آہنی تاروں سے جکڑے ہوئے ایک چسٹ کے قریب ایک چھوٹی سی مسہری پڑی تھی، جس پہ تن زیب کا پلنگ پوش بچھا ہوا تھا۔ اس کے مقابل کے کونے میں ایک صاحب کرامات ہستی سینٹ نکولائی کی ایک بڑی سی سیاہ تصویر کے سامنے چھوٹا سا ایک لیمپ جل رہا تھا۔ اس سے بلندی پر ایک سنہری ہالہ تنا ہوا تھا جس میں چینی مٹی کا ایک ننھا سا انڈا سرخ دھاگے میں بندھا ہوا لٹک رہا تھا اور جو نیچا ہوتے ہوئے اس تصویر کے سینے تک جا پہنچا تھا۔ کھڑکیوں میں سبزی مائل شیشے کے مرتبان بڑی احتیاط سے باندھ کر لٹکائے گئے تھے۔ ان میں پچھلے سال کا اچار بھرا رکھا تھا۔ ان پہ کاغذ کے ٹکڑے چپکا چپکا کر خود فینشکا نے موٹے موٹے حرفوں میں اچار چٹنی کے نام لکھ رکھے تھے۔ دراصل نکولائی پیئر وچ کو اچار کا بڑا شوق تھا۔ چھت میں ایک لمبی سی ڈوری سے بندھا ہوا ایک پنجرا لٹک رہا تھا۔ اس پنجرے میں ایک چھوٹی سی دم والا طوطا بیٹھا شور مچا رہا تھا۔ شور مچانے کے ساتھ ساتھ وہ مستقل طور پر پھدک کے بھی جا رہا تھا، جس کی وجہ سے پنجرا ڈگمگ ڈگمگ کر رہا تھا اور اناج کے دانے ٹپ ٹپ زمین پہ گر رہے تھے۔ ایک چھوٹی سی الماری سے ذرا بلندی پر دیوار پہ نکولائی پیئر وچ کی چند ایک تصویریں آویزاں تھیں۔ یہ پھوہڑ قسم کی تصویریں مختلف زاویوں سے کھینچی گئی تھیں۔ غالباً کسی اٹھائی گیرے فوٹو گرافر کا کارنامہ تھیں۔ ایک تصویر فینشکا کی بھی لگی ہوئی تھی لیکن وہ تو بالکل ہی گئی گزری تھی۔ آنکھیں سرے سے غائب ہی تھیں۔ زبردستی کی مسکراہٹ کے آثار ضرور نظر آ رہے تھے۔ باقی اور کسی چیز کی بابت پتہ نہیں چلتا تھا۔ رہا فریم تو اس کا رنگ مٹی سے بھی بدتر ہو رہا تھا۔ فینشکا کی تصویر سے ذرا اوپر جنرل یارمولوف کی تصویر تھی۔ اس نے سرکیشیا والوں کا سا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ دور قفقاز کے پہاڑ سر اٹھائے

کھڑے تھے جنہیں وہ بہت گھور کر دیکھ رہا تھا۔

پانچ منٹ گزر گئے۔ دوسرے کمرے سے کھسر پھسر اور سٹر پٹر کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پافل پیئر وچ نے چسٹ کی دراز میں سے ایک میلی چکٹی سی کتاب نکال لی۔ یہ میزالاسکی کے "بندوق باز" کی جلد تھی۔ اس نے اس کے ورق پلٹنے شروع کر دیئے۔ دروازہ کھلا اور فینشکا میٹیا کو گود میں لیے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ اس نے بچہ کو ایک سرخ فراک پہنا رکھا تھا جس کے کالر کے گرد کاڑھنے کا کام ہو رہا تھا۔ اس نے اس کا منہ ہاتھ دھلا کر بالوں میں کنگھی کی تھی۔ بچہ زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ اس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی اور اس کے ننھے ننھے ہاتھ ہوا میں لہرا رہے تھے۔ عموماً ہر صحت مند بچے کی کیفیت یہی ہوتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کی خوبصورتی میں بھڑکدار فراک نے بھی اضافہ کیا تھا۔ اس کے ننھے منے گیند سے جسم کے روئیں روئیں میں سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ فینشکا لگے ہاتھوں اپنے بال بھی سنوار آئی تھی۔ اپنے رومال کو بھی اس نے درست کر لیا تھا مگر وہ یہ تکلف نہ بھی کرتی تو کیا فرق پڑتا۔ چاند سے چہرے والی نوجوان ماں اور اس کی گود میں ہنستا کھیلتا تندرست بچہ، بھلا دنیا میں اس سے زیادہ دلکش نظارہ اور کونسا ہو سکتا ہے۔

پافل پیئر وچ پیار کے لہجہ میں کہنے لگا۔ "بڑا گول مول مٹکنا سا بچہ ہے۔" اور اس نے اپنی انگشت شہادت کی پور سے میٹیا کی ٹھوڑی کو ٹہوکا۔ بچہ طوطے کو تکنے لگا اور پھر اس نے کلکاری ماری۔

"یہ تایا جان ہیں۔" فینشکا نے اپنا چہرہ اس کی طرف جھکا دیا تھا اور اسے آہستہ آہستہ تھپک رہی تھی اور دونیاشا نے آہستہ سے ایک سلگتی ہوئی اگربتی طاق میں رکھ دی۔

"کتنے مہینے کا ہو گیا یہ۔" پافل پیئر وچ پوچھنے لگا۔

"چھ مہینے کا ہے۔ اب گیارہویں کو سات مہینے کا ہو جائے گا۔"

"فیدوسیا نکولیونا۔ میں تو جانوں یہ اب آٹھ مہینے کا ہوگا۔" دونیاشا ہچکچائی تو سہی لیکن پھر بول ہی اٹھی۔

"نہیں۔ سات مہینے کا۔" بچہ پھر کلکاریاں مارنے لگا۔ وہ ماں کو گھور کے دیکھ رہا تھا اور ایکا ایکی اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی پانچوں انگلیوں سے منہ اور ناک کو دبوچ لیا۔ فینشکا

نے اتنا تو ضرور کہا کہ ''بڑا شریر ہے۔'' لیکن اپنے چہرے کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔
پافل پیئر وچ کہنے لگا۔ ''بالکل نکولائی پہ پڑا ہے۔''
''اور کس پہ پڑتا؟'' فینشکا سوچنے لگی۔
''واقعی۔'' پافل پیئر وچ گویا اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ ''عین مین وہی ہے۔''
وہ فینشکا کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہوں میں حزن کی ایک کیفیت بھی پیدا ہو چلی تھی۔

''یہ تایا جان ہیں۔'' اس مرتبہ اس کی آواز نے سرگوشی کا انداز اختیار کر لیا تھا۔
یکا یک پیچھے سے ایک آواز آئی۔ ''اچھا پافل۔ آپ یہاں ہیں۔''
پافل پیئر وچ نے جلدی سے مڑ کر دیکھا۔ اس کی پیشانی پہ بل پڑ گئے' لیکن بھائی نے کچھ اتنا خوش ہو کر کہا اور اس احسان مندی سے اسے دیکھا کہ اسے مسکرانا پڑ ہی گیا۔
''یہ تمہارا بچہ بڑا پیارا ہے۔'' اور اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے وہ کہنے لگا۔ ''میں چائے کے کہنے کے لیے ذرا یہاں آیا تھا۔''
اور پھر اس نے بے اعتنائی کا سا انداز اختیار کر لیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔
''وہ خود آئے تھے؟'' نکولائی پیئر وچ نے فینشکا سے پوچھا۔
''جی۔ انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ پھر اندر آئے۔''
''اچھا۔ اور ارکیشا بھی پھر تمہارے پاس آیا؟''
''جی نہیں۔ میں چھوٹے والے مکان میں چلی جاؤں تو کیا حرج ہے؟''
''آخر کیوں؟''
''میں سوچتی ہوں کہ مناسب یہی ہے۔''
''ن.....نہیں۔'' نکولائی پیئر وچ نے رکتے رکتے کہا اور اس کا ہاتھ پیشانی پہ پہنچ گیا۔ ''یہ تو ہمیں پہلے کرنا چاہیے تھا.....اب اے بھوندو! تو کیا کر رہا ہے؟'' اس کا چہرہ یکا یک چمک اٹھا اور اس نے بڑھ کر بچے کے گالوں کو چوم لیا۔ پھر وہ اور جھکا اور اس کے ہونٹ فینشکا کے ہاتھ پہ پیوست ہو گئے۔ اس کا دودھ جیسا سفید ہاتھ میتیا کے چھوٹے سے سرخ فراک پر ٹکا ہوا تھا۔

''ہٹیئے بھی۔ کیا کر رہے ہیں آپ۔'' اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا اور اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ پھر آہستہ سے اس نے نگاہیں اٹھائیں اور یوں دیکھا گویا وہ پلکوں کے پیچھے سے جھانک رہی ہے اور اس انداز نے اس کی آنکھوں کی کیفیت میں ایک عجب دلکشی پیدا کر دی۔ وہ بڑی معصومیت سے اور اک ذرا سادہ لوحی سے مسکرا پڑی۔

نکولائی پیئر وچ کی فینشکا سے کیسے ٹنک بھڑی یہ بھی ذرا سن لیجیے۔ تین سال اُدھر کی بات ہے کہ اسے ایک رات ضلع کے ایک دور دراز شہر کی ایک سرائے میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ جو کمرہ اسے دیا گیا اس کی صفائی اور بستر کی چادر کے ستھرے پن سے وہ بہت متاثر ہوا۔ اسے یہ خیال گزرا کہ اس سرائے والی ضرور کوئی جرمن عورت ہوگی، لیکن تھی وہ ایک روسی عورت۔ پچاس کے پیٹے میں ہوگی۔ صاف ستھرا لباس، اچھی بھلی صورت۔ گفتگو میں سلیقہ۔ ہر بات میں قرینہ۔ چائے پر اس سے باتیں ہوئیں۔ بس وہ تو اس کا گرویدہ ہو گیا۔ نکولائی پیئر وچ ان دنوں اپنے نئے مکان میں منتقل ہوا تھا۔ چونکہ وہ گھر پہ زرخرید کاشتکاروں کو رکھنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے وہ تنخواہ دار ملازموں کی تلاش میں تھا۔ اُدھر سرائے والی کو بھی زمانے کی ناسازگاری اور سرد بازاری کی شکایت تھی۔ اس نے اس سے کہا کہ ہمارے گھر منتظمہ کی حیثیت سے آ جاؤ۔ وہ رضامند ہو گئی۔ شوہر مدت ہوئی گزر چکا تھا۔ اس کی نشانی ایک اکلوتی لڑکی فینشکا تھی۔ پندرواڑے کے اندر اندر ارینا لیوشنا (یہ نئی منتظمہ کا نام تھا) اپنی بیٹی سمیت میر ینو آ گئی اور چھوٹے گھر میں رہنے لگی۔ نکولائی پیئر وچ کی نظر انتخاب درست پڑی تھی۔ ارینا نے بڑے سلیقہ سے گھر کا انتظام کیا۔ رہی فینشکا سو اس کا اس وقت سترہ کا سن تھا۔ اس کا ذکر فکر کون کرتا۔ اس کو تو کسی نے دیکھا بھی شاید ہی ہو۔ سب سے الگ تھلگ چپ چاپ ایک کونے میں زندگی کے دن گزار رہی تھی۔ نکولائی پیئر وچ کو بس اتوار کے اتوار گرجا گھر کے کسی کونے میں اس کے صبیح و ملیح چہرے کی جھلک دکھائی دے جاتی تھی۔ یوں ایک سال سے زیادہ گزر گیا۔

ایک دن صبح ہی صبح کیا ہوا کہ ارینا اس کے کمرے میں آئی۔ حسب دستور اس نے جھک کر سلام کیا اور کہنے لگی کہ میری بیٹی کی آنکھ میں انگیٹھی سے ایک چنگاری اچٹ کر جا پڑی ہے۔ اس کا کچھ ہو سکے تو کیجیے۔ گھر پر بیکار پڑے رہنے والے لوگوں کے دستور کے

مطابق نکولائی پیئر وچ نے بھی ڈاکٹری پڑھ رکھی تھی بلکہ ہومیوپیتھی پر ایک معلوماتی کتاب بھی مرتب کی تھی۔ وہ فوراً بولا کہ اسے یہاں لے آؤ۔ فینشکا نے جو یہ سنا کہ گھر کے مالک نے اسے بلایا ہے تو اس کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا مگر خیر وہ ماں کے ساتھ وہاں چلی گئی۔ نکولائی پیئر وچ اسے کھڑکی کے پاس لے گیا اور اس کا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس کی سرخ سوجی ہوئی آنکھ کا اس نے اچھی طرح معائنہ کر کے ایک لیپ تجویز کیا۔ یہ لیپ اس نے خود جھٹ پٹ تیار کیا اور اپنا رومال چیر پھاڑ کے اسے لیپ لگانے کی ترکیب بتائی۔ فینشکا جب سب کچھ سن چکی تو وہاں سے چلنے لگی۔ ارینا نے اسے ٹوکا ''لڑکی دیوانی کیوں ہورئی اے۔ مالک کا ہاتھ تو چوم لے۔''

نکولائی پیئر وچ ایسا ہڑ بڑایا کہ اپنا ہاتھ تو اس کی طرف بڑھایا نہیں بلکہ خود اس کے جھکے ہوئے سر کی مانگ کو چوم لیا۔ فینشکا تو تھوڑے دنوں میں اچھی ہوگئی، لیکن نکولائی پیئر وچ کے دل پر جو اس نے نقش چھوڑا تھا، وہ اتنی جلدی کہاں مٹنے والا تھا۔ وہ نرم و نازک شرمیلی صورت اس کی آنکھوں میں پھرتی تھی۔ وہ ملائم بال اسے اپنی ہتھیلیوں سے مس ہوتے ہوئے محسوس ہوتے تھے اور وہ پیارے پیارے ادھ کھلے ہونٹ جن کے درمیان موتی جیسے دانت یوں چمک رہے تھے جیسے دھوپ میں روس کی بارش کے شاداب قطرے جھلمل جھلمل کرتے ہیں، بار بار اس کی نظروں کے آگے آجاتے تھے۔ اس نے گرجا گھر میں اسے بڑی توجہ سے دیکھنا شروع کر دیا اور اس سے باتیں کرنے کی کوشش بھی کی۔ پہلے تو اس سے وہ شرمائی شرمائی رہی اور ایک دن تو یہ ہوا کہ شام کے وقت کھیت کی ایک پتلی سی پگڈنڈی پر اسے آتا دیکھ کر وہ بھاگ کر کھیت میں گھس گئی۔ مطلب یہ تھا کہ اس سے مڈھ بھیڑ نہ ہو، لیکن اناج کے سنہری خوشوں کے درمیان اس نے اس کے سر کی جھلک دیکھ پائی۔ وہ دراصل ننھے جانوروں کی طرح پھدک پھدک کر اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پیار بھرے لہجہ میں اسے آواز دی۔

''اجی آداب عرض ہے۔ میں کٹ کھنا نہیں ہوں۔''

''آداب۔'' اس نے دبی ہوئی آواز میں جواب تو دے دیا، لیکن جھاڑیوں سے باہر نہیں نکلی۔

رفتہ رفتہ وہ اس سے مانوس ہونے لگی، لیکن اس کی موجودگی میں اب بھی وہ شرمائی شرمائی رہتی تھی۔ پھر کیا ہوا کہ اس کی ماں ایرینا یکا یک ہیضے میں دنیا سے چل بسی۔ فینشکا اب کس کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھتی۔ تمیز، سلیقہ اور سگھڑاپا اسے ماں سے ورثے میں ملا تھا، لیکن ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔ جوانی اور پھر تنہائی۔ اُدھر نکولائی پیئر وچ بھی بڑا نیک طینت بڑا شریف طبیعت تھا۔ اب باقی بات بیان کرنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے......

''تو بھائی صاحب تم سے ملنے آئے تھے؟'' نکولائی پیئر وچ اس سے پوچھ رہا تھا۔ ''انہوں نے آواز دی اور اندر چلے آئے۔''

''جی۔''

''چلو یہ اچھا ہے۔ اچھا اب میں ذرا میٹیا کو جھولا جھلا دوں۔''

اور نکولائی پیئر وچ نے اسے اتنا اونچا اچھالنا شروع کر دیا کہ وہ چھت کے قریب تک پہنچ جاتا تھا۔ وہ خود تو بے تحاشا کھلکھلا کر ہنس رہا تھا، لیکن ماں کی بے کلی کا عالم کچھ نہ پوچھئے۔ ہر مرتبہ جب وہ اچھلتا تھا تو وہ اس کے ننھے ننھے ننگے پیروں کی طرف اپنی بانہیں پھیلا دیتی تھی۔

پاول پیئر وچ اپنے سجے بنے مطالعہ کے کمرے میں چلا گیا۔ دیواروں پر ہلکے نیلے رنگ کے پردے تنے ہوئے تھے۔ ایک دیوار پر رنگ برنگا ایرانی قالین لٹک رہا تھا، جس پہ ہتھیار آویزاں تھے۔ فرنیچر اخروٹ کی لکڑی کا تھا جس کے گدوں میں گہرے سبز رنگ کی مخمل استعمال کی گئی تھی۔ کتابوں کی الماری شاہ بلوط کی سیاہ لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ لکھنے کی میز بڑی پُرتکلف تھی۔ اس پہ تانبے کے مجسمے چنے رکھے تھے۔ وہ صوفے پہ دراز ہو گیا اور سر کے پیچھے لے جا کر اپنے ہاتھ باندھ لیے۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں چھت کو تک رہی تھیں اور ان میں حسرت و یاس کی ایک کیفیت جھلک رہی تھی۔ یہ کیفیت جو اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ اسے وہ یا تو خود ان دیواروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا یا پھر ممکن ہے کہ کوئی اور وجہ ہو کہ اس نے اٹھ کر کھڑکیوں کے بھاری پردے کھول دیئے اور پھر صوفے پہ دراز ہو گیا۔

(9)

اسی روز بازاروف کی بھی فینشکا سے مڈھ بھیڑ ہوگئی۔ وہ ارکادی کے ساتھ باغ میں ٹہل رہا تھا اور اسے سمجھا رہا تھا کہ بعض درختوں بالخصوص شاہ بلوط کے درختوں کی نشوونما میں کیوں خلل پڑ گیا ہے۔

''زیادہ مناسب یہ تھا کہ تم بید مجنوں، صنوبر اور نیبو کے درخت لگاتے اور انہیں کھاد دیتے۔ اس کنج پہ تو خوب بہار آرہی ہے۔ وہ اکیشیا اور صنوبر کے درخت ہیں نا۔ یہ غریب بہت سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ ان کی خیر خبر لیجیے نہ لیجیے، لیکن وہاں تو شاید کوئی ہے۔''

کنج میں فینشکا بیٹھی تھی۔ ساتھ میں دونیاشا میتیا کو لیے بیٹھی تھی۔ بازاروف کھڑا کا کھڑا رہ گیا، لیکن ارکادی نے فینشکا کو یوں سلام کیا، گویا ان میں پرانی جان پہچان ہے۔

وہ وہاں سے ذرا آگے بڑھے تھے کہ بازاروف نے سوال کر ڈالا ''کون ہے جی یہ۔ لڑکی تو اچھی ہے۔''

''کس کی بات کر رہے ہو؟''

''تم خود جانتے ہو کس کی بات کر رہا ہوں۔ ان میں ایک ہی تو خوبصورت ہے۔''

ارکادی نے اک ذرا بے چینی سی ضرور محسوس کی۔ پھر بھی اس نے فینشکا کا پورا قصہ اسے کہہ سنایا۔

''خوب۔'' بازاروف نے اپنی رائے کا اظہار شروع کیا۔ ''تمہارے ابا جان کا مذاق تو اچھا ہے۔ بھئی مجھے تمہارے ابا جان بہت پسند ہیں۔ بڑے ہنس مکھ ہیں۔ خیر ہم ان سے جان پہچان تو کر لیں۔'' اور یہ کہہ کے وہ کنج کی طرف چلا۔

''یف گینی۔'' ارکادی بدحواس ہو کر چلا۔ ''بھئی یہ تم کیا کرتے ہو۔ رحم کرو نا۔''

بازاروف نے جواب دیا۔ ''مرے کیوں جاتے ہو۔ میں کوئی احمق ہوں۔ میں سب جانتا ہوں۔''

فینشکا کے قریب پہنچ کر اس نے ٹوپی اتاری اور بڑے ادب سے جھک کر بولا۔

''اجازت ہو تو اپنا تعارف کراؤں۔ میں بڑا بے ضرر سا آدمی ہوں اور ارکادی نکولائی وچ کا دوست ہوں۔''

فینشکا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بغیر بولے بات کیے اسے دیکھنے لگی۔

بازاروف پھر بولا۔ ''بڑا اچھا بچہ ہے۔ آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ میری تعریفوں سے اب تک تو کسی پہ آفت آئی نہیں ہے۔ اس کے گال اتنے کیوں پھولے ہوئے ہیں۔ کیا اس کے دانت نکل رہے ہیں؟''

''جی۔'' فینشکا بولی۔ ''اس کے چار دانت تو نکل آئے ہیں اور اب پھر مسوڑھے پھول رہے ہیں۔''

''اچھا مجھے دکھائیے۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ڈاکٹر ہوں۔''

بازاروف نے بچے کو اپنی گود میں لے لیا۔ فینشکا اور دونیاشا دونوں کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ اس نے نہ تو شور مچایا اور نہ خوف زدہ ہوا۔

''خوب۔ خوب.... کوئی بات نہیں ہے۔ معاملہ ٹھیک چل رہا ہے۔ اس کے دانت بڑے اچھے ہوں گے۔ اگر کچھ گڑ بڑ ہو جائے تو مجھے بتا دینا۔ اور آپ تو بالکل اچھی ہیں؟''

''بالکل۔ خدا کا شکر ہے۔''

''ہاں خدا کا شکر ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے اور تم؟'' وہ اب دونیاشا کی طرف متوجہ ہوا۔

دونیاشا بھی خوب لڑکی تھی۔ مالک کے گھر میں کیسی دبی دبی رہتی تھی، لیکن وہاں سے نکلتے ہی اس کے تو پر لگ جاتے تھے۔ بازاروف کے جواب میں وہ بس کھی کھی کر کے رہ گئی۔

''اچھا تو سب ٹھیک ہیں۔ لیجیے اپنے بچے باشا کو۔''

فینشکا نے بچہ کو گود میں لے لیا اور دھیرے سے بولی۔ ''آپ کی گود میں کیسا خوش تھا؟''

''بچے میری گود میں ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ انہیں خوش رکھنے کا مجھے گر آتا ہے۔''

دونیاشا بولی۔ ''اجی بچے بھی تو جانتے ہیں کہ کون ان سے پیار کرے ہے۔''

فینشکا نے کہا ''اور کیا۔ یہ تو ہے ہی۔ اب میٹیا کو ہی دیکھ لو۔ بعضوں کی گود میں تو وہ کبھی بھی نہ جائے۔ مار ڈالو تو بھی نہ جائے۔''

''وہ میرے پاس آ جائے گا؟'' ارکادی تھوڑی دیر تک تو دور کھڑا رہا تھا' لیکن اب وہ قریب کھسک آیا تھا۔

اس نے میتیا کو بہت بہلایا پھسلایا کہ وہ اس کی گود میں آ جائے' لیکن میتیا نے اپنا سر پیچھے کی طرف جھٹکا اور وہ فیل مچائے کہ بیچاری فینشکا بھی سٹپٹا گئی۔

''خیر جب وہ مجھ سے ہل جائے گا تو میرے پاس آیا کرے گا۔'' ارکادی نے بڑے اطمینان سے کہا اور دونوں دوست وہاں سے ٹہل گئے۔

بازاروف پوچھنے لگا۔ ''ان کا نام کیا ہے؟''

''فینشکا فیدوسیا۔''

''اور اس کے والد کا نام؟ اس کا جاننا بھی تو ضروری ہے۔''

''نکولا فنا۔''

''مجھے اس کی یہ بات بہت پسند آئی کہ اسے ایسی زیادہ گھبراہٹ نہیں ہوئی۔ ممکن ہے بعض لوگ اس کی اس روش پہ انگلی اٹھائیں مگر ہے یہ بیہودگی۔ بھلا اس میں گھبرانے پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ وہ ماں ہے۔ اس کا طریقہ درست ہے۔''

ارکادی نے جواب دیا۔ ''اس کا طریقہ درست ہے.... لیکن ہمارے والد صاحب۔''

''ان کا طریقہ بھی درست ہی ہے۔''

''نہیں۔ میں تو یہ نہیں سمجھتا۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ ایک زائد وارث کی بات تمہیں نہیں بھائی؟''

ارکادی نے تنک کر جواب دیا۔ ''ایسے خیالات مجھ سے منسوب کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ اپنے حساب سے تو میں اپنے والد کو غلطی پر نہیں سمجھتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہیں اس سے شادی کرنی چاہیے تھی۔''

''ہوہو۔ ہاہا۔'' بازاروف بے ساختہ ہنس پڑا۔ ''ہم بھی بڑے عالی حوصلہ لوگ ہیں۔ تم اب تک شادی کو اہمیت دیتے ہو۔ کم از کم تم سے تو اس کی امید نہیں تھی۔''

دونوں دوست چند قدم خاموشی سے چلتے رہے۔

بازاروف نے گفتگو کا سلسلہ پھر چھیڑ دیا۔ ''میں نے تمہارے والد کا سارا کاروبار

دیکھ ڈالا۔ مویشی بڑی ادنیٰ قسم کے ہیں۔ گھوڑوں کا حال پتلا ہے۔ عمارات کی حالت بھی کچھ ایسی بہتر نہیں ہے اور مزدور کیا ہیں، سب لُچے لفنگے ہیں۔ رہے سپرنٹنڈنٹ صاحب سو وہ یا تو بڑے اونچے ہیں یا پھر بہت گہرے ہیں۔ میں ابھی یہ طے نہیں کر سکا ہوں کہ وہ کس خانے میں آتے ہیں۔"

"یف گینی وسل یوچ۔ آج تم ہر معاملہ میں زیادتی پہ اترے ہوئے ہو۔"

"اور یہ سیدھے سادے بھولے بھالے کسان تمہارے والد کو ٹھگ رہے ہیں۔ تم نے وہ روسی مثل تو سنی ہے نا کہ روسی کسان اللہ میاں کو بھی چوٹ دے جاتا ہے۔"

ارکادی نے کہا "اب مجھے تایا جان کی بات کا اعتبار آتا جا رہا ہے۔ تم واقعی روسیوں کو ذلیل سمجھتے ہو۔"

"گویا یہ بھی کوئی بڑی اہم بات ہے۔ روسی میں لے دے کے ایک ہی اچھی بات ہے۔ وہ یہ کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل ترین مخلوق سمجھتا ہے۔ معاملہ کی بات تو یہ ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ باقی سب لغویت ہے۔"

"فطرت بھی لغویت ہے؟" ارکادی بولا۔ اس کی نگاہیں دور اُن کھیتوں پہ منڈلا رہی تھیں جنہیں حسین خوشگوار دھوپ نے جگمگا دیا تھا۔ سورج ابھی بلندی پر نہیں پہنچا تھا۔

"فطرت کے متعلق جو تم نے محل کھڑا رکھا ہے وہ بھی لغویت ہے۔ فطرت دَیر نہیں حرم نہیں۔ وہ محض ایک کارخانہ ہے اور انسان اس کارخانے کا مزدور ہے۔"

اتنے میں گھر سے سارنگی کا نغمہ بلند ہوا۔ کسی نے سارنگی کے تاروں پہ "شوہر کی امید" کا نغمہ چھیڑ رکھا تھا۔ اس میں استادی نہ سہی، جذبے کی شدت ضرور کارفرما تھی اور راگ بلند ہو ہو کر شہد کی سی شیرینی کی طرح ہوا میں پھیل رہا تھا، آمیز ہو رہا تھا۔

"یہ کون ہے؟" بازاروف نے چونک کر پوچھا۔

"میرے والد ہیں۔"

"تمہارے والد سارنگی بجاتے ہیں؟"

"ہاں۔"

"اور ان کی عمر کیا ہو گی؟"

''چوالیس سال۔''

بازاروف پہ ایکا ایکی ہنسی کا دورہ پڑا۔

''تم ہنس کیوں رہے ہو؟''

''حد ہوگئی۔ بوڑھی گھوڑی لال لگام۔ عمرعزیز کے چوالیس سال پورے کر چکے۔ خاندان کے بزرگ ہیں۔ دنیا سے الگ تھلگ ایک گاؤں میں پڑے ہیں اور سارنگی کا شوق چرایا ہے۔''

بازاروف بے تحاشا ہنسے چلا گیا' لیکن چونکہ ارکادی باپ کا بڑا ادب کرتا تھا' اس لیے اس کے ہونٹوں پر تو اس مرتبہ مسکراہٹ بھی پیدا نہیں ہوئی۔

(10)

چودہ پندرہ دن گزر گئے۔ میر نیو میں زندگی اپنے اسی پرانے ڈھرّے پہ چلتی رہی۔ ارکادی پڑا پڑا اینڈتا رہتا تھا اور مزے اڑاتا تھا اور بازاروف کام پہ جٹا رہتا تھا۔ گھر کا ہر فرد اب اس کا، اس کی بے پروائیوں کا، اس کے منہ پھٹ اور بے تکے جوابوں کا عادی ہو گیا تھا۔ فینشکا تو اب اس سے اتنی ہل گئی تھی کہ ایک مرتبہ اس نے رات کو بلا بھیجا۔ میتیا کو ام الصبیان کے دورے پڑ رہے تھے۔ وہ وہاں جا پہنچا۔ اپنے دستور کے مطابق اس نے جماہیاں لیں۔ ہنسی مذاق کیا۔ اس کے پاس بیٹھے بیٹھے دو گھنٹے گزار دیئے اور بچے کا علاج کر دیا۔ اس کے برخلاف پافل پیئر وچ نے اپنے نفس کی پوری قوت سے اس سے نفرت کرنی شروع کر دی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ شخص نک چڑھا، منہ پھٹ، بدتمیز اور سنکی ہے۔ اسے یہ بھی شبہ تھا کہ بازاروف اس کی ذرا عزت نہیں کرتا بلکہ اسے حقارت سے دیکھتا ہے' اور بھی کسی کو نہیں ''اسے'' پافل کرسانوف کو۔ نکولائی پیئر وچ اس نوجوان ''انکار پسند'' سے پہلے ڈرا ڈرا رہتا تھا۔ اسے یہ فکر کھائے جاتی تھی کہ کیا ارکادی ہمیشہ اس کے چکر میں پھنسا رہے گا' لیکن وہ اس کی باتیں بڑے شوق سے سنتا تھا۔ اس کے کیمیاوی اور سائنسی تجربات میں بھی بڑی دلچسپی لیتا تھا۔ بازاروف اپنے ہمراہ ایک خردبین لایا تھا۔ گھنٹوں وہ اسی میں لگا رہتا تھا۔

نوکروں پہ اگر چہ وہ بڑی فقرہ بازیاں کرتا تھا، مگر پھر بھی وہ اس سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ وہ تو یہ سمجھنے لگے تھے کہ وہ مالک نہیں بلکہ انہیں میں سے ایک شخص ہے۔ دونیاشا کی کیفیت یہ تھی کہ جہاں اسے دیکھا اور اس کی ہنسی نکلی۔ وہ اس کے پاس سے خرگوش کی طرح کترا کر نکل جاتی تھی، لیکن چوری چوری معنی خیز نگاہوں سے بھی اسے ضرور دیکھ لیتی تھی۔ پیاتر نرا گدھا تھا۔ جب دیکھو اس کی بھنویں تنی ہوئی ہیں۔ اس کی بس یہی ایک خوبی تھی کہ وہ ذرا تمیزدار نظر آتا تھا، اپنے کوٹ پر برش بڑے اہتمام سے کرتا تھا اور ہجے کر کرا کے ایک آدھ صفحہ پڑھ لیا کرتا تھا، لیکن اس کا بھی یہ حال تھا کہ بازاروف اگر اسے نگاہ بھر کر دیکھ لیتا تھا تو اس کی باچھیں کھل جاتی تھیں اور کھیت کے لونڈے تو پلوں کی طرح ''ڈاکٹر'' کے پیچھے لگے رہتے تھے۔ بس ایک بوڑھا کھوسٹ پروکوفش ضرور ایسا تھا جسے وہ نہیں بھایا تھا۔ میز پہ جب وہ اس کے سامنے کھانا چنتا تھا تو اس کی پیشانی پہ بل پڑ جاتے تھے۔ اس نے اسے ''قصائی'' اور ''چھچھورے'' کے خطابات دے رکھے تھے۔ اس نے تو یہاں تک اعلان کر ڈالا تھا کہ اپنی بڑی بڑی مونچھوں سے یہ شخص ایسا لگتا ہے جیسے سنٹر اس میں کوئی سور کھڑا ہو۔ پروکوفش بھی اپنے طور پر پافل پیئر وچ کی ٹکر کا رئیس تھا۔

دن بھی اب وہ آ پہنچے تھے جنہیں سال بھر کا نچوڑ کہنا چاہیے یعنی شروع جون کے دن، موسم پہ وہ بہار آ رہی تھی کہ اس پہ سو سو بار قربان جائیے۔ یہ سچ ہے کہ یہاں سے چند قدم کے فاصلہ پہ ہیضے نے آفت بپا کر رکھی تھی اور ہر دم اس کے یہاں آ دھمکنے کا خطرہ تھا لیکن ہیضے کے تو اس علاقے والے عادی ہوئے۔ بازاروف روز صبح کے ہون میں اٹھتا اور دو تین میل کا چکر کاٹ آتا مگر اسے چہل قدمی نہیں کہنا چاہیے۔ بے مصرف چہل قدمی کا تو وہ سرے سے قائل ہی نہیں تھا۔ وہ تو کیڑے مکوڑوں اور بوٹیوں کے نمونے جمع کرنے جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ ارکادی کو اپنے ساتھ لے لیتا۔ واپسی میں بالعموم کوئی بحث چھڑ جایا کرتی جس میں عام طور پر ارکادی مار کھا جاتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ باتیں وہ زیادہ کرتا تھا۔

ایک دن انہیں واپسی میں دیر ہو گئی۔ نکولائی پیئر وچ انہیں دیکھنے باغ کی طرف نکل گیا اور جب وہ باغیچہ کے قریب پہنچا تو اسے دونوں لڑکوں کے تیز تیز قدموں کی آہٹ اور بات چیت کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ باغیچہ کے اس طرف تھے اور اسے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

ارکادی کہہ رہا تھا۔ ''تم میرے والد سے اچھی طرح واقف نہیں ہو۔''

''تمہارے والد بھلے آدمی ہیں، لیکن زمانے سے وہ بہت پیچھے ہیں۔ ان کا وقت تو اب گزر گیا۔''

نکولائی پیئر وچ کان لگا کر سن رہا تھا۔ ارکادی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ شخص جس کا وقت اب گزر گیا تھا، دو منٹ تک بت بنا کھڑا رہا اور پھر چپکے سے گھر کی طرف کھسک گیا۔

''پرسوں میں نے انہیں پشکن پڑھتے دیکھا۔'' بازاروف نے گفتگو کا سلسلہ منقطع نہیں کیا تھا۔ ''اب مجھے بتاؤ کہ دنیوی اعتبار سے اس کا کیا فائدہ ہے۔ تم جانو کہ وہ بچے تو ہیں نہیں۔ وقت کا تقاضا ہے کہ اس کوڑے کو الگ پھینکیں۔ آج کی دنیا میں رومان پرست ہونے کی بھلا کیا تک ہے۔ انہیں کوئی ڈھنگ کی چیز پڑھنے کو دو نا۔''

''کیا انہیں پڑھنے کو دوں؟''

''میرا خیال یہ ہے کہ پہلے انہیں بوشنیر کی کتاب پڑھواؤ۔''

ارکادی نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ''میرا بھی یہی خیال ہے۔ وہ کتاب عام بول چال کی زبان میں لکھی گئی ہے۔''

اسی دن کھانا کھانے کے بعد نکولائی پیئر وچ اپنے پڑھنے لکھنے کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اپنے بھائی سے وہ کہنے لگا۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اور تم دونوں وقت سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ ہمارا زمانہ گزر گیا۔ درست ہے۔ شاید بازاروف ٹھیک ہی کہتا ہے۔ ایک یہ بات تو میں بھی قبول کرتا ہوں اور یہ بات پھانس کی طرح میرے دل میں چبھتی رہتی ہے۔ میں یہ خواب دیکھ رہا تھا اور بالخصوص آج کل کہ میں ارکادی کے ساتھ گھل مل کر رہوں گا، لیکن پتہ یہ چلا کہ میں تو پیچھے رہ گیا اور وہ آگے بڑھ گیا ہے اور ہم ایک دوسرے کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔''

''وہ کیسے آگے بڑھ گیا ہے؟ اور آخر کس بات میں وہ ہم پہ برتری رکھتا ہے؟''

پافل پیئر وچ کے لہجہ میں بے کلی جھلک رہی تھی۔ ''وہ بزرگ ہستی انکار پسند صاحب کا یہ سب کیا دھرا ہے۔ اس کے دماغ میں اس قسم کے خیالات اس شخص نے ٹھونسے ہیں۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ ڈاکٹر بنا پھرتا ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ وہ محض عطائی ہے۔ یوں وہ مینڈک بازی بہت کرتا ہے، مگر مجھے یقین ہے کہ وہ طب خاک نہیں جانتا۔''

''نہیں بھائی صاب آپ یہ نہ کہیں۔ بازاروف آدمی عقلمند ہے اور اپنے فن سے واقف ہے۔''

پافل پیئر وچ نے پھر اپنی ہانکی۔ ''اور اس کا ٹھسّا خدا کی پناہ۔ آدمی کو خواہ مخواہ تاؤ آتا ہے۔''

''ہاں۔'' نکولائی پیئر وچ نے کہا۔ ''اس میں ٹھسّا تو ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پر وہ مجبور ہے۔ شاید یہی وہ چیز ہے جسے میں نظر انداز کر گیا۔ میں سمجھتا تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ چلنے کے میں سارے جتن کر رہا ہوں۔ میں نے فارم قائم کی۔ کسانوں سے میں نے وہ سلوک کیا کہ صوبے بھر میں لوگ مجھے ''انتہا پسند اشتراکی'' کہنے لگے ہیں۔ میں پڑھتا ہوں، مطالعہ کرتا ہوں۔ ہر طرح سے کوشش کرتا ہوں کہ وقت کے تقاضوں سے آشنا رہوں اور وہ کہتے ہیں کہ میرا وقت گزر گیا۔ اور بھائی صاب میں سوچنے لگا ہوں کہ میرا وقت واقعی گزر گیا ہے۔''

''آخر کیوں؟''

''میں بتاتا ہوں کیوں۔ صبح میں بیٹھا ہوا پشکن کی نظمیں پڑھ رہا تھا...... مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس وقت میں اس کی نظم ''خانہ بدوش'' پڑھ رہا تھا۔ اتنے میں ارکادی میرے پاس آیا۔ اس نے مجھ سے ایک لفظ نہیں کہا۔ ہاں اس کے چہرے پہ شفقت و محبت کے آثار تھے۔ اس نے بڑے پیار سے گویا میں بھی کوئی بچہ ہوں' میرے ہاتھ سے کتاب لے لی اور دوسری کتاب میرے سامنے ڈال دی۔ ایک جرمن کتاب..... پھر وہ مسکرانے لگا اور پشکن کی کتاب اپنے ساتھ لے کر چلا گیا۔''

''کیا بات ہے۔ کون سی کتاب اس نے تمہیں دی تھی؟''

''یہ رہی وہ کتاب۔''

اور نکولائی پیئر وچ نے اپنے کوٹ کی جیب سے بوشیز کے مشہور و معروف مقالے کی نویں جلد نکال کر دکھائی۔

پافل پیئر وچ اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ ''ہوں۔'' وہ بڑبڑانے لگا۔ ''ارکادی نکولائی وچ نے تمہاری تعلیم و تربیت اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ اچھا تم نے اسے پڑھ کر دیکھا؟''

''جی ہاں میں نے اسے پڑھ کر دیکھ لیا ہے۔''

''تو پھر کیا خیال ہے اس کے بارے میں؟''

''یا تو میں احمق ہوں یا پھر یہ سب بکواس ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں ہی احمق ہوں۔''

''ابھی تم جرمن زبان بھولے نہیں ہو؟'' پافل پیئر وچ نے پوچھا۔

''میں جرمن سمجھ لیتا ہوں۔''

پافل پیئر وچ نے پھر کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور کنکھیوں سے بھائی پہ نظر ڈالی۔ دونوں چپ تھے۔

''ہاں خوب یاد آیا۔'' نکولائی پیئر وچ اب موضوع بدلنا چاہتا تھا۔ ''کولیازن کا خط آیا ہے۔''

''ماتف اِلیچ؟''

''جی ہاں۔ وہ صوبے کے دورے پر آیا ہوا ہے۔ اب تو وہ ماشاءاللہ بڑا آدمی ہو گیا ہے۔ اس نے ہم سے اپنی رشتہ داری کا حوالہ دیا ہے اور لکھا ہے کہ آپ لوگوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے، آپ کو اور ارکادی کو اس نے شہر آنے کی دعوت دی ہے۔''

پافل پیئر وچ نے پوچھا۔ ''تم جا رہے ہو؟''

''نہیں تو۔ اور آپ؟''

''نہیں۔ میں بھی نہیں جاؤں گا۔ میرے سر میں کوئی پھوڑا نکلا ہے کہ خواہ مخواہ چالیس میل گھسٹتا ہوا جاؤں۔ اس کا کیا ہے۔ وہ تو ذرا اپنی شان دکھانا چاہتا ہے۔ سارے صوبے والے اس کے لیے آنکھیں بچھائیں گے۔ ہمارے جانے نہ جانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہاں پریوی کونسلر ہوتا تو ہے بڑی چیز۔ اگر میں ملازمت میں جتا رہتا اور اس دفتری گھس گھس سے پیچھا نہ چھڑاتا تو آج میں ایڈ جوٹنٹ جنرل ہوتا اور پھر تم جانو کہ ہم تم تو زمانے سے پیچھے ہیں۔''

نکولائی پیئر وچ نے ٹھنڈا سا سانس بھرا اور کہنے لگا۔ ''ہاں بھائی صاب۔ اب تو شاید وہ وقت ہے کہ ہم کفن کے لیے آدمی دوڑائیں اور سینے پہ ہاتھ رکھ لیں۔''

پافل بڑبڑانے لگا۔ ''مگر میں اتنی جلدی کہاں ہار ماننے والا ہوں۔ میرا دل کہہ رہا

ہے کہ ایک نہ ایک دن میری اور اس ڈاکٹر کی ٹکر ہونی ہے۔"

ٹکر اسی روز شام کو ہو گئی۔ پافل پیئر وچ ڈرائنگ روم میں بھرا ہوا آیا۔ وہ کچھ چڑچڑا ہو رہا تھا اور لڑنے پہ گویا ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ وہ تو بس دشمن پہ ٹوٹ پڑنے کا بہانہ ٹٹول رہا تھا، لیکن بہت دیر تک کوئی بہانہ ہی ہاتھ نہ آیا۔

بازاروف یوں بھی "بڈھے کرسانوفوں" (ان بھائیوں کو اس نے یہی خطاب دے رکھا تھا) کے سامنے بات چیت کم کرتا تھا اور اس روز تو اس کا مزاج ہی کچھ مکدر تھا۔ گفتگو کے نام تو اس نے ایک لفظ نہیں کہا، بس بھر بھر پیالی چائے پیے جا رہا تھا مگر پافل پیئر وچ بھی آج خار کھائے بیٹھا تھا۔ آخر اس کی خواہش پوری ہو ہی گئی۔

ایک پڑوسی زمیندار کا ذکر چھڑ گیا۔ بازاروف نے بڑی بے اعتنائی سے کہا۔ "ذلیل شیخی خور رئیس۔" وہ اس سے پیٹرسبرگ میں مل چکا تھا۔

"گستاخی معاف۔ کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ...." پافل پیئر وچ کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ "کیا آپ کے عقائد کے پیش نظر "ذلیل اور رئیس" کے معنی ایک ہی ہیں؟"

بازاروف نے بڑے اطمینان سے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا "میں نے شیخی خور رئیس کہا ہے۔"

"درست ہے لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کی جو رائے شیخی خورے رئیس کے بارے میں ہے، وہی اور رئیسوں کے بارے میں بھی ہے۔ میں آپ کو یہ اطلاع دے دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ مجھے آپ کی رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ ہر شخص جانتا ہے کہ میں آزاد خیال واقع ہوا ہوں اور ترقی کا قائل ہوں، لیکن اسی وجہ سے میں رئیسوں کی ان کی جو صحیح معنوں میں رئیس ہوں، عزت کرتا ہوں۔ جناب والا! آپ یہ بات ذہن نشین کر لیں۔" (ان الفاظ پر بازاروف نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھا کر پافل پیئر وچ کو دیکھا) اس نے پھر بڑے تلخ انداز میں کہا۔ "جی جناب والا! آپ یہ بات ذہن نشین کر لیں۔ انگریزوں کا رئیس طبقہ۔ اپنے حقوق وہ ذرہ برابر ترک نہیں کرتے اور اس لیے وہ دوسروں کے حقوق کا بھی احترام کرتے ہیں۔ وہ دوسروں سے فرائض کی ادائیگی کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس وجہ سے خود بھی اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ رئیس طبقہ نے انگلستان

ہے کہ ایک نہ ایک دن میری اور اس ڈاکٹر کی ٹکر ہونی ہے۔''

ٹکر اسی روز شام کو ہوگئی۔ پافل پیئر وچ ڈرائنگ روم میں بھرا ہوا آیا۔ وہ کچھ چڑچڑا ہو رہا تھا اور لڑنے پہ گویا ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ وہ تو بس دشمن پہ ٹوٹ پڑنے کا بہانہ ٹٹول رہا تھا' لیکن بہت دیر تک کوئی بہانہ ہی ہاتھ نہ آیا۔

بازاروف یوں بھی ''بڈھے کرسانوفوں'' (ان بھائیوں کو اس نے یہی خطاب دے رکھا تھا) کے سامنے بات چیت کم کرتا تھا اور اس روز تو اس کا مزاج ہی کچھ مکدر تھا۔ گفتگو کے نام تو اس نے ایک لفظ نہیں کہا، بس بھر بھر پیالی چائے پئے جا رہا تھا مگر پافل پیئر وچ بھی آج خار کھائے بیٹھا تھا۔ آخر اس کی خواہش پوری ہو ہی گئی۔

ایک پڑوسی زمیندار کا ذکر چھڑ گیا۔ بازاروف نے بڑی بے اعتنائی سے کہا۔ ''ذلیل شیخی خور رئیس۔'' وہ اس سے پیٹرسبرگ میں مل چکا تھا۔

''گستاخی معاف۔ کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ....'' پافل پیئر وچ کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ ''کیا آپ کے عقائد کے پیش نظر ''ذلیل اور رئیس'' کے معنی ایک ہی ہیں؟''

بازاروف نے بڑے اطمینان سے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا ''میں نے شیخی خور رئیس کہا ہے۔''

''درست ہے لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کی جو رائے شیخی خورے رئیس کے بارے میں ہے' وہی اور رئیسوں کے بارے میں بھی ہے۔ میں آپ کو یہ اطلاع دے دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ مجھے آپ کی رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ ہر شخص جانتا ہے کہ میں آزاد خیال واقع ہوا ہوں اور ترقی کا قائل ہوں' لیکن اسی وجہ سے میں رئیسوں کی ان کی جو صحیح معنوں میں رئیس ہوں، عزت کرتا ہوں۔ جناب والا! آپ یہ بات ذہن نشین کر لیں۔'' (ان الفاظ پر بازاروف نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھا کر پافل پیئر وچ کو دیکھا) اس نے پھر بڑے تلخ انداز میں کہا۔ ''جی جناب والا! آپ یہ بات ذہن نشین کر لیں۔ انگریزوں کا رئیس طبقہ۔ اپنے حقوق وہ ذرہ برابر ترک نہیں کرتے اور اس لیے وہ دوسروں کے حقوق کا بھی احترام کرتے ہیں۔ وہ دوسروں سے فرائض کی ادائیگی کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس وجہ سے خود بھی اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ رئیس طبقہ نے انگلستان

کو آزادی بخشی ہے اور اس آزادی کو اس نے قائم رکھا ہے۔''

بازاروف نے جواب دیا۔ ''یہ افسانہ ہم بار بار سن چکے ہیں۔ آخر آپ اس سے ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟''

''میں اس سے جناب والا! یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' (پافل پیئر وچ کو جب غصہ آتا تھا تو وہ جان بوجھ کر الفاظ کو اس انداز میں ادا کرتا تھا۔ اگرچہ وہ یہ خوب جانتا تھا کہ یہ صورتیں قواعدی معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ اس لت کو الگزنڈر کے زمانے میں اجداد کی یادگار سمجھنا چاہیے۔ اس زمانے کی برگزیدہ ہستیاں کبھی کبھار جب اپنی خاص زبان بولنے پہ آتی تھیں تو اس قسم کی سہل پسندانہ شکلوں کا استعمال کرتی تھیں۔ اپنے رویے سے وہ یہ جتاتی نظر آتی تھیں ''ہم بڑے روسی۔ اور پھر ہم بڑے روسی۔ اور پھر ہم بڑے آدمی بھی تو ہیں۔ ہم چاہیں تو علما کے بنائے ہوئے اصولوں کی دھجیاں اڑا سکتے ہیں۔)

''جناب والا! میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ذاتی وقار اور عزتِ نفس کے بغیر (اور یہ دونوں جذبے رئیسوں میں بڑی ترقی یافتہ شکل میں پائے جاتے ہیں) سماجی.... صحت مند سماجی...... تعمیر کی بنیادیں پختہ نہیں ہوسکتیں۔ جناب والا! اصل چیز ذاتی کردار ہے۔ آدمی کا ذاتی کردار چٹان ہونا چاہیے چٹان۔ اس پر تو ساری عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ مثلاً مجھے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ میرے عادات و اطوار کو، میرے لباس کو. میری شائستہ طبعی کو مضحکہ خیز چیز سمجھتے ہیں لیکن یہ ساری باتیں خودداری اور احساسِ فرض سے، جی احساسِ فرض سے پیدا ہوتی ہیں۔ میں دیہات میں یا یوں کہیے کہ جنگل میں رہتا ہوں لیکن میں اپنے آپ کو گرنے تو نہیں دوں گا۔ انسانی وقار کی جو نعمت مجھے عطا ہوئی ہے، میں اس کا احترام کرتا ہوں۔''

بازاروف بولا۔ ''پافل پیئر وچ صاحب۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ اپنا احترام کرتے ہیں اور ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ صحت مند سماج کو اس سے کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ اگر آپ اپنا احترام نہ بھی کرتے تو بھی وہی بات ہوتی۔''

پافل پیئر وچ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ''یہ ایک مختلف سوال ہے۔ بقول آپ کے میں ہاتھ پیر توڑ کے جو بیٹھ گیا ہوں کہ رئیسی ایک اصول ہے اور ہمارے زمانے میں

اصولوں کو یا تو انحطاط پسند نظر انداز کر سکتے ہیں یا احمق لوگ۔ باقی اور کوئی تو انہیں نظر انداز کر نہیں سکتا۔ ارکادی جس روز یہاں آیا ہے۔ اس کے دوسرے ہی دن میں نے اس سے یہ بات کہی تھی اور آج پھر کہتا ہوں۔ ہیں نانکولائی؟''

نکولائی پیٹروچ نے اثبات میں سر ہلایا' مگر بازاروف اپنی ہانکے جا رہا تھا۔ ''رئیسی۔ آزاد خیالی۔ ترقی۔ اصول۔ دور از کار بدیشی لفظوں کی پوٹ کی پوٹ جمع ہو گئی ہے۔ روسیوں کو ان سے کوڑی کا فائدہ نہیں۔''

''آپ کے نزدیک کون سی چیز نفع بخش ہے؟ اگر آپ کی بات پہ کان دھرا جائے تو ہم تو انسانیت کے دائرے سے اس کے قوانین کے حلقہ سے ہی خارج ہو جائیں۔ دیکھیے تاریخ کی منطق کا تقاضا یہ ہے......''

''لیکن منطق سے ہمیں کیا لینا؟ ہمارا کام اس کے بغیر بھی چل سکتا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ جب آپ کے پیٹ میں چوہے قلابازیاں کھانے لگتے ہیں تو منہ میں نوالہ ٹھونسنے کے لیے آپ کو منطق کی ضرورت نہیں پڑتی۔ آخر ان ہوائی باتوں کا مقصد کیا ہے؟''

پافل پیٹروچ نے سہم کر ہاتھ بلند کر لیے۔ ''آپ کی بات میری سمجھ میں مطلق نہیں آتی۔ میں یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اصولوں اور ضابطوں سے انکار کیونکر ممکن ہے۔ پھر آخر آپ کے اعمال و افعال کی بنیاد کیا ہے۔''

ارکادی بیچ میں بول اٹھا۔ ''تایا جان میں نے آپ سے عرض کیا تھا نا کہ ہم کسی کی حیثیت تسلیم نہیں کرتے۔''

بازاروف نے کہا۔ ''جس بات کو ہم مفید سمجھتے ہیں۔ بس اسی پہ اپنے اعمال و افعال کی بنیاد رکھتے ہیں۔ آج کل سب سے مفید چیز انکار ہے اور ہم انکار کرتے ہیں.....''

''ہر چیز سے؟''

''ہر چیز سے۔''

''جی یعنی محض آرٹ اور شاعری سے نہیں.... بلکہ.... حد ہے کہ....'' ''ہر چیز

سے۔'' بازاروف نے پورے اطمینان وسکون سے اپنی بات دہرائی۔

پافل پیئر وچ اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ اسے اس بات کی توقع ہرگز نہ تھی اور ارکادی کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔

نکولائی پیئر وچ بولا۔ ''اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں۔ یوں تو آپ ہر چیز کو جھٹلاتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ آپ ہر چیز کی تخریب چاہتے ہیں.... لیکن آدمی کو تعمیر بھی تو کرنی چاہیے۔''

''فی الحال یہ کام ہمارے سامنے نہیں ہے..... پہلے تو زمین سے ملبہ اٹھنا چاہیے۔''

''عوام کی موجودہ حالت کا تقاضا یہ ہے۔'' ارکادی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''ہم ان ضروریات کو پورا کرنے پہ مجبور ہیں۔ ہمیں یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ اپنی انانیت کی تسکین میں مصروف ہو کر رہ جائیں۔''

یہ آخری فقرہ بازاروف کو بہت کھٹکا اور کھٹکنا چاہیے بھی تھا۔ اس سے فلسفہ کی جو بُو آتی تھی۔ فلسفہ کیا بلکہ روحانیت کہیے' اس لیے کہ بازاروف تو فلسفہ کو بھی روحانیت ہی سے تعبیر کرتا تھا' لیکن اس نے اپنے الھڑ چیلے کی اصلاح کچھ ایسی ضروری نہیں سمجھی۔

''نہیں۔ نہیں۔'' پافل پیئر وچ میں ایکا ایکی پھر گرمائی آ گئی تھی۔ ''میں یہ ماننے پہ تیار نہیں ہوں کہ آپ لوگ آپ کل کے لڑکے روسی عوام کو واقعی سمجھتے ہیں اور آپ ان کی ضرورتوں اور ان کی جدوجہد کی نمائندگی کر سکتے ہیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ روسی قوم وہ نہیں ہے جو آپ نے اسے سمجھ رکھا ہے۔ وہ روایت کی حرمت کی قائل ہے۔ وہ قدامت پرست قوم ہے۔ عقیدے کے بغیر تو وہ زندہ نہیں رہ سکتی.....''

بازاروف بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اس سے اختلاف نہیں ہے بلکہ میں تو یہاں تک قبول کرنے پہ تیار ہوں کہ آپ بجا فرماتے ہیں۔''

''لیکن اگر میں بجا عرض کرتا ہوں.....''

''اس سے ثابت وابت کچھ نہیں ہوتا۔ بات جہاں کی تہاں ہے۔''

''اس سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔'' ارکادی نے یہ فقرہ کچھ اس اعتماد سے دہرایا گویا وہ شطرنج کا کوئی منجھا ہوا کھلاڑی ہے جس نے دشمن کی بظاہر خطرناک چال کا انجام بھانپ لیا

ہے اور اس لیے وہ اس پر مطلق پریشان نہیں ہے۔

''اس سے کچھ ثابت کیسے نہیں ہوتا۔'' پافل پیئر وچ کی بڑبڑاہٹ میں حیرت کا عنصر بھی شامل تھا۔ ''اس کے معنی پھر یہ ہوئے کہ آپ عوام کے خلاف ہیں۔''

بازاروف چلّا کر بولا۔ ''اگر ہیں تو اس میں حرج کیا ہے؟ جب بجلی کڑکتی ہے تو عوام سمجھتے ہیں کہ الیاس پیغمبر رتھ میں بیٹھے آسمان پہ گھوم رہے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟ کیا ہم بھی ان کے ساتھ یہی سمجھنے لگیں؟ اس کے علاوہ عوام روسی ہی تو ہیں اور کیا میں روسی نہیں ہوں؟''

''نہیں۔ آپ یہ سب کچھ جو کہہ چکے ہیں۔ اس کے بعد تو آپ روسی نہیں۔ میں تو آپ کو روسی ماننے پہ تیار ہوں نہیں۔''

بازاروف نے بڑے غرور اور تمکنت سے جواب دیا۔ ''میرے دادا نے اس زمین پہ ہل چلایا ہے۔ اپنے کسی کسان کو بلا کر پوچھ لیجیے۔ دیکھیں وہ ہم دونوں میں سے کسے زیادہ مستعدی سے اپنا ہم وطن بتاتا ہے۔ آپ کو یا مجھے۔ آپ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ ان سے بات کیسے کرنی چاہیے۔''

''اور آپ اس سے بات کرتے ہیں اور ساتھ میں اس سے نفرت کرتے ہیں۔''

''فرض کیجیے کہ وہ اس نفرت کا مستحق ہے۔ آپ میرے طرزِ عمل میں کیڑے ڈالتے ہیں، لیکن آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ طرزِ عمل میرے ساتھ محض ایک حادثہ ہے یا کہ اسی قومی مزاج کی پیداوار نہیں ہے جس کے نام پر آپ میرے خلاف لام باندھ رہے ہیں۔''

''کیا حسین خیال ہے۔ انکار پسندوں کے لیے تو بڑا کارآمد ہے۔''

''کارآمد ہے یا نہیں ہے، یہ فیصلہ کرنا ہمارا آپ کا کام نہیں ہے اور آپ کا کیا ہے۔ آپ تو اپنے آپ تک کو نا کارہ نہیں سمجھتے۔''

نکولائی پیئر وچ کھڑا ہو گیا۔ ''دیکھیے۔ دیکھیے جناب ذاتی حملے نہیں ہونے چاہئیں۔''

پافل پیئر وچ مسکرا پڑا اور بھائی کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر اسے پھر بٹھا دیا۔ پھر بولا۔ ''گھبراؤ نہیں۔ میں آپے سے باہر نہیں ہوؤں گا۔ وہی رکھ رکھاؤ بیچ میں آ جاتا ہے جس کا یہ ہمارے کرم فرما دل کھول کر مذاق اڑا رہے ہیں۔ یہ ہمارے کرم فرما جناب ڈاکٹر صاحب۔''

''اچھا یہ فرمایئے۔'' بازاروف کی طرف متوجہ ہو کر اس نے اپنی بات پھر شروع کر دی۔ ''آپ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے نظریئے میں کوئی ندرت ہے؟ یہ محض خوش فہمی ہے۔ جس مادہ پرستی کا آپ پرچار کر رہے ہیں اس پر کئی مرتبہ عمل ہو چکا ہے اور ہر مرتبہ وہ ناکافی ثابت ہوئی ہے۔''

''پھر وہی بدیشی لفظ۔'' بازارف بیچ میں بول اٹھا۔ دراصل اب اس پہ جھلاہٹ سوار ہو رہی تھی اور اس کا چہرہ تانبے کی طرح تمتما اٹھا تھا۔ ''اول تو یہ کہ ہم کسی بات کا پرچار نہیں کرتے۔ یہ ہمارا دستور ہی نہیں ہے۔''

''تو پھر آپ کیا کرتے ہیں؟''

''میں آپ کو بتاتا ہوں، ہم کیا کرتے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ہم یہ رونا رویا کرتے تھے کہ صاحب ہمارے یہاں ملازمین رشوتیں کھاتے ہیں، ہمارے یہاں سڑکیں نہیں، کاروبار نہیں، عدالتوں میں انصاف نہیں ہوتا۔''

''اخا میں سمجھا۔ آپ مصلح ہیں۔ یہی نام ہے نا۔ آپ کی بہت سی اصلاحات سے مجھے بھی اتفاق ہے لیکن......''

''پھر ہمیں رفتہ رفتہ یہ خیال پیدا ہوا کہ سماجی بیماریوں کے بارے میں زبانی باتیں بنانا، زبانی باتوں کا لگاتار طومار باندھتے رہنا، ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھ جانا اور باتوں کی طوطا مینا بناتے رہنا، یہ ہمیں کچھ زیب نہیں دیتا۔ یہ محض دکھاوا ہے۔ لفاظی ہے۔ اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ ہم نے سمجھ لیا کہ ہمارے سربرآوردہ افراد، نام نہاد ترقی یافتہ اصحاب اور مصلحین بالکل ناکارہ لوگ ہیں اور ہم خواہ مخواہ کی لغویات میں پھنسے ہوئے ہیں، ہم آرٹ پر تخلیق کے غیر شعوری عمل پر پارلیمنٹ اور عدالت کے معاملات پر اور خدا جانے کن کن باتوں پہ مغز پچی کرتے رہتے ہیں اور پیٹ بھرنے کا سوال جوں کا توں ہے۔ بدترین قسم کی توہم پرستی ہمارا دم بند کیے دے رہی ہے اور ہماری ہر مہم پہ پانی پھر جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے چلانے والے دیانتدار نہیں ہیں اور یہ کہ حکومت جو نجات کا منصوبہ تیار کر رہی ہے اس کا بھی کوئی خوشگوار نتیجہ نکلتا نظر نہیں آتا' اس لیے کہ کسانوں کے سامنے تو یہ سوال رہتا ہے کہ وہ تاڑی خانے میں پہنچ کر نشہ کر سکیں اور اس کی خاطر وہ خود اپنے آپ کو ٹھگنے میں بھی

عار نہیں سمجھتے۔''

''جی۔'' پافل پیئر وچ نے اسے بیچ میں ٹوک دیا۔ ''جی ہاں۔ آپ کو ان تمام باتوں کا یقین تھا اور اس لیے آپ نے طے کیا کہ سرے سے کوئی کام سنجیدگی سے کیا ہی نہ جائے۔''

''ہم نے طے کیا کہ سرے سے کوئی کام کیا ہی نہ جائے۔'' بازاروف نے جل کر کہا۔ اسے اچانک اپنے آپ پہ تاؤ آیا کہ آخر وہ اتنی دیر سے اس شخص سے کیوں خواہ مخواہ جھک مار رہا ہے۔

''بلکہ گالیوں پہ قناعت کر لی جائے؟''

''گالیوں پہ قناعت کر لی جائے۔''

''اور اس کا نام انکار پسندی ہے؟''

''اور اس کا نام انکار پسندی ہے۔'' اس مرتبہ فقرہ دہراتے ہوئے بازاروف کے لہجہ میں ایک مخصوص قسم کا اکھڑ پن بھی پیدا ہو گیا تھا۔ پافل پیئر وچ کے چہرے پر اک اڑتی ہوئی سی شکن نمودار ہوئی۔ ''تو یہ بات ہے۔'' اس نے غیر معمولی حد تک سنبھلی ہوئی آواز میں کہا۔ ''انکار پسندی ہمارے تمام دکھوں کا علاج ہے اور آپ، آپ لوگ ہمارے ہیرو، ہمارے نجات دہندہ ہیں' لیکن آپ دوسروں کو گالیاں کیوں دیتے ہیں۔ آخر ان مصلحین کو بھی برا بھلا کیوں کہا جائے۔ آپ بھی کچھ کم باتیں تو نہیں کرتے؟''

''ہم میں لاکھ برائیاں سہی مگر ہم اس قسم کی غلطیاں نہیں کرتے۔'' بازاروف نے منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر کہا۔

''تو پھر صورت کیا ہے؟ آپ عمل کرتے ہیں یا کیا کرتے ہیں؟ یا آپ عمل کی تیاریاں کر رہے ہیں؟''

بازاروف نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پافل پیئر وچ پہ کپکپی سے ملتی جلتی ایک کیفیت طاری ہوئی لیکن اس نے بہت جلد اپنے آپ پہ قابو پالیا۔

''ہوں.... عمل۔ تخریب۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''لیکن اگر یہ بھی پتہ نہ ہو کہ یہ تخریب کیوں ہو رہی ہے تو آپ تخریب کریں گے کیسے؟''

ارکادی بولا۔ ''ہم تخریب کریں گے کیونکہ ہم ایک قوت ہیں۔''

پافل پیئر وچ بھتیجے کو دیکھ کر ہنس پڑا۔

ارکادی سنبھل کر بولا۔ ''جی ہاں۔قوت تو قوت ہے۔ اس سے باز پرس نہیں کی جا سکتی۔''

''ارے بیوقوف۔'' پافل پیئر وچ کے لہجہ میں درد و سوز کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ آخر وہ کب تک تنا بیٹھا رہتا۔ اس روش کو نباہنے کی اب تو اس میں بالکل سکت نہیں رہی تھی۔ ''کاش تم یہ سوچ سکتے کہ یہ تم اپنے ملک کے لیے کیا زہر بور ہے ہو۔ اُف۔ یہ تو وہ صورت ہے کہ اسے دیکھ کر فرشتوں کے بھی ہوش اڑتے ہیں۔''

''قوت۔قوت تو وحشی کالمک میں بھی ہوتی ہے، منگول میں بھی ہوتی ہے لیکن ہمیں اس سے کے کوڑی کا فائدہ۔ ہمیں تو تہذیب عزیز ہے۔ ہاں ہمیں اس کے کارنامے عزیز ہیں اور یہ نہ کہو کہ یہ کارنامے بیکار شے ہیں۔ اَن گھڑ سے اَن گھڑ مصور، انتہائی بے سرا گویا وہ شخص جو ایک چونی پہ ناچتا گاتا پھرتا ہے وہ بھی تم سے زیادہ وقعت رکھتا ہے' اس لیے کہ یہ لوگ منگولوں کی وحشیانہ طاقت کی نہیں بلکہ تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ تم اس خیال میں مگن ہو کہ تم بڑے ترقی یافتہ ہو اور کیفیت یہ ہے کہ کالمک کے غار میں رہنے کے لائق ہو۔ قوت اور تمہیں قوت پہ گھمنڈ ہے۔ مگر یہ یاد رکھو کہ تم گنتی کے آدمی ہو اور باقی لوگ سینکڑوں، لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ وہ اپنی مقدس روایات کو پامال نہیں ہونے دیں گے۔ وہ الٹا تمہیں کچل ڈالیں گے، کھونڈ ڈالیں گے۔''

بازاروف بولا۔ ''اگر ہم کچلے جاتے ہیں تو ٹھیک ہے' لیکن یہ سوال ذرا اختلافی ہے۔ ہماری تعداد اتنی قلیل نہیں ہے جتنا آپ سمجھتے ہیں۔''

''اچھا؟ کیا آپ سنجیدگی سے یہ سمجھتے ہیں کہ پوری قوم آپ کی باتوں میں آجائے گی؟''

بازاروف نے جواب دیا۔ ''آپ کو پتہ ہے کہ دمڑی کے تیل سے سارا ماسکو جل کر راکھ ہو گیا تھا۔''

''جی ہاں۔ شیطانی قسم کا گھمنڈ اور طنز و تمسخر۔ یہ دو چیزیں نوجوانوں کو بہت لبھاتی

ہیں اور خام ناپختہ کار لڑکوں کے دل و دماغ پہ غالب آ جاتی ہیں۔ اس قسم کا ایک لڑکا یہ بیٹھا ہے تمہاری بغل میں جو تمہارے قدموں کی خاک کو سر سے لگانے پہ تیار ہے۔ ذرا دیکھو اس کی حالت (ارکادی منہ پھیر کر منمنانے لگا) اور یہ وبا بے تحاشا پھیل رہی ہے۔ مجھ سے ایک صاحب کہتے تھے کہ روم میں ہمارے فنکاروں کی حالت یہ ہے کہ ویٹیکن میں بھولے سے قدم نہیں رکھتے۔ ریفائل کو وہ احمق سمجھتے ہیں۔ اس لیے گستاخی معاف کہ اس کی حیثیت مستند ہے۔ خود ان بیچاروں کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے دماغ بنجر اور ویران ہیں، ان سے آتا جاتا کچھ نہیں ہے۔ غریب لاکھ زور مارتے ہیں مگر چشمہ میں غوطے لگانے والی لڑکیوں سے پرے ان کا تخیل جا ہی نہیں سکتا اور آفت تو یہ ہے کہ ان کی تصویر بھی غلط بناتے ہیں۔ آپ کے نزدیک یہ خوب لوگ ہیں یا نہیں ہیں؟''

''میرے نزدیک۔'' بازاروف نے تڑ سے جواب دیا۔ ''ریفائل کی ٹکے کی حیثیت ہے اور جیسا وہ ویسے ہی یہ لوگ۔''

''شاباش۔ شاباش۔ ارکادی سن لو.... آج کل کے نوجوانوں کو اپنے خیالات کا اظہار یوں کرنا چاہیے اور اگر وہ آپ کی تقلید کرنے لگیں تو پھر ناکامی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ پرانے زمانوں میں نوجوانوں کو پڑھنا پڑتا تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ انہیں گدھا کہا جائے۔ اس لیے طوعاً و کرہاً وہ پڑھتے ہی تھے' لیکن اب تو بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ دنیا کی ہر چیز لغویت ہے۔ لیجیے بغیر ہلدی پھٹکری کے کام بن گیا۔ نوجوان خوش ہو گئے اور سچ پوچھیے تو یہ غریب تو بھیگی بلی تھے۔ راتوں رات انکار پسند بن گئے۔''

''آپ کا وہ قابل قدر رکھ رکھاؤ تو رفو چکر ہو گیا نا۔'' بازاروف نے بڑی سرد مزاجی سے یہ بات کہی تھی۔ آگ تو دراصل ارکادی کے تن بدن میں لگ رہی تھی اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ بازاروف اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا ''ہماری بحث بہت لمبی ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ اب اسے مختصر کیا جائے۔ اگر آپ زندگی کے موجودہ نظام میں، خاندان میں یا سماجی زندگی میں کوئی ایک بھی ایسا ادارہ دکھا دیں جسے مکمل اور غیر مشروط طور پر نیست و نابود کرنے کی ضرورت نہ ہو تو میں بڑی خوشی سے آپ کی بات مان لوں گا۔''

پافل پیئر وچ نے تاؤ میں آ کر کہا۔ ''ایک نہیں لکھو کھا ایسے اداروں کی مثالیں

پیش کر سکتا ہوں۔ لکھو کھا۔ اچھا ''میر'' ہی کی مثال لے لو۔''

بازاروف طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ پھر بولا۔ ''اچھا جہاں تک ''میر'' کا معاملہ ہے تو اس کے متعلق آپ اپنے بھائی سے گفتگو کر لیں تو زیادہ مناسب رہے گا۔ میرا خیال ہے کہ اب تک انہیں پتہ چل چکا ہوگا کہ ''میر'' کی حقیقت کیا ہے۔ اس کی ضمانت، اس کی سنجیدگی اور اس قسم کے اس کے دوسرے پہلوؤں کی کیا کیفیت ہے۔''

پافل پیئر وچ نے غصہ میں آ کر کہا۔ ''اچھا تو خاندان کی مثال لے لو۔ خاندان جس صورت میں کسانوں میں وجود رکھتا ہے۔''

''اس موضوع کے متعلق بھی میرا خیال یہ ہے کہ آپ اس کی تفصیلات کی چھان بین نہ کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ کیا آپ کو اس کا احساس نہیں ہے کہ خاندان کے بزرگ کو اپنی بہوؤں کے انتخاب میں کتنی آسانیاں حاصل ہوتی ہیں۔ پافل پیئر وچ صاحب میری بات مانئے۔ اس کے متعلق دو دن سوچ بچار کر لیجیے۔ بظاہر آپ کو کوئی بات نظر نہیں آئے گی۔ ہمارے ہر طبقے کے متعلق چھان بین کیجیے۔ آپ یہ کریں اور اس دوران میں مَیں اور ارکادی......''

پافل پیئر وچ بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''ہر چیز کا مذاق اڑاتے رہیں گے۔''

''نہیں۔ مینڈکوں کی چیر پھاڑ کریں گے۔ ارکادی چلو۔ اچھا جناب آداب عرض ہے۔''

دونوں دوست چل دیئے۔ بھائی اکیلے رہ گئے۔ پہلے تو وہ ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ آخر پافل پیئر وچ بولا۔ ''تو نئی پود کے نوجوانوں کی کیفیت یہ ہے۔ یہ ہیں ہمارے وارث۔''

''ہمارے وارث۔'' نکولائی پیئر وچ مایوسانہ انداز میں مسکرایا۔ اس پوری بحث کے دوران میں اس کی بری حالت رہی تھی۔ وہ بولا تو کچھ نہیں۔ وہ تو چوری چوری دکھے ہوئے دل سے ارکادی کو بار بار دیکھتا تھا۔ ''بھائی صاحب آپ کو بتاؤں، مجھے اس وقت کیا بات یاد آ رہی تھی۔ ایک مرتبہ اماں جان سے میری لڑائی ہوگئی۔ وہ مجھ پہ اس بری طرح برسیں کہ میری ایک پیش نہیں گئی۔ آخر میں نے ان سے کہا۔ ''آپ میری بات

سمجھ ہی نہیں سکتیں۔ آپ اور ہم دو الگ الگ نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔'' یہ سن کے وہ ایسی بگڑیں کہ بس کچھ نہ پوچھو اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ ''کیا کیا جا سکتا ہے۔ مجبوری ہے۔ گولی کڑوی ہے' لیکن انہیں اسے نگلنا ہی پڑے گا۔'' آپ دیکھ رہے ہیں کہ اب ہماری باری آئی ہے اور ہماری اولاد ہم سے یہ کہہ سکتی ہے۔ ''آپ ہماری نسل سے تعلق نہیں رکھتے۔'' اس گولی کو نگل لیجیے۔''

''فیاضی اور شرافت میں تو آپ کا جواب نہیں ہے۔'' پافل پیئر وچ نے جواب دیا۔ ''اس کے برخلاف مجھے یقین ہے کہ ان کل کے لونڈوں کے مقابلہ میں ہم زیادہ سچے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اپنے خیالات کا اظہار دقیانوسی زبان میں اور پرانے دہرانے انداز مین کرتے ہیں اور اِس قسم کے چلتے ہوئے بانکے فقرے استعمال نہیں کرتے....اور یہ آج کل کے نوجوان زمین پہ قدم نہیں رکھتے۔ ان سے پوچھو۔ ''آپ سرخ پئیں گے یا سفید۔'' اور وہ حضرت بن کر جواب دیں گے ''میں تو سرخ کو ترجیح دیتا ہوں۔'' اور چہرے پہ وہ سنجیدگی طاری کریں گے گویا پوری کائنات کی نگاہیں ان پہ جمی ہوئی ہیں....''

''چائے اور پی جیئے گا؟'' فینشکا نے دروازہ سے سر نکال کر پوچھا۔ جب تک بحث گرم رہی' اسے یہ جرأت نہیں ہو سکی تھی کہ وہ بیٹھک میں آ جائے۔

''نہیں۔'' نکولائی پیئر وچ یہ کہہ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ پافل پیئر وچ نے ایکا ایکی سلام کیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

(11)

آدھ گھنٹے بعد نکولائی پیئر وچ باغ میں ٹہلتا ہوا اپنے کنج میں جا نکلا۔ اسے افسردہ خیالات نے آ گھیرا۔ اس نے پہلی مرتبہ واضح طور پر وہ فرق محسوس کیا جو اس کے اور اس کے بیٹے کے درمیان پیدا ہو گیا تھا۔ اسے یہ نظر آ رہا تھا کہ یہ خلیج روز بروز وسیع ہوتی چلی جائے گی۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ پیٹرسبرگ میں جاڑوں کے دنوں میں سارے سارے دن جو نئی نئی کتابوں پہ جھکا رہتا تھا، وہ سب بیکار ہی گیا۔ نوجوانوں کی باتیں سننے میں بھی اس نے فضول

ہی وقت ضائع کیا۔ ان کی گرما گرم بحثوں میں بولنے سے جو اسے مسرت حال ہوتی تھی، وہ بھی بے وقعت ہی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ ''میرا بھائی کہتا ہے کہ سچے ہم ہیں اور شیخی سے قطع نظر میں بھی یہی سوچتا ہوں کہ سچے ہم ہیں نہ کہ وہ، لیکن ساتھ ہی ساتھ میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ ان میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہے جو ہم میں نہیں ہے۔ ان میں کوئی ایسی خوبی ہے کہ انہیں ہم پر برتری حاصل ہے..... کیا یہ چیز جوانی ہے؟ نہیں۔ یہ چیز صرف جوانی نہیں ہے۔ کیا اس برتری کی وجہ یہ نہیں کہ ہماری نسبت ان میں آقائیت کے اثرات کم نظر آتے ہیں؟''

نکولائی پیئر وچ کا سر بڑی مایوسی کے عالم میں نیچے ڈھلک گیا اور اس کا ہاتھ پیشانی پہ پہنچ گیا۔

''لیکن کیا شاعری کو تیاگ دے دیا جائے؟'' وہ پھر خیالات میں بہنے لگا۔

''آرٹ سے فطرت سے ناطہ توڑ لیا جائے۔''

اور اس نے اپنے اردگرد ایک نظر ڈالی۔ گویا وہ یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ فطرت سے ناطہ توڑنا کیونکر ممکن ہے۔ شام ہو چلی تھی۔ سورج سفیدے کے درختوں کے اس مختصر جھنڈ کے پیچھے جا پہنچا تھا جو باغ سے ایک چوتھائی میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ اس جھنڈ کے برابر ایک پتلی سی پگڈنڈی چلی گئی تھی جس پہ ایک کسان سفید ٹٹو پہ سوار اطمینان سے چلا جا رہا تھا۔ اگرچہ وہ سائے میں چل رہا تھا، پھر بھی اس کی شکل کاندھوں تک صاف نظر آ رہی تھی اور ٹٹو کی ٹاپیں اپنی خاص رفتار کے ساتھ زمین پہ پڑ رہی تھیں۔ سورج کی شعاعیں پرلی طرف سے جھنڈ پر پڑ رہی تھیں اور گچھوں اور شاخوں میں نفوذ کر کے وہ کچھ اس انداز میں سفیدے کے تنوں پر نرم گرم روشنی انڈیل رہی تھیں کہ وہ بالکل چیڑ کے درخت سے لگنے لگے تھے اور ان کی پتیاں گہری نیلی پڑ گئی تھیں اور ان کے اوپر ہلکا نیلا آسمان پھیلا ہوا تھا جس کی نیلاہٹ میں ڈوبتے ہوئے سورج کی ہلکی ہلکی دھاریاں بھی ملی ہوئی تھیں۔ فضا میں بہت بلندی پر ابابیلیں اڑ رہی تھیں۔ ہوا پہ سکتہ طاری تھا۔ مکھیوں کو اندھیرے نے آ لیا تھا اور وہ سوسن کے خوشوں میں آہستہ آہستہ ایک غنود آمیز انداز میں بھنبھنا رہی تھیں۔ سب سے الگ تھلگ ایک شاخ پر جس کا رخ آسمان کی طرف تھا، مکھیوں کا ایک دَل بادل کی طرح منڈلا رہا تھا۔ نکولائی پیئر وچ سوچنے لگا ''واہ واہ کیا حسین منظر ہے'' اور اسے اپنے پسندیدہ شعر یاد آنے

لگے۔ اتنے میں اسے ارکادی کی دی ہوئی بوشینر کی کتاب یاد آ گئی اور وہ خاموش ہوگیا مگر وہ وہاں بیٹھا پھر بھی رہا اور اِکّا دُکّا بھٹکتے ہوئے خیالات کی حزن آمیز کیفیت میں غرق ہوگیا۔ خیالی پلاؤ پکانے کا اسے بڑا چسکا تھا۔ اس میں یہ رجحان اس کی دیہاتی زندگی کی بدولت پروان چڑھا تھا۔ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے کہ وہ اسٹیشن پہ بیٹھا اپنے بیٹے کی آمد کے تصور میں خیالات کا محل کھڑا کر رہا تھا اور اس کے بعد کیسی دنیا بدلی تھی۔ ان کے تعلقات کی شکل جو اب تک مبہم اور غیر واضح تھی، اب واضح ہوگئی تھی اور واضح بھی کس عجب انداز سے ہوئی تھی۔ مرحوم بیوی کی شکل پھر اس کی آنکھوں میں پھرنے لگی، لیکن یہ وہ شکل نہیں تھی جس سے وہ برسوں سے مانوس تھا اور جس کی حیثیت گھریلو بیوی کی تھی۔ آج تو اس کا دوسرا ہی نقشہ اس کی آنکھوں میں پھر رہا تھا۔ چھریرے جسم کی ایک نوجوان لڑکی، نگاہیں مجسم سوال، معصوم گردن پر بالوں کا جوڑا۔ اسے وہ لمحے یاد آ گئے جب اس نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا تھا۔ ان دنوں وہ ایک طالب علم تھا۔ اس سے اس کی مڈھ بھیڑ زینے کی سیڑھیوں پر ہوئی تھی۔ اتفاق کی بات کہ وہ اس سے ٹکرا گیا تھا اور پھر اس نے اس سے معذرت کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن اس کی زبان سے دبی سی آواز میں یہ نکلا تھا۔ ''حضرت معاف کیجیے۔'' اور اس نے جھک کر سلام کیا، وہ مسکرائی اور یکا یک سہم کر وہاں سے بھاگی لیکن زینے کے موڑ پر پہنچ کر اس نے ایک اڑتی ہوئی سی نگاہ سے اسے دیکھا تھا۔ اس نے چہرے پہ سنجیدگی طاری کر لی تھی اور وہ شرم سے پانی پانی ہوگئی تھی۔ شروع شروع میں شرم وحیا غالب رہی۔ ملاقاتیں ہوئیں لیکن رک رک کر۔ الفاظ کچھ ہونٹوں پہ آ گئے۔ کچھ ہونٹوں پہ آتے آتے رہ گئے۔ تبسم ریزیاں بھی ہوئیں، لیکن دبی دبی۔ غرض ایک اکھڑے اکھڑے پن کی کیفیت رہی۔ پھر یہ کیفیت ختم ہوئی۔ حزن وملال کا دور آیا۔ التجائیں ہوئیں۔ منتیں کی گئیں اور بالآخر مسرت کے وہ حسین لمحات آئے...... یہ کیفیتیں یہ لمحات کہاں چلے گئے تھے، کون سے پردے میں جا چھپے تھے۔ وہ اس کے گھر کی رونق تھی اور اس کے ساتھ اسے وہ خوشی حاصل ہوئی جو کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہوگی...... ''لیکن'' وہ سوچنے لگا۔ ''یہ شیریں ابتدائی لمحات۔ آخر انسان ان میں گم ہو کر اپنی زندگی کو جاوداں کیوں نہیں بنا سکتا؟''

اس نے اپنے خیال کو واضح طور پر سمجھنے کی کوشش نہیں کی، لیکن اسے یہ ضرور محسوس

ہورہا تھا کہ وہ ان نشاط آمیز لمحات کو کسی ایسی چیز سے باندھ کر رکھنا چاہتا ہے جو حافظہ سے زیادہ مضبوط ہو۔ اس کے سینے میں یہ تمنا گدگدائی کہ ایک مرتبہ پھر وہ یہ محسوس کرکے کہ میریا اس کے پہلو کو گرما رہی ہے اور وہ اس کے تنفس کو، اس کے جسم کی حرارت کو محسوس کررہا ہے اور اسے ایسا لگنے لگا گویا اس پر......

''نکولائی پیٹروچ آپ کہاں ہیں؟'' یہ فینشکا کی آواز تھی۔ وہ اس کے بالکل قریب سے بولی تھی۔

وہ چونک پڑا۔ اس نے کسی قسم کا تأسف، کسی قسم کی ندامت محسوس نہیں کی۔ اس نے تو کبھی اس امکان ہی کو تسلیم نہیں کیا تھا کہ اس کی بیوی اور فینشکا کا موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اسے یہ ملال ضرور ہورہا تھا کہ اسے اس کا اتنا خیال ہے کہ وہ اسے دیکھتی پھر رہی ہے۔ اس کی آواز اسے واپس کھینچ لائی تھی اور اس کے بدرنگ بال، اس کی عمر، اس کی حقیقت....

جس دلفریب دنیا میں وہ بس قدم رکھنے کو تھا اور جو ماضی کے دھندلے سایوں سے آہستہ آہستہ ابھر رہی تھی وہ درہم برہم ہوگئی......معدوم ہوگئی۔

''میں یہ رہا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''تم چلونا۔ میں آرہا ہوں۔'' اور یکا یک اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ ''یہ ہے وہ چیز۔ آقائیت کا احساس۔'' فینشکا نے خاموشی سے کنج میں جھانک کر اسے دیکھا اور غائب ہوگئی اور جب اس نے نگاہیں اٹھائیں تو اسے یہ دیکھ کر تعجب ہونے لگا کہ وہ تو تصور کی دنیا میں کھویا رہا اور یہاں دن بھی چھپ گیا۔ اردگرد کی تمام اشیاء پر تاریکی کے پردے پڑے تھے، سناٹا چھایا ہوا تھا۔ فینشکا کے چہرے پہ بھی اسے کچھ نقاہت کے آثار نظر آئے تھے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور گھر واپس جانے لگا، لیکن اس کے سینے میں تو ایک اضطرابی کیفیت جاگ اٹھی تھی۔ فوراً کے فوراً اس کی طبیعت کیسے ٹھکانے آجاتی۔ اس نے باغ میں ٹہلنا شروع کردیا۔ کبھی وہ زمین پہ اپنے قدموں کو دیکھنے لگتا تھا اور کبھی اس کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ جاتی تھیں جہاں جابجا ستاروں کے جھرمٹ جگمگ جگمگ کررہے تھے۔ وہ اتنا ٹہلا، اتنا ٹہلا کہ تقریباً تھک کر چور ہوگیا، لیکن اس کے نفس کا اضطراب، وہ ارمانوں بھرا، حزن آگیں، مبہم اضطراب اب بھی دھیما نہیں پڑا تھا۔ اگر کہیں بازاروف کو یہ پتہ چل جاتا کہ اس کے نفس میں اس وقت کیسی

قیامت بپا ہے تو وہ اس پہ کتنا کچھ نہ ہنستا۔ خودار کادی اس کی مذمت کرتا۔ وہ چوالیس سال کا ادھیڑ شخص ایک کسان ایک کاشتکار زار و قطار رو رہا تھا، بغیر کسی وجہ اور سبب کے۔ یہ تو سارنگی سے کہیں زیادہ بری چیز ہے۔

نکولائی پیئر وچ برابر ٹہلتا رہا۔ وہ اپنے آپ کو گھر جانے پہ آمادہ نہیں کر سکا تھا۔ وہ امن و عافیت اور سکون کا گوشہ جو اپنی تمام روشن کھڑکیوں سمیت اس کا انتظار دیکھ رہا تھا، اس کی راہ میں آنکھیں بچھا دینا چاہتا تھا، لیکن اس میں اتنی سکت کہاں تھی کہ تاریکی سے، باغ سے، چہرے کو گدگداتے ہوئے ہوا کے تازہ جھونکوں سے اس افسردگی سے، اس اضطراب انگیز خلش سے اپنا دامن چھڑا لیتا۔

ایک موڑ پر پہنچ کر پافل پیئر وچ سے اس کی مڈھ بھیڑ ہوگئی۔ وہ پوچھنے لگا۔ ''یہ آپ کو کیا ہوا۔ چہرہ مردوں کی طرح سفید پڑا ہے۔ آپ کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ جا کر سوتے کیوں نہیں؟''

نکولائی پیئر وچ نے اسے مختصراً اپنے دل کی کیفیت بتائی اور آگے چل دیا۔ پافل پیئر وچ باغ کے آخری کنارے تک گیا۔ وہ بھی خیالات میں غلطاں ہو چلا تھا اور اس کی نگاہیں بھی آسمان کی طرف بلند ہو جاتی تھیں لیکن اس کی خوبصورت سیاہ آنکھوں میں ستاروں کی روشنی کے علاوہ اور کسی چیز کا عکس نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ آدرش پرست نہیں تھا۔ ایک تو اس کی تانت کی طرح تنی ہوئی خشک طبیعت۔ پھر اس میں فرانسیسیوں والی کلبیت کا امتزاج۔ تصورات کی دنیا میں گم ہونے کی اس میں کب اہلیت ہو سکتی تھی۔

اسی رات کا ذکر ہے کہ بازاروف ارکادی سے کہہ رہا تھا۔ ''میں نے ایک کمال کی بات سوچی ہے۔ بتاؤں کیا؟ آج تمہارے والد کہہ رہے تھے کہ ہمارے ایک مشہور و معروف رشتہ دار نے ہمیں بلایا ہے۔ تمہارے والد تو جا نہیں رہے ہیں۔ ہم کیوں نہ چلے چلیں۔ اس نے تمہیں بھی تو دعوت دی ہے۔ دیکھو نا موسم کس غضب کا ہو رہا ہے۔ ہم گھومیں پھریں گے اور شہر کی سیر کریں گے۔ پانچ چھ دن کی سیر ہو جائے گی اور خوب مزے رہیں گے۔''

''اور پھر تم یہاں پھر واپس آؤ گے نا؟''

''نہیں۔ والد کے پاس تو بہر صورت جانا ہے۔ ایکس کی بستی سے تقریباً پچیس

میل کے فاصلہ پہ وہ رہتے ہیں۔ مدت سے انہیں دیکھا ہی نہیں اور نہ والدہ کو دیکھا ہے۔ بڈھے بڑھیا بڑے سادہ سے لوگ ہیں۔ میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔''

''تم وہاں بہت دن رہو گے؟''

''نہیں جی۔ وہ تو بڑی بے کیف جگہ ہے۔''

''تو پھر واپسی میں تو ہم سے ملو گے؟''

''کیا پتہ ہے؟.... دیکھا جائے گا۔ خیر تم کیا کہتے ہو؟ چلنا ہے یا نہیں؟''

''تمہاری مرضی یہی ہے تو یہی سہی۔'' ارکادی نے بڑے ڈھیلے ڈھالے انداز میں یہ بات کہی۔ دوست کی تجویز سن کر اس کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے' لیکن اس نے اپنا یہ فرض سمجھا کہ اس احساس کو پوشیدہ رکھا جائے۔ آخر وہ خواہ مخواہ تو انکار پسند نہیں تھا۔

دوسرے دن وہ بازاروف کے ساتھ ایکس کی بستی کو روانہ ہو گیا۔ میرنیو میں نئی عمروں کے جو لوگ تھے' انہیں تو ان کے جانے کا بڑا ملال ہوا اور دونیاشا تو رونے لگی تھی..... لیکن بوڑھے لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

(12)

یہ ہمارے بانکے جس شہر ایکس کی طرف روانہ ہوئے تھے' وہ ایک نوجوان گورنر کے علاقے میں واقع تھا۔ یہ نوخیز گورنر بیک وقت ترقی پسند بھی تھا اور فرعون مزاج بھی۔ روسیوں میں یہ ہوتا چلا آیا ہے۔ اس کی حکومت کا پہلا سال ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ اس نے مارشل سے لڑائی باندھ لی۔ وہ غریب ایک پنشن یافتہ گارڈ افسر تھا' جس کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ اس کا گھوڑوں کا ایک اصطبل بھی تھا۔ مارشل ہی سے نہیں بلکہ وہ تو اپنے ماتحتوں تک سے الجھ پڑا تھا۔ اس جھگڑے نے وہ طول کھینچا کہ پیٹرسبرگ کی وزارت نے آخر کار ایک معتبر شخصیت کو یہ اختیار دے کر بھیجا کہ وہ موقع پر پہنچ کر واقعات کی تحقیق کرے۔ کولیازین کے بیٹے ماتف اِلیچ کولیازین کے نام قرعۂ فال نکلا۔ کولیازین وہی شخص ہے جو کرسانوف برادران کا سرپرست مقرر ہوا تھا۔ ماتف اِلیچ بھی ابھی جوان تھا یعنی

عمر کی چالیس منزلیں طے کئے ہوئے ابھی اسے ایسا زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا' لیکن اس کے مدبر بننے کے آثار پیدا ہو چلے تھے۔ اس کے سینے کے دونوں سمتوں میں ستارے لگے رہتے تھے جن میں سے ایک تو غیر ملکی نوعیت کا تھا اور کوئی ایسی زبردست حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ جس گورنر کے بارے میں وہ فیصلہ کرنے آیا تھا' اس کی طرح وہ خود بھی ترقی پسند گنا جاتا تھا اور اگر چہ وہ ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا مگر ممتاز شخصیتوں کا عموماً جو طور ہوتا ہے' اس کا طور اس سے مختلف تھا۔ اپنے آپ کو تو وہ نہ جانے کیا سمجھتا تھا۔ دماغ ہمیشہ عرشِ معلیٰ پہ رہتا تھا' لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ اس کا برتاؤ اچھا تھا۔ شفقت بھری نگاہوں سے دیکھتا تھا، کمال مہربانی سے بات سنتا تھا اور بڑی بے ساختگی سے قہقہے لگاتا تھا بلکہ پہلی پہلی ملاقات میں تو یہ شبہ گزرتا تھا کہ وہ بڑا ہنس مکھ آدمی ہے' لیکن وہ یہ بھی خوب جانتا تھا کہ اہم مواقع پر کس طرح اپنی حیثیت کا سکہ بٹھانا چاہیے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ''طاقت بڑی چیز ہے۔ یہ انسان کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔'' اور ان باتوں کی وجہ سے وہ عموماً مات کھا جاتا تھا اور معمولی سے تجربے کار افسر بھی اسے اپنی انگلیوں پہ نچانا شروع کر دیتے تھے۔ ماتف اپیچ گیز دکا ذکر بڑے احترام سے کرتا تھا اور ہر ایک پہ یہ جتانے کی کوشش کیا کرتا تھا کہ وہ خشک اور اکل کھرے افسروں میں سے نہیں ہے اور یہ کہ سماجی زندگی کی کوئی سرگرمی ایسی نہیں ہے جو اس کی نظر میں نہ ہو.....اس قسم کے تمام فقرے اس کی نوک زبان تھے۔ اور تو اور اپنے زمانے کے ادب کے ارتقاء پر بھی اس کی نظر تھی۔ اگر چہ یہ بھی صحیح ہے کہ اس بارے میں اس نے بڑے باوقار انداز میں بے اعتنائی بھی اختیار کر رکھی تھی۔ اس کا رویہ دراصل ان پختہ عمر والے لوگوں سے ملتا جلتا تھا جو سڑک پہ چھوٹے بچوں کا جلوس دیکھ کر کبھی کبھی اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ماتف اپیچ الگزنڈر کا زمانہ ان سیاستدانوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا' جو کوندیلاک کا ایک ایک ڈیڑھ ڈیڑھ صفحہ پڑھ کے مادام سوشین کی شام کی دعوت میں جانے کی تیاریاں کیا کرتے تھے۔ بس اس کے طریقے کچھ مختلف تھے اور ایک ذرا نیا رنگ لیے ہوئے تھے۔ وہ لے دے کے ایک چلتا پرزہ درباری اور ایک بڑا ریاکار تھا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ اس میں نہ تو معاملات کو سلجھانے کی کوئی خاص اہلیت تھی اور نہ اسے ذہن رسا ملا تھا۔ ہاں اپنے کام وہ بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتا تھا۔ اس معاملہ میں کبھی کوئی اس کے چونا نہیں لگا سکا اور

اصل بات تو یہی ہے۔

ماتف ایلیچ ارکادی سے بڑے تپاک سے ملا۔ اس طرزِ تپاک کو اس ہنس مکھ پن سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے جو روشن خیال افسروں کا خاصہ ہوتا ہے، لیکن اسے اس پہ بڑی حیرت ہوئی کہ اس نے اپنے جن بھائیوں کو مدعو کیا تھا، وہ تشریف ہی نہیں لائے۔ اپنے بڑھیا مخملی ڈریسنگ گاؤن کے پھندنوں سے کھیلتے ہوئے وہ کہنے لگا۔ ''تمہارے والد بھی دنیا سے نرالے ہیں۔'' اور اچانک وہ ایک نوجوان افسر کی طرف متوجہ ہوا جس نے ادب آداب کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی وردی کے سارے بٹن لگا رکھے تھے اور اسے غور سے دیکھ کر بولا۔ ''دیکھیے۔'' یہ نوجوان اتنی دیر سے چپ بیٹھا تھا کہ اس کے ہونٹ بھی اب سِل سے گئے تھے۔ وہ ایک ساتھ اٹھ کھڑا ہوا مگر پھر اس نے اس کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔ ہمارے اعلیٰ افسران کو یہ بڑا شوق ہوتا ہے کہ اپنے ماتحتوں کو ہڑبڑا دیں۔ اس کے لیے جو طریقے وہ استعمال کرتے ہیں، وہ مختلف قسم کے ہیں۔ منجملہ اور طریقوں کے ایک طریقہ جس کا بڑا رواج ہے یا بقول انگریزوں کے جو بہت مقبول ہے، وہ یہ ہے۔ کسی بڑے افسر پہ یکایک دورہ پڑتا ہے اور وہ بالکل بہرا بن جاتا ہے۔ آسان سے آسان لفظ سمجھنا اسے دوبھر ہو جاتا ہے۔ مثلاً وہ پوچھنے لگے گا۔ ''آج کیا دن ہے؟''

بڑے ادب سے اسے اطلاع دی جاتی ہے۔ ''حضور والا آج جمعہ ہے۔''

''ہیں؟ کیا؟ کیا دن ہے؟ کیا کہا تم نے؟'' وہ معزز اور بزرگ ہستی بڑے انہماک کے ساتھ ان الفاظ کو دہرائے چلی جائے گی۔

''اج جمعہ ہے۔ حض......و......ر والا۔''

''ہوں؟ کیا؟ جمعہ کیا ہوتا ہے؟ جمعہ کیا؟''

''جمعہ۔ ح.....ض.....ور......وا.....لا..... شکر۔ ہفتے کا اخیری دن۔''

''جی آپ مجھے سبق پڑھا رہے ہیں۔ کیوں صاب؟''

ماتف بھی آخر ایک اعلیٰ افسر تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ آزاد خیال سمجھا جاتا تھا۔

''صاحبزادے۔ میرا تمہیں مشورہ یہ ہے کہ تم گورنر صاحب سے جا کر مل لو۔'' وہ ارکادی سے کہہ رہا تھا۔ ''دیکھو یہ نہ سمجھنا کہ چونکہ میں ان دقیانوسی خیالات کا شکار ہوں کہ

حکام کو سلامی دینا بڑا ضروری ہوتا ہے' اس لیے میں تم سے یہ کہہ رہا ہوں۔ نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ گورنر صاحب بڑے معقول آدمی ہیں۔ پھر اس کے علاوہ شاید تم یہاں کے لوگوں سے میل ملاقات چاہتے ہو..... اور میرا خیال ہے کہ تم اجڈ تو ہو نہیں۔ پرسوں ان کے یہاں ناچ کی ایک محفل بہت دھوم سے ہونے والی ہے۔"

ارکادی پوچھنے لگا۔ "آپ ناچ میں تشریف لے جائیں گے؟"

ماتف اِلیچ نے ایک ذرا درد بھرے لہجہ میں کہا۔ "یہ محفل میری خاطر ہی منعقد ہو رہی ہے۔ تم ناچنا تو جانتے ہو گے؟"

"جی یونہی کچھ الٹا سیدھا ناچ لیتا ہوں۔"

"یہ تو افسوس کی بات ہے۔ یہاں سانولی سلونی لڑکیاں ہیں اور آدمی جوان ہو کر نہ ناچے یہ تو سراسر اس کے لیے گری ہوئی بات ہے۔ یہ بھی میں دقیانوسی خیالات سے متاثر ہو کر نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں ہرگز یہ نہیں سمجھتا کہ آدمی کی ساری ذہانت و براقی اس کے پیروں کی گردش میں محدود ہوتی ہے' لیکن بائرن پرستی بھی تو خاصی مضحکہ خیز چیز ہے۔"

"لیکن چچا جان اس میں بائرن پرستی کو دخل نہیں ہے۔ میں....."

ماتف اِلیچ بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "میں وہاں خواتین سے تمہارا تعارف کراؤں گا۔ تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں گا۔ دیکھنا وہاں کتنی گہما گہمی ہے۔"

نوکر نے آ کر اطلاع دی کہ سرکار زمینوں کے ناظم صاحب آئے ہیں۔ ناظم صاحب بیچارے بوڑھے آدمی تھے۔ آنکھوں سے نرمی اور شرافت ٹپکتی تھی۔ دہن کے گرد گہری گہری سلوٹیں سی پیدا ہو گئی تھیں۔ قدرتی مناظر کے رسیا تھے اور بہار کے نظاروں پر تو جان دیتے تھے۔ اس موسم میں تو بقول ان کے "چھوٹی موٹی مکھیاں بھی چھوٹے سے چھوٹے پھول سے بھی تھوڑی بہت رشوت ضرور لے مرتی ہیں۔" ارکادی وہاں سے چلا آیا۔

سرائے میں پہنچ کر جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے' وہ بازاروف سے ملا اور بڑی دیر تک وہ اسے اس پہ اکساتا رہا کہ وہ اس کے ہمراہ گورنر کے یہاں چلے۔ آخر بازاروف نے کہہ ہی دیا کہ "خیر مجبوری ہے کیا کیا جائے۔ جب گڑ کھا لیا ہے تو پھر گلگلوں کا پرہیز بھی تو توڑ ہی دیں۔ ہم امیروں کا رنگ دیکھنے آئے ہیں تو پھر ان کا رنگ دیکھنا ہی چاہیے۔"

گورنر صاحب یوں ان سے بڑے اخلاق سے ملے لیکن انہوں نے نہ تو ان سے بیٹھنے کو کہا اور نہ خود بیٹھے۔ ٹک کر وہ بیٹھتے ہی کب تھے۔ ہمیشہ سٹر پٹر کرتے رہتے تھے۔ صبح ہوئی اور چست سی وردی اور کلف دار گلو بند پہن تیار ہو گئے۔ اطمینان سے بیٹھ کر کھانا پینا تو ان کی قسمت ہی میں نہ تھا۔ وہ غریب تو ہمیشہ انتظامات کی فکروں میں گرفتار رہتے تھے۔ انہوں نے کرسانوف اور بازاروف کو محفل رقص میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ چند منٹ ہوئے ہوں گے کہ انہوں نے دوبارہ دعوت دے ڈالی اور اس مرتبہ یہ ستم کیا کہ انہیں بھائی بھائی تصور کیا اور کساروف کہہ کر خطاب کیا۔

گورنر کے یہاں سے وہ گھر واپس جا رہے تھے۔ اتنے میں ایک ٹھگنا سا آدمی سلادینی قومی لباس پہنے ایک گاڑی سے جو ان کے قریب سے نکلی جا رہی تھی' لپک کر نکلا اور یوگین وسل یوچ چلّاتا ہوا دوڑا اور اس سے لپٹ گیا۔

''اچھا تم ہو بیر ستنی خوف' لیکن تم یہاں کیسے آن ٹپکے؟'' اس گفتگو کے باوجود بازاروف کی چال میں فرق نہیں آیا تھا۔

''بالکل اتفاق سے آ گیا ہوں۔'' یہ جواب دے کر وہ گاڑی کی طرف پلٹا۔ اس نے کئی مرتبہ ہاتھ ہلایا اور چلّا کر کہنے لگا۔ ''ذرا ہمارے ساتھ آیئے۔ والد صاب یاں ایک کام سے آئے تھے۔'' اس وقت وہ ایک نالی سے پھلانگ رہا تھا۔ ''ساتھ میں وہ مجھے لے آئے... آج مجھے پتہ چلا کہ آپ بھی یہاں آئے ہوئے ہیں۔ میں آپ سے ملنے گیا بھی تھا......'' (اور یہ واقعہ ہے کہ جب یہ دونوں دوست واپس اپنے کمرے میں پہنچے تو وہاں ایک کارڈ رکھا تھا جس کے کونے مڑے ہوئے تھے۔ اس پہ ایک طرف فرانسیسی میں اور دوسری طرف سلادینی رسم الخط میں سیتنی خوف کا نام لکھا ہوا تھا) ''میرا خیال ہے کہ آپ گورنر صاب کے یہاں سے تو نہیں آ رہے ہیں؟''

''اس قسم کا خیال کرنے سے فائدہ۔ ہم سیدھے اسی کے یہاں سے آ رہے ہیں۔''

''اچھا تو پھر میں بھی اس سے ملنے چلا جاؤں گا۔ یوگین وسل یوچ میرا اپنے... تو تعارف......''

''کرسانوف۔ سیتنی خوف۔'' بازاروف منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ اس کے قدم پھر

بھی نہیں رکے تھے۔

''بڑی خوشی ہوئی' آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' سیتنی خوف ایک طرف کو چل رہا تھا اور بڑے مصنوعی سے انداز میں مسکرار ہا تھا۔ اپنے دستانوں کو جو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی بڑھیا نظر آرہے تھے' وہ بار بار درست کرتا تھا۔ ''میں نے آپ کے متعلق بہت کچھ سن .... یف گین وسل یوچ سے میری بہت پرانی ملاقات ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ میں ان کا شاگرد ہوں۔ ان کی عنایت سے میری زندگی کا چولا بدل گیا....''

ارکادی نے بازاروف کے شاگرد کو غور سے دیکھا۔ اس کے بنے سنورے چہرے کے ننھے منے اور خوشگوار خدوخال سے اضطراب کے آثار نمایاں تھے اور کچھ یہ بھی تاثر پیدا ہوتا تھا کہ وہ ٹھس آدمی ہے۔ اس کی بٹن سی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ایک قسم کی بے چینی کی غمازی کر رہی تھیں۔ یہ بے چینی اس کی ہنسی میں جھلک رہی تھی اور اس کی ہنسی بھی کچھ بڑی خشک سی تھی۔

وہ کہنے لگا۔ ''آپ یقین کیجیے کہ جب یوگین وسل یوچ نے پہلی مرتبہ میرے سامنے یہ فرمایا کہ کسی کو سند ماننا سرے سے غلط ہے تو میرے قلب میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا...... میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں سوچنے لگا کہ میں نے بالآخر ایک شخصیت کو ڈھونڈ پایا ہے۔ ہاں یوگینی وسل یوچ مجھے ایک بات یاد آ گئی۔ یہاں ایک خاتون ہیں۔ آپ ان سے ضرور ملئے گا۔ وہ آپ کی باتوں کو سمجھنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ آپ ان کے یہاں جائیں گے تو بس یہ سمجھئے کہ ان کے گھر عید ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے ان کا ذکر سن رکھا ہے؟''

''کون ہیں وہ؟'' بازاروف نے کچھ بیزار ہو کر یہ سوال کیا تھا۔

''کوکشینا۔ ایوو دکزیا کوکشین۔ عجب عادت کی عورت ہے۔ یوں سمجھئے کہ صحیح معنوں میں آزاد خیال عورت ہے۔ اچھا دیکھئے۔ ہم سب مل کر ان سے ملنے چلیں گے۔ بس یہاں سے دو قدم کے فاصلہ پر ان کا مکان ہے۔ کھانا وہیں اڑے گا۔ میرا خیال ہے کہ ابھی آپ نے کھانا نہیں کھایا ہے؟''

''نہیں۔ ابھی تو نہیں کھایا۔''

''خوب۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔ دیکھئے اس نے اپنے شوہر سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ وہ کسی کی دست نگر نہیں ہے۔''

''خوبصورت بھی ہے؟'' بازاروف بات کاٹتے ہوئے بولا۔
''ن.... نہیں۔اسے خوبصورت تو نہیں کہا جا سکتا۔''
''تو پھر کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے کہ ہمیں وہاں لیے چل رہے ہو؟''
''صاحب۔وہاں ذرا دل لگی رہے گی.... ہمیں وہ شمپین پلائے گی۔''
''اچھا یہ بات ہے۔ مطلبی آدمی تو ہاتھ کے ہاتھ اپنا ڈھنڈورا پیٹ دیتا ہے۔اچھا یہ بتاؤ تمہارے والد اب تک شراب کا کاروبار کرتے ہیں؟''
''جی ہاں۔'' سیتنی خوف جلدی سے یہ کہہ کر بے تحاشا زور سے ہنس پڑا۔''اچھا آپ رئیں گے؟''
''کہہ نہیں سکتا۔''
''آپ لوگوں کو دیکھنا چاہتے تھے نا۔تو آپ جائیں۔'' ارکادی نے بہت آہستہ سے کہا۔
سیتنی خوف بات کاٹتے ہوئے بولا۔''اور مسٹر کرسانوف آپ اس میں کیا کہتے ہیں۔آپ کو بھی چلنا پڑے گا۔بغیر آپ کے ہم بھلا کیسے جا سکتے ہیں؟''
''لیکن ہم یکا یک ان کے یہاں کیسے جا دھمکیں؟''
''یہ کوئی بات نہیں ہے۔کوکشینا تو بڑی مہمان نواز عورت ہے۔''
''شیمپئن کی بوتل ملے گی؟'' بازاروف نے سوال کیا۔
سیتنی خوف چلا کر بولا۔''ایک نہیں تین۔یہ میری ضمانت رہی۔''
''کیا ضمانت دیتے ہو؟''
''میرا سر حاضر ہے۔''
''تمہارے والد کی تجوری ہوتو زیادہ اچھا ہے۔بہر حال ہم چل رہے ہیں۔''

(13)

اندوتیا نکشینا یا ایودوکزیا کوکشین جس گھر میں رہتی تھی، وہ ماسکو کے طرز کا بنا ہوا

ایک چھوٹا سا مکان تھا اور ایکس کی ایک گلی میں واقع تھا۔ ابھی چند دن ہوئے اس گلی کو آگ لگ گئی تھی۔ خیر یہ تو سب جانتے ہیں کہ ہمارے قصبوں میں ہر پانچ سال کے بعد ایک مرتبہ آگ ضرور لگ جایا کرتی ہے۔ دروازے پہ ایک طرف ملاقاتی کارڈ ترچھے انداز میں کیل سے ٹھکا ہوا لٹک رہا تھا۔ اس سے اوپر گھنٹی کا بٹن دکھائی دے رہا تھا۔ آنے جانے والوں سے نبٹنے کے لیے ہال میں ٹوپی پہنے ایک عورت کھڑی تھی جسے صحیح طور پر خادمہ تو نہیں کہا جا سکتا تھا۔ دراصل اس کا حلیہ اس گھر کی خاتون کے ترقی پسندانہ میلانات کی طرف صاف اشارہ کرتا تھا۔ سیتنی خوف پوچھنے لگا کہ آیا اندوتیا نکشینا گھر پر ہی ہیں۔

برابر کے کمرے سے ایک تیز اور باریک سی آواز آئی۔ ''آپ ہیں وکٹر؟ اندر آجایئے نا۔''

ٹوپی والی عورت وہاں سے فوراً کھسک گئی۔

''میں اکیلا نہیں ہوں۔'' سیتنی خوف نے یہ کہتے ہوئے ارکادی اور بازاروف کو تیزی سے دیکھا اور بڑی پھرتی سے اپنا اوورکوٹ درست کیا۔ اس کے اندر سے کوچوانوں کی مخملی جیکٹ قسم کی ایک چیز صاف نظر آ رہی تھی۔

جواب میں وہ آواز پھر بلند ہوئی۔ ''کوئی ہرج نہیں ہے۔ تشریف لے آیئے۔''

یہ لوگ اندر داخل ہو گئے۔ جس کمرے میں وہ داخل ہوئے تھے' وہ ڈرائنگ روم سے زیادہ دفتری کمرہ معلوم ہوتا تھا۔ گرد آلود میزوں پر کاغذات' خطوط' ضخیم روسی رسالے جن میں سے اکثر جوں کے توں بند تھے' بڑی بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے۔ جدھر دیکھئے سگریٹ کے جلے ہوئے سفید ٹکڑے پڑے ہیں۔ چمڑے کے غلاف والے ایک صوفے پر ایک خاتون دراز تھی۔ یہ خاتون ابھی جوان ہی تھی۔ اس کے خوبصورت بال ایک ذرا بگڑ گئے تھے۔ اس نے ایک ریشمیں گاؤن پہن رکھا تھا' جو ایسا بہت اجلا نہیں تھا۔ اس کے سر پر ایک رومال پڑا تھا اور چھوٹے چھوٹے بازوؤں پر بھاری بھاری برسلیٹ پہنے ہوئے تھی۔ وہ صوفے سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور بڑی لاپروائی سے اُس نے وہ مخملی ٹوپی اتاری' جس کی زردی مائل جھالر اس کے شانوں پر پڑی تھی اور مضمحل سے انداز میں بولی ''آداب ڈاکٹر صاحب'' اور سیتنی خوف کا ہاتھ دبایا۔

اُس نے بازاروف کی نقالی کرتے ہوئے بے تکے سے انداز میں کہا ''بازاروف۔ کرسانوف' بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' مادام کوکشین کی آنکھیں بازاروف پر جم گئیں۔ ان دو چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے درمیان ایک چھوٹی سی سرخ چپٹی ناک دھری تھی۔ اس نے بازاروف سے کہا۔ ''آپ سے واقف ہوں'' اور یہ کہہ کر اس کا ہاتھ بھی دبایا۔

بازاروف پر جھلاہٹ سوار ہوگئی۔ اس آزاد عورت کی مختصر سی شخصیت میں کوئی چیز ایسی نفرت انگیز تو نظر نہیں آتی تھی۔ البتہ اس کے چہرے کی ناخوشگوار کیفیت دیکھنے والے پر ایک ناخوشگوار اثر چھوڑتی تھی۔ اسے دیکھ کر خواہ مخواہ یہ پوچھنے کو جی چاہتا تھا ''کیا بات ہے' آپ کو کھانے کو نہیں ملا ہے؟ یا دشمنوں کا مزاج مکدر ہے؟ یا آپ پہ جھینپ سوار ہے؟ آخر آپ بےکل کیوں ہوئی جارہی ہیں؟'' وہ اور ستینی خوف دونوں ہمیشہ اسی بےکلی میں مبتلا نظر آتے تھے۔ یوں وہ انتہائی بے تکلفی برتتی تھی' لیکن اسی کے ساتھ اس کی حرکات میں ایک اکھڑا اکھڑا پن بھی تھا۔ وہ اپنے آپ کو یہ سمجھتی تھی کہ وہ بڑی بھولی بھالی سیدھی سادی ہے' لیکن اس کے باوجود اس کی ہر حرکت ہر کام کو دیکھ کر یہ گمان گزرتا تھا کہ اس کا نشانہ چوک گیا ہے۔ وہ کچھ اور کرنا چاہتی تھی۔ اس کی حرکات سادہ اور بے ساختہ تو کبھی بھی نہیں ہوتی تھیں۔ ان کی تہہ میں ہمیشہ ارادہ کام کرتا نظر آتا تھا۔

''جی' جی بازاروف صاحب میں آپ سے خوب واقف ہوں۔'' (ماسکو کی بہت سی خواتین کی طرح اس میں بھی یہ عادت تھی کہ ملاقات کے پہلے ہی دن سے ملاقاتیوں کو ان کے لقب سے مخاطب کرنا شروع کردیتی تھی) ''سگار پیش کروں؟''

''سگار تو خیر پیتے ہی رہیں گے'' ستینی خوف بیچ میں بول اُٹھا۔ اس وقت وہ کرسی میں بیٹھا جھول رہا تھا اور اس کی ٹانگیں ہوا میں تیر رہی تھیں۔ ''ہمیں کچھ کھانا وانا تو کھلوائیے۔ بھوک کے مارے اپنا دم نکلا جارہا ہے۔ اور ہاں یہ بھی کہ شیمپین کی ایک چھوٹی سی بوتل بھی ہو۔''

''پرلے درجے کے عیاش ہو۔'' اندوتیا اس جملے کے ساتھ ساتھ ہنس پڑی۔ (جب وہ ہنستی تھی تو اس کے اوپر کے دانتوں کے مسوڑھے صاف نظر آنے لگتے تھے)۔

''کیوں یہ کچھ غلط ہے کیا۔ یہ عیاش نہیں ہیں؟''

ستینی خوف نے بڑے باوقار انداز میں کہا ''میں زندگی میں چین آرام کا قائل ہوں۔ اس سے میرے آزاد خیال ہونے میں فرق نہیں پڑتا۔''

''نہیں، اس سے فرق پڑتا ہے۔ بہت فرق پڑتا ہے۔'' اندوتیا گرم ہو کر بولی۔ لیکن ساتھ میں اس نے خادمہ کو بلا کر کھانے اور شیمپئن دونوں کے متعلق ہدایات بھی دے دی تھیں۔

بازاروف کی طرف متوجہ ہو کر وہ کہنے لگی ''آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے متفق ہیں۔''

بازاروف نے تڑ سے جواب دیا ''جی نہیں، کیمیاوی نقطہ نظر سے دیکھئے تو بھی گوشت کی بوٹی روٹی کے ٹکڑے سے لاکھ درجہ بہتر ہے۔''

''آپ کیمسٹری پڑھ رہے ہیں؟ کیمسٹری سے مجھے عشق ہے۔ میں نے ایک نئے قسم کا مرکب بھی تیار کیا ہے۔''

''مرکب؟ آپ نے؟''

''جی! اور بتاؤں کس لئے؟ گڑیوں کے سر بنانے کے لیے تاکہ وہ ٹوٹیں پھوٹیں نہیں۔ دیکھئے نا میں تو بڑی عملی قسم کی عورت ہوں، لیکن پورا معاملہ ابھی تیار نہیں ہوا ہے۔ لائی بگ کو پڑھنا ابھی باقی ہے۔ ہاں آپ نے 'ماسکو گزٹ' میں عورتوں کی محنت مزدوری کے بارے میں کسلیا خوف کا مضمون پڑھا ہے۔ آپ اسے پڑھئے گا۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو عورتوں کے مسئلے سے تو دلچسپی ہے؟ اور اسکولوں کے مسئلہ سے بھی؟ یہ آپ کے دوست کیا کرتے ہیں؟ آپ کی تعریف؟''

مادام کوکشین نے تابڑ توڑ سوال کر ڈالے۔ اس نے اپنے انداز میں بے اعتنائی سی پیدا کر لی تھی۔ چنانچہ کسی بھی سوال پر اس نے جواب کے لیے دم لینا مناسب نہ سمجھا۔ دراصل ہٹیلے بچے اپنی اناؤں سے اسی انداز میں باتیں کیا کرتے ہیں۔

ارکادی بولا ''میرا نام ارکادی نکولائچ کرسانوف ہے اور میں کرتا ورتا کچھ نہیں ہوں۔''

اندوتیا منمنانے لگی۔ ''خوب' خوب! جی آپ سگریٹ نہیں پیتے کیا؟ وکٹر دیکھو جی ہم تم سے خفا ہیں۔''

''آخر کیوں؟''

''میں نے سنا ہے تم نے پھر جارج ساں کی قصیدہ خوانی شروع کر دی ہے۔ اس کی حیثیت کیا ہے۔ وہ تو زوال پسند عورت ہے۔ بھلا اس کا اور ایمرسن کا کیا مقابلہ۔ تعلیم' طبیعات غرض کسی چیز کے بارے میں بھی تو وہ کچھ نہیں جانتی۔ میرا خیال ہے کہ علم الجنین کا تو اس نے نام بھی نہیں سنا ہوگا اور اسے نظر انداز کر کے تو کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔'' (اندوتیا نے اس موقع پر اپنے ہاتھ بھی جھٹکے)۔

''واہ' واواہ۔ ایلسی وچ نے اس موضوع پہ کس غضب کا مضمون لکھا ہے۔ وہ بھلا آدمی بڑا ذہین ہے۔'' (اندوتیا 'آدمی' کے بجائے ''بھلا آدمی' بار بار کہے جا رہی تھی۔)

''بازاروف صاحب آپ یہاں میرے پاس صوفے پر آ جائیں۔ آپ کو شاید یہ پتہ نہیں کہ میں آپ سے بہت ڈرتی ہوں۔''

''اجازت ہو تو پوچھوں کہ آخر کیوں؟''

''آپ بھلے آدمی بڑے خطرناک ہیں۔ آپ کی تنقید سے خدا بچائے۔ لاحول ولاقوۃ میں بھی گنواریوں کی طرح کیا فضول بک رہی ہوں۔ خیر میں گنواری تو ہوں ہی۔ اپنی جائداد کی دیکھ بھال میں خود کرتی ہوں۔ ہمارا ایک کارندہ ہے' ایروفے۔ عجیب شے ہے۔ بے تکلفی تو اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ میں تو یہاں مستقل طور پر رہ پڑی ہوں۔ بڑی خراب جگہ ہے۔ ہیں نا؟ لیکن کیا کیا جائے؟''

بازاروف نے بڑی سرد مزاجی سے جواب دیا ''جیسے اور قصبے ہوتے ہیں' ویسا ہی یہ بھی قصبہ ہے۔''

''یہاں کی دلچسپیوں میں بڑا گھٹیا پن ہے۔ بس یہ چیز ہے جو بڑی تکلیف دہ ہے۔ جاڑے میرے ماسکو میں گزرا کرتے تھے..... مگر اب میرے شوہر موسیو کوکشین وہاں رہتے ہیں اور اس کے علاوہ ماسکو بھی اب..... ویسے مجھے وہاں کا علم تو نہیں ہے۔ مگر اب وہاں وہ پہلے والی بات کہاں۔ میں تو یہاں سے باہر جانے کا ارادہ کر رہی ہوں۔ پچھلے سال

تو میں اٹھ ہی کھڑی ہوئی تھی۔ بس جاتے جاتے رہ گئی۔

''پیرس کو؟ ہیں نا؟'' بازاروف نے سوال کیا۔

''پیرس کو اور ہائیڈل برگ کو۔''

''ہائیڈل برگ کو کیوں؟''

''آپ بھی کیا سادہ ہیں؟ صاحب وہاں بونسین رہتے ہیں۔''

اب اس بات کا بیچارہ بازاروف کیا جواب دیتا۔

''اور سیفوزنیخوف..... آپ ان سے واقف ہیں؟'

''جی نہیں! میں ان سے واقف نہیں۔''

''آپ سیفوزنیخوف سے واقف نہیں..... لیڈیا ہستانوف کے یہاں وہ ہمیشہ ملتے ہیں۔''

''میں اُن محترمہ کو بھی نہیں جانتا۔''

''خیر تو یہ ان کی عنایت تھی کہ انہوں نے مجھے بچایا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اب میں آزاد ہوں، بال بچوں کی پخ بھی نہیں ہے..... اوہ میں کیا کہہ گئی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے، خیر اگر کہہ بھی دیا تو اس میں رکھا کیا ہے۔''

اندوتیا نے اپنی انگلیوں میں جو تمباکو کے دھوئیں سے رچ کر زرد پڑ چکی تھیں، سگریٹ گھمایا اور اسے ہونٹوں میں دبا کر پینا شروع کر دیا۔ اتنے میں خادمہ ٹرے لیے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

''لیجیے، کھانا آ گیا۔ پہلے تو آپ بھوک کو تیز کرنے والی چیز نوش کریں گے نا؟ وکٹر بوتل کھولو، یہ کام تمہارا ہے۔''

''جی ہاں! یہ کام میرا ہے۔'' سیتنی خوف بڑبڑانے لگا اور یکا یک پھر اس پہ ہنسی کا دورہ پڑا۔

بازاروف جب تیسرا گلاس بھی چڑھا چکا تو پوچھنے لگا ''یہاں خوبصورت عورتیں بھی ہیں؟''

''جی ہیں تو سہی۔'' اندوتیا نے جواب دیا ''لیکن سب کی سب کوڑھ مغز ہیں۔

مثلاً اودِن تسوف چہرے مہرے سے اچھی خاصی ہے۔ بدقسمتی سے وہ ایک ذرا بدنام بھی ہے..... خیر اس میں کیا رکھا ہے، لیکن آزادخیالی تو اسے چھو کر نہیں گئی ہے۔ اس کے خیالات میں نام کو..... دراصل تعلیم کا پورا نظام تبدیلی چاہتا ہے۔ میں نے اس پر بہت سوچا ہے۔ ہماری عورتوں کی تعلیم کا ڈھرّا بہت بگڑا ہوا ہے۔"

سیتنی خوف بات کاٹتے ہوئے بولا "اجی ان کا کوئی علاج نہیں ہے۔ بس ان سے تو نفرت کرنی چاہیے اور میں بھرپور طریقے سے اور پوری شدت سے ان سے نفرت کرتا ہوں۔" (نفرت کے احساس اور اظہار کے امکان کی کیفیت سیتنی خوف کو بہت بھلی لگتی تھی۔ اور عورتوں پہ تو وہ جی بھر کے برستا تھا۔ اُس غریب کو اس قسمت کے لکھے کی کیا خبر تھی کہ چند مہینے بعد اسے اپنی بیوی کے سامنے ناک رگڑنا پڑے گی اور محض اس وجہ سے کہ وہ شہزادی دادالیوسوف ہے)۔ "ان میں سے ایک بھی تو اس قابل نہیں ہے کہ ہماری گفتگو سمجھ سکے۔ کوئی ایک بھی اس لائق نہیں ہے کہ ہم جیسے سنجیدہ آدمی اس کا ذکر کریں۔"

بازاروف بولا "مگر اس کی ضرورت بھی کیا ہے کہ وہ ہماری گفتگو سمجھیں۔"

اندوتیا بیچ میں بول پڑی "آپ کا مطلب کن سے ہے؟"

"خوبصورت عورتوں سے۔"

"اچھا؟ تو آپ پرودان کے نظریات کے قائل ہیں؟"

بازاروف نے تنک کر جواب دیا "میں کسی کے نظریات کا قائل نہیں ہوں۔ میرے اپنے نظریات ہیں۔"

"اساتذہ کی ایسی تیسی۔" سیتنی خوف چلّا کر بولا۔ اسے اس کی خوشی تھی کہ جس شخص کی وہ ہمیشہ جوتیاں سیدھی کرتا رہا تھا، آج اس کے سامنے اسے جرأت سے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ملا ہے۔

"لیکن میکالے بھی تو....." مادام کوکشین نے بات شروع ہی کی تھی کہ سیتنی خوف پھر گرجنے لگا۔ "میکالے کی ایسی تیسی۔ کن بیہودہ لغولوگوں کی تم حمایت کر رہی ہو؟"

"بیہودہ لغولوگوں کی نہیں، بلکہ حقوقِ نسواں کی۔ جس کے لیے میں نے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہادینے کی قسم کھائی ہے۔"

''ایسی تیسی۔''لیکن یہاں آ کر سیتنی خوف ٹھٹک گیا۔''لیکن میں اس کا مخالف نہیں ہوں۔''

''نہیں۔ میں سمجھتی ہوں آپ سلادفیل ہیں۔''

''نہیں میں سلادفیل تو نہیں ہوں۔ ہاں یہ درست ہے.....''

''نہیں نہیں! آپ سلادفیل ہیں۔ آپ بزرگ شاہی کے علمبردار ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے ہاتھ میں کوڑا رہے۔''

بازاروف بولا''کوڑا تو بڑی نفیس چیز ہے' مگر لیجیے ہم تو تلچھٹ بھی پی گئے۔''

''کس کی تلچھٹ؟''اندوتیا چونک کر بولی۔

''محترمہ اندوتیا نکشینا۔ شیمپیئن کی تلچھٹ۔ آپ کے خون کی تلچھٹ نہیں۔''

اندوتیا نے پھر اپنی ہانکنی شروع کردی۔''جب عورتوں پر حملہ کیا جاتا ہے' تو پھر میں اطمینان سے کوئی بات سن نہیں سکتی۔ میں کہتی ہوں کہ آپ یوں حملے نہ کریں' بلکہ مائکلے کی کتاب ''محبت کے بارے میں'' پڑھیں۔ غضب کی کتاب ہے۔ اچھا بھلے آدمیو! اب عشق ومحبت کی باتیں کرو۔''اور ان الفاظ کے ساتھ ساتھ اندوتیا نے اپنے بازو ڈھیلے چھوڑ کر صوفے کے سلوٹوں والے گدے پر ڈال دیئے۔

یکا یک کمرے میں خاموشی چھا گئی۔''آخر ہم عشق و محبت کی باتیں کیوں کریں؟'' بازاروف کہنے لگا۔''لیکن ہاں ابھی آپ نے مادام اودِن تسوف کا ذکر کیا تھا۔ یہی نام لیا تھا نہ آپ نے؟ یہ کون ذات شریف ہیں؟''

''بڑی حسین وجمیل عورت ہے۔''سیتنی خوف چہکنے لگا۔''میں اس سے آپ کا تعارف کراؤں گا۔ عقلمند ہے' دولت مند ہے' بیوہ ہے۔ افسوس کی بات بس یہ ہے کہ غریب زیادہ آزاد خیال نہیں ہے۔ اسے ابھی ہماری اندوتیا کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے چاہئیں۔ اندوتیا تمہاری صحت کے نام پر ایک جام۔''

''وکٹر تم فضول آدمی ہو۔''

کھانے وانے کا سلسلہ خاصی دیر جاری رہا۔ شیمپیئن کی پہلی بوتل کے بعد دوسری بوتل خالی ہوئی' پھر تیسری اور پھر چوتھی بھی..... اندوتیا کی زبان قینچی کی طرح چلے جارہی

تھی۔ سیتنی خوف ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ شادی آیا ایک خناس ہے یا کوئی جرم ہے اور آیا انسان سب برابر ہیں یا نہیں اور انفرادیت کس چیز سے عبارت ہے.....ان سوالات پر بڑی گرماگرم بحث رہی۔ شراب نے اندوتیا پہ ایک کیفیت طاری کردی تھی۔ اس نے ایک بے سُرے پیانو کے باجے پر انگلیاں پھیرنی شروع کردیں۔ اس نے اپنی پھٹی ہوئی آواز میں پہلے تو خانہ بدوشوں کے گیت گانے شروع کئے تھے۔ مگر بعد میں سیمورشف کا گیت ''غرناطہ پہ غنودگی طاری ہے'' گانا شروع کردیا اور سیتنی خوف نے اپنے سر پہ گلوبند لپیٹ رکھا تھا اور اِن مصرعوں کو ادا کرکر کے دم توڑتے ہوئے عاشق کا پارٹ ادا کررہا تھا۔

''اور تیرے ہونٹ میرے ہونٹوں میں
ایک تپتا ہوا بوسہ بن کر پیوست ہوگئے ہیں''

ارکادی سے آخر برداشت نہ ہوسکا۔ اس نے اونچی آواز سے کہا ''بھائی لوگو! اب تو یہاں پاگل خانے کی سی فضا پیدا ہوچلی ہے۔'' بازاروف نے اس پوری گفتگو میں اتفاقیہ طور پر کوئی طنزیہ فقرہ کہا ہو تو کہا ہو' ورنہ وہ شیمپین میں زیادہ مصروف رہا تھا۔ ارکادی کا فقرہ سن کر اس نے بلند آواز سے جمائی لی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ میزبان سے دعا سلام کیے بغیر وہ ارکادی کے ساتھ باہر ٹہل گیا۔ سیتنی خوف بھی وہاں سے نکلا اور ان کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ کبھی وہ ان کے بائیں ہاتھ پر چلتا تھا اور کبھی پھدک کر دائیں ہاتھ پر پہنچ جاتا تھا۔ پھر وہ پوچھنے لگا۔ ''اچھا اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ ستم کی عورت ہے۔ کاش ایسی عورتیں چند ایک اور ہوتیں۔ وہ بھی اپنے طور پر بلند ترین اخلاق کا مظاہرہ ہے۔''

''اور آپ کے باوا جان کا کاروبار بھی تو بلند ترین اخلاق ہی کا مظاہرہ ہے؟'' بازاروف نے یہ فقرہ ایک تاڑی کی دکان کی طرف اشارہ کرکے کہا تھا' جو چلتے چلتے اس وقت ان کی راہ میں آ گئی تھی۔

سیتنی خوف پہ پھر ہنسی کا دورہ پڑا۔ اس کی اصلیت پہ جو چوٹ ہوئی تھی' اس سے وہ بہت جھینپا۔ وہ یہ طے نہیں کرسکا کہ بازاروف کی اِس غیر متوقع بے تکلفی پہ خفگی کا اظہار کیا جائے' یا فخر محسوس کیا جائے۔

(14)

چند دن بعد گورنر صاحب کے یہاں محفل رقص منعقد ہوئی۔ ماتف اپیچ اس برات کے دولہا تھے۔ مارشل صاحب نے تو بھرے مجمع میں ایک ایک سے یہ بات کہی کہ جناب میں تو صرف ان کی خاطر یہاں آ گیا ہوں۔ اور گورنر صاحب کی کیفیت یہ تھی کہ رقص گاہ میں بھی اور ایسی حالت میں کہ وہ بالکل جامد وساکت بیٹھے تھے' انتظام میں مصروف نظر آ رہے تھے۔ ماتف اپیچ کی شکل پہ جس حد تک حلم ومروّت کے آثار تھے' اسی حد تک وقار بھی ٹپک رہا تھا۔ وہ ہر ایک سے بڑے اخلاق سے مل رہا تھا۔ بعض لوگوں سے ملتے وقت اس اخلاق میں کراہیت کی جھلک آ جاتی تھی اور بعض لوگوں سے ملتے وقت اس میں عزت و احترام کا رنگ پیدا ہو جاتا تھا۔ فرانسیسی بیگمات اور خواتین کو دیکھ کر تو وہ بچھ بچھ جاتا تھا۔ بھرپور اور جھنکاردار قہقہے وہ اس شان سے لگا رہا تھا' جو ایک اعلیٰ عہدیدار کے شایانِ شان ہے۔ ارکادی کی اس نے پیٹھ ٹھونکی اور بلند آواز سے اسے 'بھتیجا' کہہ کر پکارا۔ بازاروف جو ایک پرانا سا کوٹ پہنے ہوئے تھا' اس پر اس نے ایک اڑتی ہوئی سی نگاہ ڈالی۔ اُس کے حلق سے آواز بھی نکلی تھی۔ یوں وہ بڑی غیر واضح آواز تھی' لیکن اس میں شفقت کا اظہار تو یقیناً تھا۔ الجھی ہوئی آوازوں کے اس پورے سلسلے میں بس چند الفاظ الگ سنائی دیئے —— ''میں.....'' اور ''بہت زیادہ''۔ سیتنی خوف کی طرف بھی اس نے ایک انگلی بڑھا دی تھی' بلکہ ساتھ میں مسکرایا بھی تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی توجہ دوسری طرف تھی اور تو اور اس نے مادام کوکشین کو بھی نوازا۔ مادام کوکشین بھی عجب حلیہ سے ہال میں تشریف لائی تھیں۔ میلے دستانے' سائے کا استر غائب۔ لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ رقص کرنے والوں کی بھی ریل پیل تھی۔ شہری لوگ تو زیادہ تر دیواروں سے لگے کھڑے تھے' لیکن افسر لوگ بہت بن بن کر رقص کر رہے تھے اور ان میں سے ایک افسر نے تو حد کر رکھی تھی۔ دراصل وہ چھ ہفتے کہیں پیرس میں گزار آیا تھا اور وہاں سے اس نے فرانسیسی کے چند منتخب جملے رٹ رکھے تھے اور اب وہ انہیں غلط سلط دُہرا رہا تھا۔

یہ تو ہمیں پتہ ہے ہی کہ ارکادی ناچ بس واجی واجی ہی جانتا تھا اور بازاروف تو ناچ کے نام صفر تھا۔ یہ دونوں ایک کونے میں نشست باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ سیتنی خوف بھی ان کے برابر آ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے چہرے پہ نفرت کی جو کیفیت ظاہر کی تھی' اس میں برتری کا احساس بھی شامل تھا۔ وہ نفرت بھرے فقرے کہتا جاتا تھا اور بڑی تمکنت سے اپنے اردگرد نظریں دوڑا رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے اِس طرزِ عمل سے واقعی لطف اندوز ہو رہا ہے۔ ایکا ایکی اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔ ارکادی کی طرف متوجہ ہو کر کچھ گھبراہٹ کا اظہار کرتے ہوئے اس نے کہا کہ ''اودن تسوف آ گئی۔''

ارکادی کیا دیکھتا ہے کہ سیاہ ملبوس میں ایک بلند قامت عورت کمرے کے دروازے میں کھڑی ہے۔ اس کے ڈیل ڈول میں جو ایک وقار تھا' اس سے وہ بہت مرعوب ہوا۔ پتلی کمر کے دونوں طرف دو برہنہ شانے بڑے بناؤ سے لہرا رہے تھے۔ وہی بناؤ اس ہلکی پھلکی جھالر سے بھی ظاہر تھا' جو اس کے چمکدار بالوں سے لٹک کر اس کے ڈھلوان شانوں کو چھو رہی تھی۔ اس کی روشن آنکھیں پلکوں کے سفید پردوں سے جھانکتی ہوئی سی معلوم دیتی تھیں۔ ان آنکھوں سے ذہانت اور سکون کی ایک کیفیت نمایاں تھی۔ یہ کیفیت واضح طور پر سکون کی کیفیت ہی تھی' گمبھیرتا کی کیفیت نہیں۔ لبوں پر لطیف سی مسکراہٹ' چہرہ متین اور دلکش۔

''آپ اسے جانتے ہیں؟'' ارکادی نے سیتنی خوف سے پوچھا۔

''خوب اچھی طرح۔ آپ کا اس سے تعارف کرا دوں؟''

''ضرور..... ناچ کا یہ دور ختم ہو جانے دیجیے۔''

بازاروف کی توجہ بھی مادام اودن تسوف ہی کی طرف تھی۔ کہنے لگا ''صورت میں جاذبیت تو ہے۔ دوسری مادینوں کی طرح نہیں ہے۔''

ناچ کے ختم کا انتظار کیا گیا اور اس کے بعد سیتنی خوف ارکادی کو ہمراہ لے کر مادام اودن تسوف کے پاس جا پہنچا' لیکن پتہ یہ چلا کہ اُس سے اِن حضرت کی ایسی زیادہ رسم و راہ نہیں تھی۔ غریب ایسا سٹپٹایا کہ ہر ہر فقرے پر ٹھوکریں کھانی پڑیں اور وہ کچھ حیرت و تعجب سے اسے دیکھ رہی تھی' لیکن ارکادی کی کنیت سن کر اس کے چہرے پہ خوشی کے آثار ظاہر

ہوئے۔ اس نے اس سے پوچھا کہ ''آپ نکولائی پیئر وچ کے صاحبزادے ہیں نا؟''

''جی!''

''آپ کے والد صاحب سے دو مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا ہے اور یوں ان کے متعلق باتیں بہت سنی ہیں۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔''

اسی لمحہ کوئی ایڈ جوٹنٹ آن وارد ہوا اور اس سے کواڈریل ناچ کی درخواست کی۔ وہ رضامند ہوگئی۔

''تو آپ رقص کرتی ہیں؟'' ارکادی نے بڑے ادب سے دریافت کیا۔

''ہاں میں رقص کرتی ہوں۔ آپ نے یہ کیوں فرض کرلیا کہ میں رقص نہیں کرتی؟ آپ سمجھتے ہیں کہ میری عمر زیادہ ہوگئی ہے؟''

''لیجیے میرے دل میں یہ خیال آ کیسے..... لیکن اس صورت میں اگر اجازت ہو تو آپ سے مازرکا ناچ کی درخواست کروں؟''

مادام اودن تسوف متانت سے مسکرائی۔ کہنے لگی ''ضرور'' اور پھر ارکادی کو اس نے جس انداز سے دیکھا' اس میں صحیح طور پر برتری کا احساس تو نہیں تھا۔ وہ تو کچھ اس قسم کا انداز تھا جیسے بیاہی بہنیں اپنے چھوٹے معصوم بھائیوں کو دیکھا کرتی ہیں۔ مادام اودن تسوف عمر میں ارکادی سے نکلتی ہوئی تھی۔ یہ اس کا انتیسواں برس تھا' لیکن اس کے سامنے وہ اپنے آپ کو اسکول کا لڑکا ایک کمسن طالب علم تصور کررہا تھا' اس لیے ان کی عمروں کا یہ فرق کچھ زیادہ نمایاں اور واضح ہوگیا تھا۔ ماتف ایچ بڑے دبدبے سے اس کے پاس پہنچا اور بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ اس سے باتیں کرنی شروع کردیں۔ ارکادی وہاں سے سرک گیا' لیکن وہ اسے دیکھتا پھر بھی رہا۔ ناچ کے دوران میں بھی اس کی نگاہیں اسی پر جمی رہیں۔ جس سادگی سے وہ اپنے ہم رقص سے باتیں کررہی تھی' اسی سادگی سے اس نے بڑے سے بڑے افسر سے بات کی۔ بڑی آہستگی سے وہ اپنا منہ موڑ لیتی اور آنکھیں دوسری طرف کرلیتی اور دو مرتبہ وہ بہت آہستگی سے ہنسی۔ ساری روسی ناکوں کی طرح اس کی ناک بھی اِک ذرا موٹی تھی۔ اس کے چہرے کے خدوخال بھی کچھ بہت زیادہ ترشے ہوئے نہیں تھے۔ اس کے باوجود ارکادی نے یہ طے کیا کہ اس نے آج تک کبھی ایسی سج دھج والی عورت نہیں دیکھی۔

اس کی آواز کی گونج اس کی سماعت میں سما گئی تھی' جذب ہوگئی تھی۔ اسے تو اس کے لباس تک کی کیفیت باقی تمام لباسوں سے جدا دکھائی دیتی تھی۔ اس میں کچھ زیادہ بناؤ تھا۔ زیادہ پھیلاؤ تھا اور اس کی چال ڈھال میں ایک عجب قسم کی ہمواری اور بیساختگی نظر آتی تھی۔

مازر کا ناچ جب شروع ہوا تو پہلی پہل تو ارکادی جھینپا جھینپا رہا۔ اس نے اس سے باتیں گھوٹنے کے بڑے منصوبے باندھے تھے' لیکن وقت آنے پر اس سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ بس وہ تو اس کی زلفوں پہ ہاتھ پھیرتا رہا' لیکن اس کی یہ جھینپ اور اضطراب زیادہ دیر باقی نہیں رہا۔ مادام اودن تسوف کی بشاشت نے اسے بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔ پاؤ گھنٹہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ وہ اسے بڑی بے تکلفی سے اپنے باپ کے' اپنے تایا کے' اپنی پیٹرسبرگ کی زندگی کے اور اپنی دیہات کی زندگی کے قصے سنا رہا تھا۔ مادام اودن تسوف بڑے اخلاق اور ہمدردی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ کبھی کبھی وہ آہستہ آہستہ پنکھا جھلنے لگتی اور پھر اسے تہ کر کے رکھ لیتی۔ اس کی گفتگو کا سلسلہ تو اس وقت منقطع ہوا جب دوسرے لوگوں نے آ کر ہم رقصی کی دعوتیں دینی شروع کیں۔ منجملہ اور لوگوں کے سیتنی خوف نے دو مرتبہ اسے ہم رقصی کی دعوت دی۔ وہ واپس آ کر پھر وہاں آ بیٹھی اور پنکھا کرنے لگی۔ اس کے سینے کے مدو جزر میں رَتی بھر شدت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ہاں ارکادی پہ باتوں کا دورہ پھر پڑ گیا تھا۔ اس احساس سے اس کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے کہ وہ اس کے پاس بیٹھا ہے۔ اس سے باتیں کر رہا ہے' اس کی آنکھوں کو' اس کی پیاری پیاری پلکوں کو' اس کے دلکش' متین اور ذہین چہرے کو دیکھ رہا ہے۔ وہ بہت ہی کم بولی تھی' لیکن اس کے الفاظ زندگی کے تجربے کی غمازی ضرور کر رہے تھے۔ اس کے بعض کلموں سے ارکادی نے یہ اندازہ لگایا کہ یہ جوان عورت زمانے کا گرم و سرد بہت کچھ دیکھ چکی ہے.....

وہ اس سے پوچھنے لگی "جب آپ مسٹر سیتنی خوف کے ہمراہ آئے تھے اس وقت جو صاحب آپ کے ساتھ کھڑے تھے' وہ کون ہیں؟"

"آپ نے اسے دیکھا؟" ارکادی نے سوال کا جواب سوال سے دیا۔ "اس نے شکل و صورت شاندار پائی ہے۔ ہیں نا؟ وہ بازاروف ہے میرا دوست۔"

ارکادی نے 'اپنے دوست' کا راگ الاپنا شروع کر دیا۔ اس کا ذکر اُس نے اِس

تفصیل اور اِس گرمجوشی سے کیا کہ مادام اوون تسوف نے مڑ کر بڑی توجہ اور غور سے اسے دیکھا۔ اب مازرکا بھی ختم ہو چلا تھا۔ ارکادی کو اپنی ہم رقص سے جدا ہوتے ہوئے بڑا افسوس ہوا۔ اس نے تقریباً ایک گھنٹہ اس کے ساتھ ہنسی خوشی گزارا تھا۔ یہ درست ہے کہ اس سارے وقت کے دوران میں اس کا رویہ کچھ اس قسم کا رہا تھا گویا وہ اس پہ عنایت کر رہی تھی، گویا اسے اس کا ممنونِ احسان ہونا چاہیے...... لیکن نوجوان اِس قسم کے احساس کو سینے کا بوجھ کب بننے دیتے ہیں۔

گانے کا سلسلہ بند ہوا۔ مادام اوون تسوف اٹھ کھڑی ہوئی اور ارکادی سے کہنے لگی ''اچھا شکریہ! آپ نے آنے کا وعدہ کیا ہے۔ اپنے دوست کو بھی ہمراہ لائیے گا۔ جو شخص ہر چیز سے انکار کی جرأت رکھتا ہو، اسے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔''

گورنر صاحب دوڑے دوڑے مادام اوون تسوف کے پاس آئے اور کہنے لگے ''کھانا تیار ہے۔'' پھر انہوں نے اسے اپنا بازو پیش کیا اور وہاں سے اسے لے چلے۔ ان کے چہرے پہ بدستور فکر و پریشانی کے آثار موجود تھے۔ وہاں سے جاتے جاتے وہ آخر مرتبہ پھر مڑی اور ارکادی کو مسکرا کر سلام کیا۔ اس نے بہت جھک کر سلام کا جواب دیا اور اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ (وہ اس کے جسم کی سج دھج میں اس کے سیاہ ریشمیں ملبوس کی چکاچوند میں غرق ہوا جا رہا تھا) وہ سوچ رہا تھا ''اس گھڑی وہ میرے وجود کو بھی بھول چکی ہے'' اور اِس خیال کے ساتھ ساتھ اسے یہ محسوس ہوا کہ اس کی روح سبکی کے بوجھ سے دبی جا رہی ہے۔

جس وقت وہ وہاں سے اُٹھ کر بازاروف کے پاس کونے میں پہنچا، اس نے فوراً سوال کیا ''کہو! دل لگی رہی نا۔ ایک صاحب مجھ سے اس خاتون کے بارنے میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ کہتے تھے۔ ''یہ عورت بس یوں یوں ہے۔'' لیکن میرا خیال ہے کہ وہ صاحب نرے گھامڑ تھے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ کیسی ہے وہ۔''

ارکادی نے جواب دیا ''میں اِس تعریف کو سمجھنے سے قطعاً قاصر ہوں۔''

''اف بڑے بھولے ہو۔''

''بہر حال آپ نے جن صاحب کا ذکر کیا، ان کی بات میرے پلے نہیں پڑی۔ مادام

اودن تسوف بڑی پیاری رسیلی عورت ہے، لیکن اس سرد مہری اور رعونت سے پیش آئی ہے کہ....."

بازاروف تڑ سے بولا۔ "گھنّے لوگ.....تم تو سمجھتے ہونا۔ تم کہتے ہو وہ سرد مزاج ہے۔ بس یہیں تو مذاق کی آزمائش ہوتی ہے۔ تمھیں آئس کریم پسند ہے نا؟"

ارکادی آہستہ سے بولا "شاید ہے۔ میں اس بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ انہیں ساتھ لے کر آنا۔"

"میں سمجھتا ہوں تم نے میرے متعلق کیا کہا ہوگا، لیکن تم نے اچھا ہی کیا۔ مجھے ساتھ لے چلنا۔ وہ کیسی بھی ہو خواہ وہ گنواری ہو یا کوکشینا کی طرح 'ترقی یافتہ' ہو۔ بہرحال اس کے شانے غضب کے ہیں۔ مدت سے میں نے ایسے شانے نہیں دیکھے تھے۔"

بازاروف کی اس کلبیت پہ ارکادی بہت گھٹا، لیکن جیسا کہ اکثر ہوا ہے اس مرتبہ بھی اس نے اسے اس رجحان کے حوالے سے مطعون نہیں کیا جو اسے ناپسند تھا.....اس نے بڑی دھیمی آواز میں کہا "آخر آپ خواتین کو آزاد خیالی کی اجازت دینے پہ کیوں تیار نہیں ہیں؟"

"بچّو ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ عورتوں میں صرف چڑیلیں آزاد خیال ہوتی ہیں۔"

یہاں پہنچ کر گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ کھانے کے بعد فوراً یہ دونوں وہاں سے چل دیئے۔ ان کے جانے پہ مادام کوکشین نے ایک قہقہہ لگایا۔ اس قہقہہ میں اگرچہ بڑا بغض بھرا ہوا تھا، لیکن وہ کچھ نقاہت کا رنگ بھی لیے ہوئے تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہیں کی تھی اور اس سے اس کی خودداری کو بہت ٹھیس لگی تھی۔ جب تک رقص گاہ میں چڑیا کا بچہ بھی رہا، وہ وہاں سے نہیں سرکی۔ صبح چار بجے کے قریب وہ سیتنی خوف کے ساتھ پیرس والوں کے طرز میں پالکا مازرکا ناچ ناچ رہی تھی۔ یہ فرحت بخش اور روح پرور نظارہ گورنر صاحب کی محفل رقص کا آخری سین تھا۔

(15)

دوسرے دن ارکادی اور بازاروف مادام اودن تسوف کے ہوٹل کی سیڑھیاں

چڑھ رہے تھے اور بازاروف ارکادی سے کہہ رہا تھا ''دیکھنا چاہیے یہ کس قسم کا جناور نکلتا ہے۔ مانس گند مانس گند۔ مجھے تو یہاں کچھ دال میں کالا کالا نظر آتا ہے۔''

''تمہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے'' ارکادی جھلّا کر بولا ''حد ہے، تم۔ اور بھی کوئی نہیں تم، بازاروف اسی تنگ ظرف اخلاقیات سے چمٹے ہوئے ہو جو.....''

بازاروف نے بڑی لاپرواہی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''یار! تم آدمی کیا ہو لطیفہ ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ میری زبان میں کالے کا مطلب سفید ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے تو میرا پلہ بھاری رہتا ہے۔ تم نے خود آج صبح مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ اس نے بڑی عجیب طرح سے شادی کی تھی۔ حالانکہ میرا خیال یہ ہے کہ کسی دولت مند بڈھے سے بیاہ رچا لینا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ اس کے برخلاف یہ بڑی سمجھداری کی بات ہے۔ شہر میں جو گپ اُڑ رہی ہے، میں اسے نہیں مانتا، لیکن جیسا کہ ہمارے تہذیب یافتہ گورنر صاحب کہتے ہیں۔ یہ ضرور سوچتا ہوں کہ اس گپ شپ میں سچائی ضرور ہے۔''

ارکادی نے کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ کر کمرے کے دروازے پر دستک دے دی۔ ایک نوجوان باوردی ملازم نے دونوں دوستوں کو لے جا کر ایک بڑے سے کمرے میں بٹھا دیا۔ روسی ہوٹلوں کے سارے کمروں کی طرح یہ کمرہ بھی بس نام کو آراستہ تھا، لیکن پھولوں کی فراوانی تھی۔ مادام اودن تسوف جلد ہی وہاں آ پہنچی۔ اس نے سیدھا سادا صبح کا لباس پہن رکھا تھا۔ موسم بہار کی دھوپ کے اُجالے سے اِس وقت وہ کچھ زیادہ جوان نظر آ رہی تھی۔ ارکادی نے بازاروف کا تعارف کرایا اور یہ دیکھ کر وہ دل ہی دل میں متعجب ہوا کہ بازاروف کچھ سٹپٹا سا گیا تھا۔ اس کے برخلاف مادام اودن تسوف پہ اطمینان کی وہی کیفیت طاری تھی، جو پچھلے دن دیکھی گئی تھی۔ بازاروف کو خود بھی اپنی گھبراہٹ کا احساس تھا۔ وہ کچھ جھلّا پڑا۔ وہ سوچنے لگا ''اور بھی کسی سے نہیں۔ ایک پیٹی کوٹ سے ڈرا جا رہا ہے۔'' اور پھر بالکل سیتنی خوف کی طرح آرام کرسی میں وہ جھولنے لگا اور پھر مبالغہ آمیز حد تک بے تکلفی جتاتے ہوئے اس نے باتیں شروع کر دیں اور مادام اودن تسوف اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔

اینا سرگیونا اودن تسوف سرگے نکولائی وچ لاکتف کی بیٹی تھی۔ یہ شخص بلا کا

خوبصورت تھا۔ سٹے اور جوئے میں وہ دھوم مچائی کہ رہے نام سائیں کا۔ ماسکو اور پیٹرسبرگ میں پندرہ سال تک اس کے نام کا ڈنکا بجتا رہا۔ آخر جوئے میں وہ بالکل تباہ ہوگیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ترکِ دنیا کر کے وہ گاؤں میں آ پڑا' لیکن جلد ہی اس کی مٹی عزیز ہوگئی۔ اس نے دو بیٹیاں اور ان کے نام تھوڑی سی جائداد چھوڑی۔ اینا اس وقت بیسویں برس میں تھی اور کاتیا کا بارہ کا سن تھا۔ ان کی ماں نوابوں کے ایک لٹے کھسٹے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ شوہر کے عروج کے زمانے ہی میں پیٹرسبرگ میں اس کا انتقال ہوگیا تھا۔ باپ کے گزر جانے کے بعد اینا بڑی مشکل میں پڑ گئی۔ پیٹرسبرگ میں اس نے اعلیٰ تعلیم پائی تھی۔ اس تعلیم نے اب اسے اس کام کا نہ رکھا تھا کہ وہ گھر داری کی فکریں کرے اور گاؤں کے ایک کونے میں چھپی پڑی رہے۔ پاس پڑوس میں کسی سے نام کو اس کی جان پہچان نہ تھی اور بھلا ایسا تو کون بیٹھا تھا جو اسے کوئی مشورہ دیتا۔ اس کے باپ نے پاس پڑوس والوں سے ربط وضبط قائم کرنے سے ہمیشہ احتراز کیا تھا۔ وہ ان سے بد کتا تھا اور وہ اس سے بد کتے تھے' لیکن پھر بھی اینا نے اپنے ہوش وحواس گم نہیں کیے اور جھٹ اپنی خالہ شہزادی اندوتیا استیپانونا کو بلا بھیجا۔ خالہ جان کا ٹھسا قیامت تھا۔ ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھیں۔ بھانجی کے گھر آتے ہی انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ گھر کے سارے اچھے اچھے کمرے اپنے لیے سنگوا لئے۔ صبح سے شام تک جھڑ جھڑ کرتی تھیں۔ جب تک ان کا خدمتگار خدمت میں حاضر نہ ہوتا' کیا مجال کہ وہ باغ میں بھی قدم رکھ جائیں۔ یہ زرعی غلام چوبداری کا فرض انجام دیتا تھا اور سبز وردی اور ہلکا نیلا ٹوپ ڈاٹے رہتا تھا۔ اینا نے خالہ کی تنک مزاجیوں کو بڑے ضبط وتحمل سے برداشت کیا۔ بہن کی تعلیم کی طرف توجہ دی اور رفتہ رفتہ اس ویران سنسان مقام پر زندگی ضائع کرنے کے تصور سے مانوس ہوگئی......لیکن اس کی تقدیر کے نوشتے میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ اتفاق کی بات کہ اودن تسوف نے اسے دیکھ پایا۔ اِس وقت وہ چھیالیس سال کے پھیر میں تھا' لیکن دولت اس کے الغاروں تھی۔ عجب سنکی سا آدمی تھا۔ بھاری بھرکم ضرور تھا' لیکن کاٹھی بنی ہوئی تھی۔ مزاج میں اِک ذرا ترشی تھی' لیکن وہ نہ تو احمق تھا اور نہ طبیعت کا برا تھا۔ وہ اینا پر مرمٹا اور شادی کے پیغام ڈال دیئے۔ وہ بھی اس کا گھر آباد کرنے پر رضامند ہوگئی اور چھ سال اس کے ساتھ گزارے۔ اس کے مرنے کے بعد اس

کی ساری جائداد اسے مل گئی۔ اس کے انتقال کے بعد وہ سال بھر گاؤں میں رہی۔ پھر اپنی بہن کے ہمراہ پردیس چلی گئی۔ لیکن جرمنی پہنچ کر رُک گئی۔ وہ سفر سے اکتا گئی اور واپس آ کر اپنے محبوب مقام نکولسکو میں رہ پڑی۔ یہ مقام ایکس کے قصبے سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہاں اس کا بڑا عالیشان اور آراستہ و پیراستہ مکان اور ایک خوبصورت باغ تھا۔ مرحوم شوہر نے اس کی امنگوں کو پورا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اینا سرگیونا کبھی بھولے بسرے ہی قصبے چلی جاتی تھی۔ عام طور پر تو کوئی کام ہی نکل آتا تھا، تب ہی جاتی تھی۔ اس صورت میں بھی وہ وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرتی تھی۔ صوبے میں لوگ اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اودن تسوف سے اس کی شادی ہونے پر بڑا شور مچا تھا۔ اس کے متعلق طرح طرح کے افسانے گھڑے گئے۔ اس کے متعلق مشہور کیا گیا کہ وہ تاش لگانے کی ترکیبوں میں باپ کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ یہاں تک کہا گیا کہ وہ مصلحتاً پردیس گئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ کسی طرح اندوہناک نتائج..... کی پردہ پوشی ہو جائے اور غضب ناک راوی آخر میں اپنی بحث یوں سمیٹتا۔ "اب سمجھئے؟" اس کے متعلق کہا جایا کرتا تھا۔ "اس عورت نے زمانہ دیکھا ہے۔" اور ایک مشہور مقامی فقرہ باز عموماً اس میں یہ ٹکڑا لگا دیا کرتا تھا۔ "ہاں زمانے کا گرم بھی اور سرد بھی۔" یہ ساری باتیں اس تک پہنچتی تھیں، لیکن وہ اِس کان سنتی اور اُس کان اڑا دیتی۔ آزادی کے ساتھ ساتھ اس کی سیرت میں عزم کا پہلو بھی موجود تھا۔

مادام اودن تسوف آرام کرسی پہ دراز تھی۔ اس نے ہاتھ باندھ رکھے تھے اور بازاروف کی باتیں سن رہی تھی۔ اپنی عادت کے خلاف وہ بے تحاشا باتیں کئے جا رہا تھا اور یہ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ باتوں کو اس کی خاطر دلچسپ بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ارکادی کو اور بھی تعجب ہوا۔ وہ یہ طے نہیں کر سکا کہ آیا بازاروف کو اپنے مقصد میں کامیابی بھی ہو رہی ہے۔ اینا سرگیونا کے چہرے کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا بہت مشکل تھا کہ اس پہ کس قسم کا اثر پڑ رہا ہے۔ اس کے چہرے پر متانت اور دلکشی کی ملی جلی کیفیت بدستور قائم تھی۔ اس کی حسین آنکھوں میں توجہ سے ایک چمک پیدا ہو گئی تھی، لیکن اِس توجہ میں سکون کی کیفیت تھی۔ ملاقات کی ابتدائی گھڑیوں میں بازاروف کے نازیبا طرزِ عمل سے اس کا مزاج مکدر ہو گیا تھا۔ اِس طرح جس طرح بدبو سے یا بے سُری آواز سے مزاج مکدر ہو جایا کرتا ہے، لیکن وہ

فوراً ہی یہ تاڑ گئی تھی کہ وہ اکھڑا اکھڑا ہو رہا ہے اور اس سے اسے بڑی تسکین ہوئی۔ اسے تو بس پھکڑ پن سے نفرت تھی اور بازاروف پہ پھکّڑ پن کا الزام کسی صورت میں بھی عائد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ارکادی پہ تو آج تابڑ توڑ حیرت انگیز انکشافات ہو رہے تھے۔ اس نے امید یہ باندھی تھی کہ مادام اودن تسوف جیسی دانا بینا عورت سے بازاروف اپنے نظریوں اور خیالات کے متعلق گفتگو کرے گا، بلکہ اس نے تو خود اِس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ جو شخص کسی شے کو تسلیم نہ کرنے کی جسارت کرتا ہے، اس سے وہ ملنا چاہتی ہے، لیکن بازاروف نے اس کی بجائے ادویات، ہومیوپیتھی اور نباتات کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ پتہ یہ چلا کہ مادام اودن تسوف نے عزلت نشینی میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ اس نے بہت سی اچھی اچھی کتابیں پڑھ رکھی تھیں۔ روسی زبان وہ خوب بولتی تھی۔ اس نے باتوں باتوں میں موسیقی کا ذکر چھیڑ دیا، لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ بازاروف آرٹ کا قائل نہیں ہے، تو بڑی خوش اسلوبی سے وہ پھر نباتات کے ذکر پہ آ گئی۔ حالانکہ ارکادی نے قومی راگوں کی اہمیت پر بحث کا آغاز کر ڈالا تھا۔ مادام اودن تسوف تو اس سے کچھ ایسا برتاؤ کر رہی تھی گویا وہ اس کا چھوٹا بھیا ہے۔ اتنا تو ضرور نظر آتا تھا کہ وہ اس کی نیک طبعی اور شباب سے بھرپور سادگی کی قدر کرتی ہے، لیکن بات یہاں آ کر بس ختم ہو جاتی ہے۔ تین گھنٹے سے زیادہ تک خوب باتیں کیں اور طرح طرح کے موضوعات پہ گرما گرم بحثیں ہوئیں۔

دونوں دوست بالآخر اٹھ کھڑے ہوئے اور جانے کی اجازت چاہنے لگے۔ اینا سرگیونا نے بڑی شفقت سے انہیں دیکھا، مصافحہ کے لیے اپنا حسین و صبیح ہاتھ ان کی طرف بڑھایا اور ایک ذرا سوچ کر کچھ اس طرح مسکراتے ہوئے، جس میں تذبذب کے ساتھ ساتھ سرور کی کیفیت بھی تھی، کہنے لگی ''حضرات! اگر آپ کو کوفت کا خیال نہ ہو تو میرے یہاں نکولسکو میں تشریف لائیے۔''

ارکادی جھٹ بولا ''اینا سرگیونا صاحبہ! اس سے زیادہ میری خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے.....''

''اور بازاروف صاحب! آپ؟''

بازاروف نے جواب میں جھک کر سلام کیا اور ارکادی کی تقدیر میں ابھی ایک اور

عجوبہ دیکھنا لکھا تھا۔اس نے کیا دیکھا کہ اس کا دوست جھینپا جارہا ہے۔

''اچھا اب بتاؤ۔'' وہ سڑک پر چلتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا ''اب بھی تمہارا وہی خیال ہے..... کہ وہ.....''

بازاروف نے بیساختہ جواب دیا ''کیا کہا جاسکتا ہے؟'' اِک ذرا تھم کر بولا ''بالکل ملکہ ہے ساری شاہانہ سج دھج ہے۔ بس ایک سر پہ تاج اور عقب میں غاشیہ برداروں کی کسر رہ جاتی ہے۔''

ارکادی نے جواب دیا ''ہماری ملکائیں ایسی روسی کہاں بولتی ہیں۔''

''صاحبزادے اس نے زمانے کی اونچ نیچ دیکھی ہے۔''

''جو کچھ بھی ہو ہے وہ پیاری چیز۔''

بازاروف نے اپنی ہانکنی شروع کردی۔ ''کس قیامت کا جسم ہے۔ جی چاہتا ہے کہ میز پر اس کی چیر پھاڑ کرکے دیکھوں۔''

''ہشت یوگنین خدا کے لیے چپ رہو۔ تم نے تو حد کردی ہے۔''

''بچّو! لال پیلے ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ سانچہ میں ڈھلا ہوا جسم ہے۔ ہمیں اس کے یہاں چلنا چاہیے۔''

''کیا؟''

''پرسوں کیوں نہ چلیں؟ یہاں کیا رکھا ہے؟ کوکشینا کے ساتھ شیمپین پئیں یا پھر تمہارے بھائی جان آزاد خیال افسر کی باتیں سنتے رہیں...... بس پرسوں اڑ چلیں۔ سرا ہے ایک بات اور۔ میرے باپ کی کٹیا وہاں سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ نکولسکو اسی سڑک پہ تو واقع ہے نا؟''

''ہاں۔''

''غضب ہے۔ آخر جھجکتے کیوں ہو۔ یہ کام احمق اور سڑی لوگوں کے لیے چھوڑ دو۔ میں یہ کہتا ہوں کہ کیسا شاندار جسم ہے۔''

تین دن بعد دونوں دوست نکولسکو کی سڑک پہ اڑے چلے جارہے تھے۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی، لیکن گرمی ایسی زیادہ نہیں تھی اور بگھی کے گھوڑے اوسط درجے کی رفتار سے ٹپ

ٹپ کرتے دوڑ رہے تھے اور اپنی بندھی جکڑی دُموں کو بار بار جنبش دیتے تھے۔ ارکادی سڑک کو تکے جار ہا تھا اور مسکرا رہا تھا' نہ جانے کیوں۔

ایکا ایکی بازاروف چونک کر بولا ''بھئی مجھے مبارکباد دو۔ آج 22 جون ہے۔ ہمارے محافظ فرشتے کی یاد کا دن ہے۔ دیکھیں وہ ہماری کیسی نگہبانی کرتا ہے''۔ اور پھر دھیمی آواز میں کہنے لگا ''آج انہوں نے میرا انتظار کیا ہوگا...... خیر دیکھا کریں انتظار...... ہرج ہی کیا ہے۔''

(16)

ایناسرگیونا گاؤں کے جس مکان میں رہتی تھی' وہ ایک پہاڑی پہ واقع تھا۔ اس سے تھوڑے سے فاصلے پر ایک گرجا تھی' جو بادامی پتھروں سے تعمیر ہوئی تھی اور جس کی چھت سبز اور ستون سفید رنگ کے تھے۔ صدر دروازے پر نقش ونگار کا کام ہو رہا تھا اور اطالوی طرز میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ زندہ ہونے کے واقعہ کو پیش کیا گیا تھا۔ تصویر کے پیش منظر میں ایک سیاہ فام سپاہی نظر آ رہا تھا۔ جس نے خود پہن رکھا تھا اور جس کے گول گول خدوخال خاص طور پر نمایاں نظر آ رہے تھے۔ گرجا کے عقب میں ایک لمبا چوڑا گاؤں دو قطاروں میں پھیلا چلا گیا تھا اور چھپر کی چھتوں سے جا بجا چمنیوں نے سر نکال رکھا تھا۔ چوپال کا طرزِ تعمیر بھی گرجا سے ملتا ہوا تھا۔ یہ طرز ہمارے یہاں الیگزینڈر کے طرزِ تعمیر کے نام سے معروف ہے۔ مکان پہ بھی زرد رنگ ہو رہا تھا۔ اس کی چھت سبز تھی' ستون سفید اور ایک طاق میں ڈھال بنی ہوئی تھی۔ معمار نے اودن تسوف مرحوم کی منظوری سے اِن دونوں عمارتوں کا نقشہ تیار کیا تھا —— اودن تسوف جو یہ کہا کرتا تھا کہ میں بے مصرف اور رسمی بدعتوں کو برداشت نہیں کرسکتا تھا' مکان کی دونوں سمتوں میں ایک پرانے باغ کے سیاہی مائل درخت کھڑے تھے۔

ہال میں دو لمبے تڑنگے باوردی چوبداروں نے دونوں دوستوں کا استقبال کیا۔ ایک چوبدار خانساماں کو بلانے لپکا۔ خانساماں گٹھے ہوئے جسم کا آدمی تھا۔ اس نے سیاہ

ڈریس کوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ لپکا ہوا آیا اور مہمانوں کو ایک زینے سے، جس کی سیڑھیوں پہ دری بچھی ہوئی تھی، ایک کمرے میں لے گیا۔ یہاں ان کے لیے پہلے ہی سے دو پلنگ اور آرائش کا سارا سامان تیار تھا۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ اِس گھر میں نظم وضبط کا دور دورہ ہے۔ ہر چیز صاف ستھری تھی۔ ہر گوشے میں ایک عجیب سی بھینی بھینی خوشبو تیر رہی تھی۔ ایسی خوشبو جو وزراء کے ملاقاتی کمروں میں بسی رہتی ہے۔

خانساماں نے کہا ''اینا سر گیونا فرماتی ہیں کہ آپ آدھ گھنٹے میں تشریف لائیں۔ میرے لیے کوئی حکم؟''

بازاروف نے جواب دیا ''حکم وکم تو کیا ہے، بس اِک ذرا اتنی تکلیف کرو کہ مجھے ایک گلاس واڈ کا لا دو۔''

''جی جناب!'' خانساماں نے اِک ذرا گھبراہٹ سے کہا اور وہاں سے واپس چل دیا اور جب وہ واپس جارہا تھا تو اس کے جوتے چرمر چرمر کررہے تھے۔

بازاروف کہنے لگا ''کیا شان وشوکت ہے۔ مختصر یہ کہ وہ بالکل ملکہ ہے۔''

ارکادی جھٹ سے بولا ''ہاں اچھی ملکہ ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں تم اور مجھ جیسے رئیسوں کو مہمانی کی دعوت دے دی۔''

''بالخصوص مجھے، ہونے والا ڈاکٹر، ڈاکٹر کا بیٹا اور ایک دیہاتی گورکن کا پوتا..... تمہیں یہ پتہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں گورکن کا پوتا ہوں۔ اس پرانسکی کی طرح۔'' بازاروف نے ذرا توقف کیا اور ہونٹ بھینچتے ہوئے بولا ''بہرحال وہ چین کرنے کی قائل ہے۔ کیوں یہ درست ہے نا؟ اچھا ہم شام کا لباس کیوں نہ پہن لیں؟''

ارکادی صرف اپنے کاندھے مچکا کر رہ گیا..... لیکن تھوڑا سا گھبرایا ہوا وہ بھی تھا۔

آدھ گھنٹے بعد بازاروف اور ارکادی ساتھ ساتھ ملاقاتی کمرے میں پہنچے۔ یہ خاصا وسیع اور بلند وبالا کمرہ تھا اور آراستہ وپیراستہ بھی بہت تھا، لیکن یہ آرائش منجھے ہوئے مذاق کی غمازی نہیں کرتی تھی۔ بھاری بھرکم قیمتی فرنیچر معمولی ترتیب کے ساتھ دیواروں کے برابر برابر رکھا تھا۔ دیواروں پہ جامنی رنگ کے کاغذ منڈھے تھے، جن پہ سنہری پھول بنے ہوئے تھے۔ اودن تسوف نے ایک دوست کی معرفت جو اس کا ایجنٹ بھی تھا اور شراب کا

کاروبار کرتا تھا، ماسکو سے یہ سامان منگایا تھا۔ ایک صوفے کے اوپر دیوار کے بالکل وسط میں چھدرے بالوں والے ایک شخص کی تصویر لٹک رہی تھی اور یوں لگتا تھا گویا یہ تصویر آنے جانے والوں کو بہت خفگی سے دیکھ رہی ہے۔ بازاروف نے ارکادی کے کان میں کہا "ہونہہ یہ مرحوم و مغفور شوہر صاحب ہیں۔" اور پھر ناک کو ایک طرف کرتے ہوئے بولا "کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم......؟" لیکن عین اس گھڑی گھر کی مالکہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے ہلکا پھلکا لباس پہن رکھا تھا۔ بالوں میں کنگھی اس طرح کی گئی تھی کہ کانوں کے پیچھے جاکر گچھے بن جاتے تھے اور ان کی وجہ سے اس کے شاداب شگفتہ اور پاکیزہ چہرے پہ کم عمر لڑکیوں کی سی پھبن پیدا ہوگئی تھی۔

وہ بولی "آپ نے وعدہ پورا کیا، شکریہ! اب آپ چند دن میرے یہاں قیام فرمائیں۔ یہ کوئی ایسی بری جگہ نہیں ہے۔ میں اپنی بہن سے آپ کو ملاؤں گی۔ وہ پیانو خوب بجاتی ہے۔ بازاروف صاحب آپ تو اس چیز سے بے نیاز ہیں، لیکن کرسانوف صاحب آپ کو تو موسیقی کا شوق ہے۔ میری بہن کے علاوہ ایک میری بوڑھی خالہ بھی میرے ہمراہ رہتی ہیں اور ایک ہمارے ہمسائے ہیں، جو کبھی کبھی تاش کھیلنے آجایا کرتے ہیں۔ بس ہمارا یہی مختصر سا حلقہ ہے۔ اچھا بیٹھئے تو سہی۔"

مادام اودن تسوف نے یہ مختصر سی تقریر اس صحت و صفائی سے کی گویا اس نے اسے حفظ کر رکھا تھا۔ پھر وہ ارکادی کی طرف متوجہ ہوئی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ ارکادی کی والدہ سے اس کی جان پہچان تھی، بلکہ نکولائی پیروچ سے عشق کی تقریب میں وہ اس کی راز داں بھی رہی تھی۔ ارکادی نے اپنی مرحوم والدہ کے متعلق بڑی گرمجوشی سے باتیں کرنی شروع کر دیں اور بازاروف نے البم کے صفحے الٹنے پلٹنے شروع کر دیئے۔ وہ دل میں سوچ رہا تھا "میں تو بالکل پالتو بلی بنتا جارہا ہوں۔"

ایک خوبصورت شکاری کتا، جس کے گلے میں نیلا پٹا پڑا تھا، دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور فرش پہ پنجے مارنے لگا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک اٹھارہ سالہ لڑکی داخل ہوئی۔ سیاہ زلفیں، جلد سیاہی مائل، گول گول سا دلفریب چہرہ۔ سیاہ چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ ہاتھوں میں اس نے پھولوں سے بھری ہوئی ایک ٹوکری لے رکھی تھی۔

مادام اوون تسوف نے اس کی طرف سر سے اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یہ میری کاتیا ہے۔'' کاتیا نے اِک ذرا جھک کر سلام کیا اور اپنی بہن کے برابر جا بیٹھی۔ وہاں بیٹھ کر اس نے پھول چننے شروع کر دیئے۔ شکاری کتے کا فیفی نام تھا۔ مہمانوں کے پاس پہنچ کر پہلے اس نے اپنی دُم ہلائی اور ان کے ہاتھوں میں اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی ناک ٹھونس دی۔

''یہ سب پھول تم نے ہی توڑے ہیں؟'' مادام اوون تسوف نے سوال کیا۔

کاتیا نے جواب دیا ''جی!''

''خالہ جان چائے پہ آ رہی ہیں؟''

''جی۔''

کاتیا جب بولتی تھی تو اس کے چہرے پہ ایک دلکش، رسیلی، شرمیلی اور بے تکلفانہ مسکراہٹ کھیلنے لگتی تھی اور یوں لگتا تھا کہ وہ اپنی پلکوں کی اوٹ سے مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی ہے۔ ابھی اس کی ہر بات میں نوخیزی اور کچے پن کی کیفیت تھی ــــــ اس کی آواز میں، اس کے چہرے کی شادابی میں، اس کے گلاب جیسے ہاتھوں میں، اس کی صبیح ہتھیلیوں میں اور اس کے تنگ شانوں میں...... وہ شرم سے عرق عرق ہوئی جا رہی تھی اور اس کا سانس اکھڑا جا رہا تھا۔

مادام اوون تسوف بازاروف کی طرف متوجہ ہوئی اور کہنے لگی ''یوگینی وسل یوچ آپ تصویریں تو محض تکلفاً دیکھ رہے ہیں۔ آپ کو ان سے دلچسپی تو ہے نہیں۔ آپ قریب کیوں نہ آ جائیں، پھر کچھ بات چیت کریں۔''

بازاروف قریب جا بیٹھا اور کہنے لگا ''کس موضوع پر بات چیت کا فیصلہ ہوا ہے؟''

''جس موضوع پہ آپ چاہیں، مگر ایک بات بتائے دیتی ہوں، استدلال کی مجھے بہت دھت ہے۔''

''آپ کو؟''

''جی! آپ کو تعجب ہو رہا ہے، کیوں؟''

''اس لیے کہ جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں آپ بڑے ٹھنڈے دل و دماغ کی عورت ہیں اور استدلال کے دھتی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جوشیلا ہو۔''

''آپ نے اتنی جلدی میری فطرت کو کیسے سمجھ لیا؟ اوّل تو میں بڑی بے صبری اور ہٹ دھرم واقع ہوئی ہوں۔ آپ کا تیا سے پوچھ لیں۔ دوسرے یہ کہ میں جذبات کی رَو میں بہہ جاتی ہوں۔''

بازاروف نے اینا سرگیونا کی طرف دیکھا۔ پھر کہنے لگا ''ممکن ہے آپ بہتر سمجھ سکتی ہیں۔ تو گویا آپ بحث پہ تل ہی گئی ہیں۔ میں آپ کے البم میں سیکسن پہاڑوں کے مناظر دیکھ رہا تھا۔ آپ کہتی ہیں کہ اس چیز سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ آپ نے یہ بات اس لیے کہی ہے کہ آپ یہ سمجھتی ہیں کہ مجھے آرٹ سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ اور یہ واقعی درست ہے کہ مجھے آرٹ سے کوئی لگاؤ نہیں ہے' لیکن یہ مناظر علم طبقات الارض کے نقطۂ نظر سے تو میرے لیے دلچسپی کا باعث بن سکتے ہیں۔ مثلاً پہاڑوں کی تشکیل کا سوال ہے۔''

''معاف کیجیے۔ طبقات الارض کے ماہر کی حیثیت سے آپ کو نقاشی سے نہیں' بلکہ اس موضوع سے متعلق کتاب سے رجوع کرنا پڑے گا۔''

''کتاب کے دس صفحوں میں جو بات پھیلی ہوئی ہوگی وہ نقاشی کو ایک نظر دیکھ کر میری سمجھ میں آ جاتی ہے۔''

اینا سرگیونا تھوڑی دیر خاموش رہی۔

''تو آپ کو آرٹ سے مطلق لگاؤ نہیں ہے۔'' وہ میز پہ کہنیاں ٹیکتے ہوئے بولی اور اس نقل و حرکت سے اس کا چہرہ بازاروف کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ ''اس کے بغیر آپ گزارہ کیسے کرتے ہیں؟''

''میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ اس کی ضرورت کیا پیش آتی ہے؟''

''کم از کم ایک بات تو یہی ہے کہ اس سے انسانوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔''

بازاروف ہنسنے لگا ''اوّل تو یہ کہ زندگی کا تجربہ خود یہ سکھا دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ الگ الگ افراد پہ مغز سوزی کرنے کی کوئی تک نہیں ہے۔ سب لوگ ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ روح اور جسم دونوں کے اعتبار سے ہم میں سے ہر شخص کا بھیجا' ریڑھ کی ہڈی' دل اور پھیپھڑے ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں اور نام نہاد اخلاقی اوصاف میں بھی یکسانیت ہوتی ہے۔ اختلافات ہوئے بھی تو برائے نام' سوان کی کیا اہمیت

ہے۔ ایک انسان پہ تجربہ کر لیجیے۔ سب کے متعلق پتہ چل جائے گا۔ انسان تو جنگل کے درختوں کی طرح ہوتے ہیں۔ کوئی ماہر نباتات یہ تکلیف مول نہیں لے گا کہ ہر ہر درخت کا مطالعہ کرتا پھرے۔"

کاتیا مزے مزے میں ایک ایک پھول اٹھا کر پرو رہی تھی۔ اس نے حیران و پریشان ہوکر بازاروف کی طرف دیکھا' لیکن اس کی تیز اور بے نیاز نگاہوں سے جب اس کی نگاہیں چار ہوئیں تو وہ تو ایسی جھینپی کہ اس کے کانوں کی لویں تک لال پڑ گئیں۔ ایناسر گیونا اپنے سر کو جنبش دے کر رہ گئی۔

"جنگل کے درخت" اس نے وہ الفاظ دہرائے اور کہنے لگی "تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ بیوقوف اور عقلمند کے درمیان اور نیک طینت اور بدطینت کے درمیان کوئی فرق ہی نہیں ہے؟"

"نہیں' فرق تو ہے ایسے ہی جیسے تندرست اور بیمار میں فرق ہوتا ہے۔ دق کے مریض کے پھیپھڑوں کی وہ حالت نہیں ہوتی' جو ہمارے آپ کے پھیپھڑوں کی حالت ہے۔ اگرچہ وہ بنائے اسی ڈھنگ سے گئے ہیں۔ ہم کم وبیش یہ بات جانتے ہیں کہ جسمانی امراض کیسے پیدا ہوتے ہیں۔ اخلاقی بیماریاں غلط تربیت سے پیدا ہوتی ہیں' اس لغویت سے پیدا ہوتی ہیں جس کی بچپن ہی سے آدمی کے دماغ میں ٹھونسم ٹھانس کی جاتی ہے۔ سماج کی خرابیوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ مختصر یہ کہ سماج کی اصلاح کر دیجیے۔ بیماریوں کا ٹنٹا آپ سے آپ ختم ہوجائے گا۔"

بازاروف نے یہ ساری باتیں بڑی تمکنت سے کہی تھیں۔ گویا وہ ساتھ میں یہ بھی سوچتا جا رہا تھا۔ "آپ کو اختیار ہے آپ مانیں یا نہ مانیں۔ اپنی بلا سے۔" وہ آہستہ آہستہ اپنی مونچھوں پہ انگلیاں پھیرنے لگا اور اس کی نگاہیں کمرے میں بھٹک رہی تھیں۔

ایناسر گیونا بولی "اور آپ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جب سماج کی اصلاح ہو جائے گی تو پھر نہ تو احمق باقی رہیں گے اور نہ بدمعاش۔"

"بہرحال سماجی نظام درست ہوگیا تو اس سے فرق نہیں پڑے گا کہ کوئی شخص احمق ہے یا عقلمند ہے' نیک معاش ہے یا بدمعاش ہے۔"

''جی میں سمجھ گئی۔ ریڑھ کی ہڈی سب کی ایک سی ہوگی۔''

''درست سمجھا آپ نے۔''

مادام اوون تسوف ارکادی سے مخاطب ہوئی ''اور تمہاری کیا رائے ہے۔ ارکادی نکولائی وچ؟''

اس نے جواب دیا ''مجھے یوگین سے اتفاق ہے۔''

کاتیا نے پلکوں کی اوٹ سے اسے دیکھا۔

مادام اوون تسوف نے آخر میں تبصرہ آرائی کرتے ہوئے کہا ''آپ لوگوں کی باتیں سن کر میں تو حیران رہ گئی ہوں۔ خیر باتیں پھر ہوں گی، لیکن اس وقت خالہ جان چائے پہ آ رہی ہیں۔ ہم انہیں کیوں دق کریں۔''

اینا سرگیونا کی خالہ جان سوکھ چڑی ہونے کے ساتھ ساتھ ٹھگنی بھی تھیں۔ چہرے نے سکڑ سکڑا کر مٹھی کی سی شکل اختیار کر لی تھی۔ پلکوں کی سیاہی اب بھورے رنگ میں منتقل ہو چلی تھی اور اس کے پیچھے جو آنکھیں چمک رہی تھیں، وہ بدخوئی کی چغلی کھا رہی تھیں۔ مہمانوں کو دیکھ کر انہوں نے سر کو جنبش تو دی تھی، لیکن اس اشارے کو مشکل ہی سے دعا سلام کا نام دیا جا سکتا ہے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ ایک چوڑی سی مخملی آرام کرسی پہ دراز ہو گئیں۔ اِس کرسی پہ کسی اور کو بیٹھنے کا حق حاصل نہیں تھا۔ کاتیا ایک تپائی بچھا کر ان کے قدموں میں جا بیٹھی۔ دعا دینی در کنار خالہ جان نے تو آنکھ اٹھا کر بھی اسے نہیں دیکھا۔ ہاں ان کے ہاتھوں کو اس زرد شال کے اندر ضرور جنبش ہوئی تھی، جس نے ان کے ضعیف جسم کو ڈھانپ رکھا تھا۔ بوڑھی شہزادی صاحبہ کو زرد رنگ بہت پسند تھا۔ ان کی دستار میں بھی چمکدار پیلی ربن لگی ہوئی تھی۔

مادام اوون تسوف نے آواز بلند کرتے ہوئے پوچھا ''خالہ جان! آپ کے آرام میں کوئی خلل تو نہیں پڑا۔''

''یہ کتا یہاں پھر آ گیا۔'' بڑی بی نے بڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ فیفی ان کے قریب آنے پہ مائل ہے تو وہ چلّانے لگیں ''ش۔ شش۔ شش''

کاتیا نے فیفی کو آواز دی اور اس کے نکلنے کے لیے دروازہ کھول دیا۔

فیفی خوشی میں مست اچھلتا کودتا باہر نکل گیا۔ اس نے یہ امید باندھی تھی کہ اسے ٹہلانے کے لیے باہر لے جایا جائے گا، لیکن جب دروازے کے باہر وہ اکیلا رہ گیا، تو اس نے پنجے کھرچنا اور کیاؤں کیاؤں کرنا شروع کر دیا۔ بڑی بی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ کاتیا نے ہمت باندھی کہ وہ فوراً باہر چلی جائے.......

''غالباً چائے تو اب تیار ہوگی؟'' مادام اوون تسوف بولی۔

''آیئے گا جناب! خالہ جان آپ بھی آیئے نا۔''

خالہ جان چپ چاپ کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئیں اور ملاقات کے کمرے سے کھانے کے کمرے کی طرف چلیں۔ آگے آگے وہ تھیں اور باقی سب ان کے پیچھے چل رہے تھے۔ ایک چھوٹا سا لڑکا جو وردی ڈاٹے کھڑا تھا۔ سٹر پٹر کرتا میز کے پاس سے سرک گیا۔ ایک گدوں والی آرام کرسی خالہ جان کے لیے مخصوص تھی۔ وہ ٹھاٹ سے اس پہ ڈٹ گئیں۔ کاتیا نے پہلی پیالی خالہ جان کو تھما دی۔ ان کی پیالی میں چائے پہ ایک باریک سی چمکدار جھلی تن گئی تھی۔ خالہ جان نے اپنی پیالی میں تھوڑا سا شہد ملایا (وہ چائے میں شکر ملا کر پینا گناہ بھی سمجھتی تھیں اور فضول خرچی بھی، حالانکہ انہوں نے کبھی کسی چیز پہ پائی بھی خرچ نہیں کی تھی) اور پھر اچانک اپنی بھرائی ہوئی آواز میں بولیں ''اور شہزادہ نے کیا لکھا ہے؟''

ان کی بات کا کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بازاروف اور ارکادی نے جلد ہی بھانپ لیا کہ خالہ جان کی یوں عزت کی جاتی ہے، لیکن ان کی بات کوئی نہیں سنتا۔

''اپنے اعلیٰ خاندان کی وجہ سے'' بازاروف نے سوچا.....

چائے کے بعد اینا سرگیونا نے تجویز پیش کی کہ باہر ٹہلنے چلنا چاہیے، لیکن اتنے میں بوندا باندی شروع ہوگئی اور خالہ جان کو چھوڑ کر باقی سب لوگ ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ تاشوں کا رسیا پڑوسی بھی آ پہنچا۔ اس کا نام پورفری پلاتونش تھا۔ گٹھا ہوا جسم، بھورے بال، چھوٹی چھوٹی ٹانگیں، خوش خلق، خوش طبع، اینا سرگیونا اب تک زیادہ تر بازاروف سے ہی باتیں کیے جارہی تھی۔ اس سے وہ پوچھنے لگی کہ ہم سے کھیلو گے؟ بازاروف رضامند ہو گیا۔

''ذرا ہوشیار رہنا'' اینا سرگیونا بولی ''پورفری پلاتونش اور میں مل کر آپ کو بری طرح ہرائیں گے۔'' پھر وہ کاتیا سے مخاطب ہو کر بولی ''اور کاتیا تم ارکادی نکولائی وچ کو کچھ گا

کر سناؤ۔ یہ گانے کے بہت شوقین ہیں۔ساتھ میں ہم بھی سنتے رہیں گے۔''

کاتیا طوعاً و کرہاً پیانو پہ پہنچی اور ارکادی اگر چہ موسیقی کا شائق تھا' لیکن اس وقت تو اس کے ساتھ بھی مجبوری کا نام صبر ہے والا مضمون ہو رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ مادام اوون تسوف اسے وہاں سے ٹالنا چاہتی ہے اور جیسا کہ اس عمر والے نوجوانوں کا دستور چلا آتا ہے۔اس کے سینے میں بھی ایک مبہم اور گرانبار موج امنڈ رہی تھی اور اس موج میں عشق کی پر چھائیاں نظر آ رہی تھیں۔ کاتیا پیانو کے پاس پہنچی۔ ارکادی سے نگاہیں بچاتے ہوئے اس نے دھیرے سے پوچھا''کیا سناؤں آپ کو؟''

ارکادی نے بے اعتنائی سے جواب دیا''جو آپ کا جی چاہے۔''

کاتیا نے اپنے طرز عمل میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہونے دی۔ اسی انداز میں اس نے پھر پوچھا''آپ کو کس قسم کی موسیقی زیادہ پسند ہے؟''

''کلاسیکی'' ارکادی کے لہجے میں بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

''آپ کو موزارت پسند ہے؟''

''جی مجھے موزارت پسند ہے۔''

کاتیا نے موزارت کا ایک نغمہ چھیڑا۔ اس نے نغمہ واقعی بہت خوبی سے پیش کیا' بلکہ صحت و صفائی کے معاملے میں حد سے زیادہ احتیاط برتی۔ وہ اکڑی ہوئی یوں بیٹھی تھی جیسے کڑی کمان کا تیر ہو۔ کیا مجال کہ ذرا ہلے جلے' آنکھیں باجے پہ جمی تھیں اور ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔ البتہ جب نغمہ ختم ہوا تو اس کے چہرے پہ شگفتگی پیدا ہوئی' بال ڈھیلے پڑ گئے اور ایک چھوٹی سی لَٹ اس کی سیاہ پلکوں پہ لہرانے لگی۔

نغمے کے اس آخری ٹکڑے سے ارکادی بہت متاثر ہوا جہاں خوشی سے بھر پور جادو بھری لہراتی ہوئی تان یکا یک پلٹا کھاتی تھی اور درد و الم کی کیفیت سے لبریز ایک لہر اٹھتی تھی.....لیکن اس نغمے سے اس کے دل میں جن خیالات کو تحریک ہوئی ان کا تعلق کاتیا سے مطلق نہیں تھا۔ اسے دیکھ کر تو بس اس نے اِتنا سوچا تھا''خیر لڑکی برا تو نہیں گاتی۔ یوں بھی وہ کچھ ایسی بری نہیں ہے۔''

نغمہ ختم ہو جانے کے بعد کاتیا نے پوچھا''بس؟'' اس کی انگلیاں ابھی باجے پر ہی

تھیں۔ ارکادی نے کہا ''اب میں آپ کو مزید زحمت دینے کی جرأت نہیں کرسکتا'' اور پھر اس نے اس سے موزارت کے متعلق باتیں کرنی شروع کر دیں۔ وہ اس سے پوچھنے لگا ''یہ نغمہ خود آپ کا انتخاب ہے یا کسی اور نے سوجھایا ہے؟'' لیکن کاتیا جواب میں منمنا منمنا کر رہ جاتی تھی۔ وہ اپنے آپ میں سکڑی جا رہی تھی۔ اپنی ذات کے خول میں سمٹی جا رہی تھی۔ جب اس پہ یہ واردات گزرتی تھی تو پھر آسانی سے وہ آپے میں نہیں آتی تھی۔ اس قسم کے موقعوں پر اس کا چہرہ سپاٹ تختی سا بن جاتا تھا' بلکہ اس سے حماقت برسنے لگتی تھی۔ دراصل وہ شرمیلی نہیں تھی' بلکہ جھینپی تھی۔ بہن کا اس پہ بہت رُعب تھا۔ اسی نے اسے پڑھایا لکھایا تھا' لیکن اِس حقیقت کا اسے احساس نہیں تھا۔ ارکادی پہ بالآخر یہ نوبت آئی کہ اس نے فیفی کو اپنے پاس بلا کر شفقت آمیز انداز میں مسکرا مسکرا کر اسے تھپکنا شروع کر دیا۔ وہ جتانا یہ چاہتا تھا کہ وہ کسی قسم کی بے کلی کا شکار نہیں ہے۔

کاتیا پھر اپنے پھولوں میں جٹ گئی۔

اِدھر بازاروف بازی پہ بازی ہار رہا تھا۔ اینا سرگیونا استادانہ شان سے کھیل رہی تھی۔ پورفری پلاتونش بھی غنیمت تھا۔ اِتنا تو تھا کہ وہ اپنے آپ کو سنبھالے رکھتا تھا۔ بازاروف بڑی معمولی سی رقم ہارا تھا' لیکن اتنی حقیر بھی نہیں تھی کہ وہ اسے خاطر ہی میں نہ لاتا۔

دوپہر کے کھانے پر اینا سرگیونا پھر نباتات کا ذکر نکال بیٹھی۔

وہ اس سے کہنے لگی ''کل صبح ٹہلنے چلیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ جنگلی پھولوں اور ان کی قسموں کے لاطینی نام آپ مجھے سکھا دیں۔''

بازاروف نے جواب دیا ''لاطینی ناموں سے آپ کو کیا فائدہ پہنچے گا؟''

جواب دیا ''ہر چیز میں قرینہ ہونا چاہیے۔''

جب وہ دونوں اپنے مقررہ کمرے میں پہنچے اور اکیلے رہ گئے تو ارکادی بیتاب ہو کر بولا ''اینا سرگیونا غضب کی عورت ہے۔''

بازاروف نے جواب دیا ''اس مادہ کے بھیجے میں دماغ موجود ہے۔ یوں بھی وہ دنیا دیکھے ہوئے ہے۔''

''یوگینی وسل یوچ۔ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''اچھا ہی مطلب ہے۔ ارکادی دوست ۔ میرا مطلب اچھا ہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جائداد کا انتظام بہت سلیقے سے کرتی ہے' لیکن غضب کی چیز جو ہے وہ وہ نہیں' بلکہ اس کی بہن ہے۔''

''کیا؟ وہ کالی کلوٹی لونڈیا؟''

''ابھی وہ تازہ تازہ پھل ہے۔ کسی کا ہاتھ نہیں لگا ہے۔ شرمیلی ہے' خاموش ہے اور جو کچھ سمجھ لو وہ ہے۔ وہ اس قابل ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت کی جائے۔ تم چاہو تو اسے سانچے میں ڈھال سکتے ہو' لیکن یہ دوسری عورت ۔ یہ تو باسی روٹی ہے۔''

ارکادی نے بازاروف کو کوئی جواب نہیں دیا۔ دونوں اپنے اپنے بستر میں جا لیٹے ۔ دونوں کے ذہن میں عجیب وغریب خیالات چکر لگا رہے تھے۔

اینا سرگیونا کے دماغ میں بھی اس شام اپنے مہمانوں کا خیال آیا تھا۔ اسے بازاروف کی یہ ادا بہت پسند تھی کہ اسے عاشقانہ ناز برادری کا لپکا نام کو نہیں تھا اور پھر اس کے خیالات بہت واضح اور روشن تھے۔ اس میں ایک نئی بات پائی جاتی تھی' ایسی بات جو اس نے آج سے پہلے کبھی کسی میں نہیں دیکھی تھی اور اسے اِس بات کی کرید تھی۔

اینا سرگیونا بھی دنیا جہان سے نرالی تھی۔ نہ تو وہ کسی خاص قسم کے تعصّبات کے جھمیلے میں گرفتار تھی' نہ کسی عقیدے کا دُم چھلّا اس کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنی بات پر اڑی رہتی تھی۔ کیا مجال کہ ذرا نرم پڑ جائے۔ اس نے بہت سی باتیں دیکھی تھیں۔ بہت سی باتوں سے اسے دلچسپی رہی تھی' لیکن کبھی کسی بات سے اس کی پوری تشفی نہیں ہوئی۔ غالباً مکمل تسکین کی تو وہ خواہشمند بھی نہیں تھی۔ اس میں کرید کا مادہ بھی تھا اور ساتھ میں بے اعتنائی کا عنصر بھی شامل تھا۔ اس کے شبہات طاقِ نسیاں کے نقش ونگار تو کبھی نہیں بنے' لیکن ان میں اتنی توانائی بھی کبھی پیدا نہیں ہوئی کہ خیالات میں پراگندگی پیدا کر دیتے۔ اگر وہ امیر کبیر اور خودمختار نہ ہوتی تو وہ زندگی کی جدوجہد میں کود پڑتی اور اسے خیالات اور جذبات کی طوفان خیزیوں کا تجربہ ہو جاتا' لیکن اس کے لیے تو زندگی میں چین ہی چین تھا۔ اگرچہ اس چین سے بھی اسے کبھی کبھی کوفت ہونے لگتی تھی۔ عیش سے دن گزرتے تھے۔ سکھ کی نیند سوتی تھی۔ کسی قسم کی ہنگامہ خیزی کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دیا۔ وہ اطمینان تھا کہ کبھی تلوے میں کانٹا

بھی نہیں چھپا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا تھا کہ قوس قزح کے رنگوں میں شرابور خواب اس کی آنکھوں میں ناچنے لگتے تھے، لیکن کیفیت یہ تھی کہ ان خوابوں کے تحلیل ہو جانے کے بعد وہ اطمینان کا سانس لیتی تھی۔ اس نے ان کا غم کبھی نہیں کیا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ اس کا تخیل بیباک ہو کر ان حدوں کو پھلانگ جایا کرتا تھا، جو رسمی اخلاقیات نے قائم کر رکھی ہیں، لیکن اس وقت بھی اس کے دلفریب اور شاداب جسم میں خون اسی سکون سے گردش کرتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے خوشبوؤں سے بسے ہوئے حمام سے تروتازہ ہو کر نکلتی اور زندگی کے کھوکھلے پن پر، اس کے غم و آلام پر، اس کی کینہ توزی پر غور کرنے لگتی اور خیالات میں غرق ہو جاتی...... اس کی روح کی گہرائی میں اچانک ایک چنگاری چمکتی اور سرسراتی ہوئی چلتی، لیکن اتنے میں کھڑکی کے آدھ کھلے پٹوں سے ہوا کا ایک جھونکا آتا اور اینا سرگیونا پھر اپنے آپ میں سمٹنے لگتی اور ملول ہو جاتی، بلکہ اسے غصہ آنے لگتا اور اس وقت اس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی کہ ہوا کے اس مکروہ جھونکے سے اسے نجات مل جائے۔

ان تمام عورتوں کی طرح جو محبت میں ناکام رہتی ہیں، وہ بھی کسی شے کی خواہاں تھی۔ کون سی شے، یہ وہ خود نہیں جانتی تھی۔ اصل میں پوچھئے تو وہ کسی چیز کی بھی خواہاں نہیں تھی۔ بس اسے یوں لگتا تھا کہ وہ ہر چیز کی خواہاں ہے۔ مرحوم اودن تسوف کو وہ بالکل نہیں سہار سکتی تھی (اس نے مآل اندیشی کا پاس کرتے ہوئے اس سے شادی کی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اگر وہ اسے اچھا آدمی نہ سمجھتی تو اس کی بیوی بننے پہ رضامند نہ ہوتی) وہ دل ہی دل میں سارے مردوں سے نفرت کرتی تھی۔ اس نے یہ تصور باندھ رکھا تھا کہ مرد بڑی گندی، کاہل اور بھاری بھر کم قسم کی مخلوق ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ روس سے باہر کسی مقام پر سویڈن کے ایک سجیلے نوجوان سے اس کی مڈھ بھیڑ ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں نیلی نیلی تھیں۔ چہرے سے مردانگی کے جوہر عیاں تھے۔ اس سے وہ بہت متاثر ہوئی تھی، لیکن یہ واقعہ اس کے روس واپس آنے میں رکاوٹ نہیں بن سکا۔

وہ سوچنے لگی "یہ ڈاکٹر عجیب و غریب آدمی ہے۔" وہ اپنے زرق برق بستر میں لیٹی ہوئی تھی۔ ہلکے ریشمیں تکیہ والے تکیہ پر اس کا سر ٹکا ہوا تھا...... اس کا باپ ٹرک بھڑک کا رسیا تھا۔ اینا سرگیونا کو بھی وراثت میں تھوڑا سا یہ شوق مل گیا تھا۔ اپنے گنہگار

لیکن نیک طینت باپ پہ وہ جان چھڑکتی تھی اور وہ بھی اسے اپنی آنکھوں کا تارا سمجھتا تھا۔ وہ اس سے ایسے دوستانہ انداز میں ہنسی مذاق کرتا تھا گویا وہ اس کے برابر کی ہے۔ اپنا ہر راز اسے بتاتا اور ہر معاملے میں اس سے مشورہ طلب کرتا۔ رہی ماں تو وہ اسے یاد نہیں تھی۔

''یہ ڈاکٹر عجیب و غریب آدمی ہے۔'' اس نے دل ہی دل میں یہ فقرہ پھر دہرایا۔ اس نے ایک انگڑائی لی' مسکرائی' اپنے ہاتھ سر کے نیچے رکھ لیے۔ پھر ایک بیہودہ سے فرانسیسی ناول کے دو صفحے الٹ پلٹ کر دیکھے۔ کتاب پھینک دی اور اس پہ غنودگی چھا گئی۔ تن زیب کے معطر اور پاکیزہ لباس میں ڈھکا ہوا پاکیزگی اور خنکی کا ایک مجسمہ دراز تھا اور نیند کی پریوں نے اس پہ سایہ کر رکھا تھا۔

دوسرے دن صبح کو ناشتے کے فوراً بعد اینا سرگیونا بازاروف کے ہمراہ جڑی بوٹیوں کے چکر میں باہر نکل گئی اور رات کے کھانے سے بس اِک ذرا دیر پہلے واپس لوٹی۔ ارکادی کہیں نہیں گیا۔ البتہ کاتیا کے ساتھ ایک گھنٹہ اس نے ضرور گزارا۔ وہ اس سے اکتایا تو نہیں۔ اس نے خود ہی اس نغمہ کو پھر پیش کرنے کی درخواست کی جو وہ کل پیش کر چکی تھی' لیکن جب مادام اودن تسوف واپس آئی اور اس نے اسے دیکھا تو یکایک اس کے دل میں ایک کسک پیدا ہوئی۔ وہ باغ میں سے ہو کر آئی۔ چال بتا رہی تھی کہ وہ تھک گئی ہے' لیکن اس کے رخسار دمک رہے تھے اور اس کے تنکوں کے گول ہیٹ کے نیچے آنکھیں معمول سے زیادہ چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ ایک جنگلی پھول کی پتلی سی جڑ کو وہ اپنی انگلیوں میں البیٹ دے رہی تھی۔ جھالر کا ایک کونہ ڈھلک کر اس کی کہنی پہ آ گیا تھا اور اس کے ہیٹ کی بادامی ربن کی لڑیاں اس کے سینے کو چھو رہی تھیں۔ بازاروف اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ خود اعتمادی اور لاپروائی کا وہ انداز بدستور قائم تھا' لیکن اس کے چہرے پہ جو کیفیت تھی اور جس میں بشاشت کا رنگ تھا' ارکادی کو پسند نہ آئی۔ بازاروف نے منہ ہی منہ میں 'آداب عرض' کیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا اور مادام اودن تسوف نے کھوئے کھوئے انداز میں ارکادی سے ہاتھ ملایا اور گزری چلی گئی۔

''آداب عرض' ارکادی سوچ رہا تھا'' گویا صبح تو ہماری ملاقات ہوئی نہیں تھی۔''

(17)

وقت کی کیفیت عالم آشکارا ہے۔ کبھی وہ چڑیا کی طرح پُھر سے اڑ جاتا ہے، کبھی وہ کیڑے کی طرح رینگتا چلتا ہے، لیکن آدمی مخصوص طور پر اس صورت میں خوشی محسوس کرتا ہے جب اسے یہ پتہ نہ چلے کہ آیا وقت تیزی سے دوڑ رہا ہے یا آہستہ آہستہ گزر رہا ہے۔ ارکادی اور بازاروف نے مادام اودن تسوف کے یہاں کچھ اسی انداز میں ایک پندرواڑہ گزارا۔ اِس میں ایک حد تک اس قرینے کو بھی دخل ہے، جو مادام نے اپنے گھر میں اور اپنی زندگی میں پیدا کیا تھا۔ وہ خود اس قرینے کی سختی سے پابند تھی اور دوسروں کو بھی اس کی پابندی پہ مجبور کرتی تھی۔ چوبیسوں گھنٹوں میں جو کام بھی ہوتا تھا، وہ ایک مقررہ وقت پہ ہوتا تھا۔ صبح کے وقت ٹھیک آٹھ بجے سب لوگ چائے پر جمع ہوتے تھے۔ صبح کی چائے سے کھانے کے وقت تک ہر شخص اپنی اپنی مرضی کا کام کرتا۔ مالکہ خود اپنے کارندے (جائداد میں لگان داری کا طریقہ رائج تھا) اپنے خانساماں اور اپنے مکان کے مہتمم کے قصے نبٹاتی رہتی۔ رات کے کھانے سے پہلے لوگ پھر جمع ہوتے اور بات چیت ہوتی یا پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوتا۔ شام کا وقت ٹہلنے، تاش کھیلنے اور گانے بجانے کے لیے مخصوص تھا۔ ساڑھے دس بجے رات کو اینا سرگیونا اپنے کمرے میں واپس جاتی، دوسرے دن کے لیے ہدایات کرتی اور سو جاتی۔ بازاروف کو روزمرہ زندگی میں یہ نپی تلی اور اک ذرا نمائشی پابندیٔ اوقات نہیں بھائی۔ بقول اس کے یہ تو گویا پٹری پہ چلنا تھا۔ باوردی چوبداروں اور مؤدب خانساماؤں کو دیکھ کر اس کے جمہور پرستانہ جذبات کو ٹھیس لگتی تھی۔ اس نے کہا کہ اگر نوبت یہاں تک پہنچی ہے تو پھر کھانا بھی انگریزی طرز میں یعنی سفید ٹائی اور ٹیل کوٹ ڈاٹ کر کیوں نہ کھایا جائے۔ ایک مرتبہ تو اس نے اینا سرگیونا کے منہ پہ صاف صاف یہ باتیں کہہ دیں۔ اس کا طرزِ عمل بھی کچھ ایسا تھا کہ کسی کو اس کے سامنے بے تکلفی سے دل کی بات کہتے ہوئے جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس نے اس کی باتیں سنیں اور اس کا جواب یہ تھا "اپنے نقطۂ نظر کے مطابق آپ درست کہتے ہیں اور غالبًا اس معاملے میں مَیں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی بیگماتی آداب برتتی

ہوں، لیکن گاؤں میں رہ کر ان ادب و آداب کے سوا چارہ نہیں ہے۔ یہ ادب و آداب نہ برتے جائیں تو بیزاری کی وجہ سے جینا دوبھر نہ ہو جائے۔" اور ڈھرا بدستور جاری رہا۔ بازاروف بڑبڑایا تو بہت، لیکن اودن تسوف کے یہاں اس کی اور ارکادی کی جو چین سے گزر رہی تھی، اس کی وجہ بھی یہی تو تھی کہ اس گھر کی پوری زندگی "پٹری پہ چلتی تھی۔" اِن ساری باتوں سے قطع نظر ان دونوں نوجوانوں میں اسی دن سے جس دن سے وہ یہاں آ کر رہ رہے تھے، ایک تبدیلی پیدا ہو چلی تھی۔ یہ تو کھلی ہوئی بات تھی کہ اینا سرگیونا بازاروف میں دلچسپی لیتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس کی رائے سے اتفاق شاذ و نادر ہی کرتی تھی۔ وہ اب اکھڑا اکھڑا رہنے لگا تھا، حالانکہ اس سے پہلے کبھی اس میں اس قسم کی کوئی علامت نہیں دیکھی گئی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پہ اس کا پارہ چڑھ جاتا تھا۔ بولنے بات کرنے سے اسے خفقان ہوتا تھا۔ وہ کچھ چڑچڑا سا ہو گیا تھا اور کسی ایک جگہ پر اس سے ٹک کر نہ بیٹھا جاتا تھا۔ بس یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی چھپی ہوئی خواہش نے اسے اپنی گرفت میں جکڑ رکھا ہے۔ اور ارکادی تو قطعی طور پر یہ طے کر ہی چکا تھا کہ وہ مادام اودن تسوف کے عشق میں مبتلا ہے۔ اب اس کے مزاج میں ہلکی ہلکی افسردگی پیدا ہو چلی تھی۔ تاہم یہ افسردگی کاتیا سے گھلنے ملنے میں رکاوٹ نہیں بنی، بلکہ اس نے تو اُلٹا اسے اِن تعلقات کو اور بڑھانے پہ اکسایا۔ وہ سوچا کرتا "وہ تو مجھے منہ ہی نہیں لگاتی۔ اچھا یونہی سہی...... لیکن خیر یہ غریب لڑکی شریف ہے۔ مجھ سے بدکتی تو نہیں ہے۔" اور اس کے دل میں بلند پایہ جذبات کروٹیں لینے لگتے۔ کاتیا کو بس ایک وہم سا تھا کہ یہ شخص اپنے دُکھے ہوئے دل کو محض تسکین دینے کی غرض سے مجھ سے ملتا جلتا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو یا اسے اس دوستی کی معصوم مسرت سے محروم کرنا مناسب نہ سمجھا، جس میں ایک لیا دیا پن تھا۔ ایک رُکی رُکی سی کیفیت تھی۔ اینا سرگیونا کے سامنے کبھی ان کی آپس میں باتیں نہیں ہوتی تھیں۔ کاتیا غریب تو بہن کے سامنے بھیگی بلی بن جاتی تھی اور ارکادی کا حال یہ تھا اور یہ حال ایک عاشق کو زیب بھی دیتا ہے کہ جہاں اس کے دل کی ملکہ سامنے آئی، بس پھر اسے دنیا جہاں کی کسی چیز کا ہوش ہی نہ رہتا تھا۔ کاتیا سے تو وہ بس اکیلے میں دل خوش کرتا تھا۔ اسے اس کا خوب احساس تھا کہ مادام اودن تسوف کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں ہے۔ اگر کبھی اس کے ساتھ اسے تنہائی میسر بھی آتی تھی، تو

اس کے اوسان خطا ہو جاتے اور شرم کے مارے پسینہ پسینہ ہو جاتا اور وہ یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اس سے بات کیا کرے۔ وہ تو اس کے لیے بالکل بچہ تھا، لیکن کاتیا کے ساتھ وہ خوب بے تکلفی برتتا تھا۔ اس سے بڑی نرمی سے پیش آتا اور اسے اس پہ آمادہ کیا کرتا کہ گانوں، ناولوں، نظموں اور اس قسم کی دوسری طفلانہ چیزوں سے اس کے دل میں جو تاثرات پیدا ہوتے ہیں، ان کا اظہار کرے۔ اس مردِ خدا کو یہ مطلق احساس نہیں تھا کہ انہیں طفلانہ چیزوں سے خود اسے بھی دلچسپی ہے۔ کاتیا نے اپنی طرف سے اس کی افسردگی کو دُور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ارکادی کی کاتیا سے خوب گھٹتی تھی اور مادام اودن تسوف کی بازاروف سے گاڑھی چھنتی تھی اور اس لیے اکثر یوں ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر ساتھ رہنے کے بعد یہ دونوں جوڑے الگ الگ اپنے رستوں پہ پڑ لیتے تھے۔ بالخصوص ٹہلتے وقت یہ صورت ضرور پیش آتی تھی۔ کاتیا فطرت کی پرستار تھی اور ارکادی اس کا شیدائی تھا۔ اگرچہ وہ یہ تسلیم کرنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ مادام اودن تسوف بازاروف کی طرح فطرت کی رعنائیوں سے کچھ بے اعتنا سی تھی۔ دونوں دوستوں میں مستقل طور پر جو یہ علیحدگی پیدا ہو چلی تھی، وہ آخر کب تک اپنا اثر نہ دکھاتی۔ ان کے باہمی تعلقات کی شکل بدلنا شروع ہوگئی۔ بازاروف نے ارکادی سے مادام اودن تسوف کے متعلق باتیں کرنا چھوڑ دی تھیں۔ اب اس کے رئیسانہ طور طریقوں پر بھی لعنت کی بوچھاڑ ہونی بند ہوگئی تھی۔ یہ درست ہے کہ کاتیا کی وہ اب بھی تعریف کرتا تھا اور ارکادی کو یہ مشورہ دیتا رہتا تھا کہ اس کی جذباتیت میں اعتدال پیدا کرنے کی کوشش کرو، لیکن اس کی تعریفیں اِک چلتی ہوئی سی بات تھی۔ اس کے مشورے خشک ہوتے تھے۔ وہ اب عام طور پر ارکادی سے بہت کم بات کرتا تھا...... یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس سے کتراتا ہے۔ اس کے ساتھ رہنے سے گھبراتا ہے۔

ارکادی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، لیکن اس نے اپنی دیکھی ہوئی باتیں اپنے ہی تک محدود رکھیں۔

بازاروف میں اِس ساری تبدیلی کا اصل سبب وہ جذبہ تھا جو مادام اودن تسوف کو دیکھ کر اس کے سینے میں بیدار ہوا تھا۔ اِس جذبے نے اسے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اسے ٹیسیں پہنچا رہا تھا، لیکن اگر کوئی اشارے کنائے میں بھی اس کے دل کی کیفیت کا ذکر کر دیتا تو وہ

اس سے فوراً مکر جاتا اور اسے کلبیت آمیز جملوں اور حقارت آمیز ہنسی میں اڑا جاتا۔ بازاروف عورتوں اور نسوانی حسن کا شیدائی تھا، لیکن مثالی محبت یا بقول اس کے رومانیت زدگی اسے وہ جنون بتاتا تھا، نا قابل معافی بزدلی سے تعبیر کرتا تھا۔ رومان پرور جذبات کے متعلق وہ یہ کہا کرتا تھا کہ اسے ایک قسم کی کجی سمجھئے یا پھر یہ کوئی بیماری ہے۔ اس نے کئی مرتبہ اس پہ بڑے تعجب کا اظہار کیا تھا کہ شلر کے تو گنسبرگ اور دوسرے تمام مطربوں اور نغمہ گروں اور رومانی شاعروں کو آخر پاگل خانے کیوں نہیں بھیجا گیا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا ''اگر کسی عورت نے تمہارا دل اڑا لیا ہے، تو کوشش کر کرا کے گنگا نہالو، لیکن اگر تم سے معاملہ نہیں پٹتا تو چھٹی کرو۔ سمندر میں مچھلیوں کی کیا کمی۔ ایک جائے گی دوسری آئے گی۔ کانٹا سلامت رہے۔''

مادام اودن تسوف نے اس کا دل اڑا لیا تھا۔ اس کے متعلق جو افواہیں گرم تھیں، اس کی آزادہ روی اور اس کی آزاد خیالی کے متعلق جو افسانے مشہور تھے، خود اس پہ جس شدت سے وہ مائل تھی، یہ سب باتیں اس کے حق میں جاتی تھیں، لیکن اس نے بہت جلد یہ بات تاڑ لی کہ یہاں گنگا اشنان نہیں ہوگا۔ اب رہا چھٹی کرنے کا معاملہ، سو یہ انکشاف خود اس کے لیے تکلیف دہ تھا کہ یہ چیز اس کے قابو سے باہر ہے۔ اس کا خیال بھی اگر اسے آجاتا تو سینے میں ایک آگ سی بھڑک اٹھتی تھی۔ وہ اس آگ پہ قابو پا تو لیتا، لیکن وہاں تو کوئی اور ہی چیز جڑ پکڑ رہی تھی، ایسی چیز جس کے وجود کو اس نے کبھی تسلیم ہی نہیں کیا تھا، جس کا اس نے ہمیشہ مذاق اڑایا تھا، جس کے خلاف اس کا احساسِ خودداری علم بغاوت بلند کر دیتا تھا۔ اینا سر گیونا سے جب باتیں ہوتی تھیں، تو وہ اب پہلے سے بھی کہیں زیادہ شدت کے ساتھ ہر اس چیز کے خلاف اپنی خاموش نفرت کا اظہار کرتا تھا، جس میں مثال پرستی کا شائبہ ہوتا، لیکن تنہائی میں اسے یہ محسوس کر کے تاؤ آتا کہ خود اس میں مثال پرستی کا رجحان پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ پھر وہ جنگل کی طرف نکل جاتا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلتا۔ اس کے راستے میں جو کونپلیں اور بیلیں آئیں، انہیں کھوندتا کچلتا چلا جاتا اور چپکے چپکے اسے اور اپنے آپ کو کوسنے دیتا، یا پھر وہ اناج گھر کے آس پاس کہیں گھاس پھونس پہ جا لیٹتا اور زبردستی آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو سونے پہ مجبور کرتا، مگر اس میں وہ ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتا تھا۔ یکا یک وہ تصور کی دنیا میں پہنچ جاتا۔ وہ پاکیزہ بازو اس کی گردن میں حائل ہو جاتے۔ وہ مغرور لب اس کے بوسوں کی گرمی سے

بیدار ہوکر کانپنے لگتے' ان ذہین آنکھوں میں محبت کا عکس جھلکنے لگتا ___ ہاں محبت کا عکس۔ پھر اس کا سر چکرانے لگتا' ایک لمحہ کے لیے وہ اپنے آپ کو بھول جاتا اور پھر غصے کا وہ طوفان اُمنڈ آتا۔ اس نے اپنے آپ کو قسم قسم کے شرمناک خیالات میں غرق پایا تھا۔ کوئی خبیث روح اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے اور اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔ کبھی کبھی اسے یہ گمان ہونے لگتا کہ مادام اَوون تسوف میں بھی تبدیلی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے چہرے پہ خاص قسم کی کیفیات ظاہر ہونے لگی ہیں۔ شاید...... لیکن اس مقام پر پہنچ کر وہ پاؤں پٹخنے لگتا' دانت پیستا اور مٹھیاں بھینچتا۔

دراصل بازاروف بالکل غلطی پر بھی نہیں تھا۔ اس نے مادام اوون تسوف کے تخیل کو چونکایا تو ضرور تھا' اس میں وہ دلچسپی بھی لیتی تھی اور اس کے متعلق بہت کچھ سوچتی بھی تھی۔ یہ تو نہیں ہوتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں کوفت سے جان لب پہ آ جائے۔ نہ وہ بے صبرے پن سے اس کی آمد کا انتظار کرتی تھی' لیکن اس کے آنے سے اس میں ایک نئی جان ضرور پڑ جاتی تھی۔ اس کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ وہ دونوں اکیلے ہی رہ جائیں اور اس کا جی چاہتا کہ اس سے باتیں کیے جائے۔ خواہ وہ اپنی باتوں سے اسے ستاتا یا اس کے مذاق کو اس کے رکھ رکھاؤ کو ٹھیس پہنچاتا۔ پھر بھی اس کی خواہش یہی ہوتی۔ وہ بیک وقت اس کی ٹوہ لینا بھی چاہتی تھی اور اپنا تجزیہ کرنے کی بھی خواہشمند رہتی تھی۔

ایک روز جب وہ اس کے ہمراہ باغ میں ٹہل رہا تھا' اس نے اچانک بڑی خشک سی آواز میں اعلان کیا کہ میں سوچ رہا ہوں کہ یہاں سے جلد اپنے باپ کے پاس چلا جاؤں...... اس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور ایسا معلوم ہوا کہ اس کے دل میں ایک ٹیس اُٹھ رہی ہے۔ یہ ایسی ٹیس تھی کہ بعد میں بھی اس نے بڑا تعجب کیا اور بہت سوچا کہ آخر اس کا مطلب کیا ہوسکتا ہے۔ بازاروف نے اپنی روانگی کا اعلان اس مقصد سے نہیں کیا تھا کہ اس کا امتحان لیا جائے' یہ دیکھا جائے کہ اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ وہ جال کبھی نہیں پھیلاتا تھا۔ اس روز صبح کو اس کے باپ کے کارندے تموفش سے' جس نے بچپن میں اس کی دیکھ بھال کی تھی' اس کی مڈھ بھیڑ ہوگئی تھی۔ یہ تموفش بھی خوب تھا۔ ٹھگنا قد' بڑا تجربہ کار' بڑا کائیاں' بھورے بھورے بال' سونتا ہوا سرخ چہرہ' سکڑی ہوئی آنکھوں میں آنسو کی چھوٹی چھوٹی

بوندیں چھلکا کرتی تھیں۔ جانے کہاں سے اچانک بازاروف پہ آن نازل ہوا۔ ہلکے نیلے رنگ کا اونچا سا کوٹ پہن رکھا تھا۔ چمڑے کی ایک پٹی کو پیٹی کے طور پر کمر میں باندھ رکھا تھا اور تیل میں بھیگے ہوئے بوٹ پیروں میں تھے۔

''ہاہا... بڑے میاں کیسے ہو؟'' بازاروف نے پھڑک کر کہا۔

''یوگینی وسل یوچ۔ تم کیسے ہو میاں؟'' اِن الفاظ کے ساتھ خوشی کی ایک لہر اس کے چہرے پر دوڑ گئی اور وہ کچھ اس طرح مسکرایا کہ اس کا پورا چہرہ سلوٹوں سے ڈھک گیا۔

''تم کس لیے آئے ہو؟ کیا انہوں نے مجھے بلانے بھیجا ہے؟''

''اجی قسم لے لو جو انہوں نے مجھے بھیجا ہو۔ لو جی! وہ کیوں بھیجتے؟'' تموفش ہڑبڑا کر کہنے لگا (اس کے آقا نے روانگی کے وقت جس سختی سے اسے جو جو ہدایات کی تھیں، وہ اسے سب یاد تھیں) ''مجھے تو جی کام سے شہر بھیجا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ میاں آئے ہیں، سو میں اِدھر ہو لیا کہ میاں کو ایک نظر دیکھتا چلوں۔''

بازاروف نے اسے ٹوکا ''دیکھو جی جھوٹ مت بولو! شہر جانے کا یہ کون سا راستہ ہے؟ مجھے چلاتے ہو؟'' تموفش ہچکچا کر رہ گیا۔ غریب کو کوئی جواب ہی بن نہ پڑا۔ ''ہمارے باوا جان تو اچھے ہیں؟''

''ہاں جی! اللہ کا شکر ہے۔''

''اور ہماری اماں؟''

''وہ بھی اچھے ہیں۔ اوپر والے کا کرم ہے۔''

''میرا وہ انتظار کر رہے ہوں گے؟''

بڈھے نے اپنا سر ایک طرف کو جھکا لیا اور کہنے لگا ''یوگینی وسل یوچ انہیں دیکھ کے تو بڑا دل دُکھے ہے۔ سچ کہہ رہا ہوں میاں۔''

''اچھا سن لیا۔ یہ بکواس بند کرو۔ ان سے کہہ دینا کہ میں جلد آؤں گا۔''

تموفش نے ٹھنڈا سا سانس بھرا اور جواب دیا ''بہت اچھا جی۔''

گھر سے نکل کر اس نے دونوں ہاتھوں سے ٹوپی کھینچ کر سر کے نیچے تک کر لی۔ ایک سڑیل سی گاڑی میں جا بیٹھا اور گاڑی معمولی رفتار سے چل پڑی، لیکن اس کا رُخ شہر کی

سمت نہیں تھا۔

اسی شام کا ذکر ہے کہ مادام اوون تسوف اپنے کمرے میں بازاروف کے ساتھ بیٹھی تھی اور ہال میں ارکادی ٹہل ٹہل کر کاتیا کا گانا سن رہا تھا۔ شہزادی صاحبہ اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ وہ یوں بھی مہمانوں کو سہار نہیں سکتی تھیں اور بالخصوص بقول ان کے اِن اجڈ مہمانوں کو۔ کامن روم میں بیٹھ کر وہ جمائیاں لینے لگتی تھیں، لیکن اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ اس کی کمی پوری کر لیتی تھیں اور خادمہ پہ اِس بری طرح برستی تھیں کہ ان کے سر کی دستار لرزلرزا اٹھتی تھی۔ مادام اوون تسوف یہ سب کچھ جانتی اور سمجھتی تھی۔

وہ کہنے لگی ''آخر بات کیا ہے، جو آپ یہاں سے جا رہے ہیں۔ وہ آپ کا وعدہ کیا ہوا؟''

بازاروف چونک پڑا ''کون سا وعدہ؟''

''بھول گئے؟ مجھے تم نے کیمسٹری کے چند سبق پڑھانے کا وعدہ کیا تھا۔''

''کیا کیا جائے مجبوری ہے۔ میرا باپ میرا انتظار کر رہا ہے۔ اب زیادہ دیر تک میں نہیں ٹھہر سکتا، مگر اس میں کیا ہے آپ پیلوز اور فریمی کی کتاب ''کیمسٹری کے عام اصول'' پڑھ ڈالیں۔ اچھی کتاب ہے۔ سلجھے ہوئے انداز میں لکھی ہوئی ہے۔ آپ جو باتیں جاننا چاہتی ہیں، وہ سب اس میں مل جائیں گی۔''

''لیکن آپ کو یاد ہے۔ آپ نے مجھے یہ یقین دلایا تھا کہ کتاب اس کی جگہ نہیں لے سکتی اس کی...... لیجیے میں بھول گئی۔ آپ نے جانے کیا کہا تھا، لیکن خیر آپ جانتے ہیں کہ میرا مطلب کیا ہے...... آپ کو یاد ہے نا؟'

''مجبوری ہے!''

''مگر آپ کیوں جا رہے ہیں؟'' مادام اوون تسوف کی آواز ڈھیلی پڑ گئی تھی۔

اس نے اسے نظر بھر کے دیکھا۔ اوون تسوف کا سر ڈھلک کر کرسی کی پشت پر جا ٹکا تھا۔ اس کے کہنیوں تک برہنہ شانے اس کے سینے پہ ٹکے ہوئے تھے۔ لیمپ کی روشنی جالی دار کاغذی شیڈ سے چھن چھن کر اس کے چہرے پہ پڑ رہی تھی اور اس روشنی میں اس کا چہرہ کچھ زیادہ پیلا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک ڈھیلے ڈھالے سفید گاؤن کی نرم آغوش نے اسے

پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے پیروں کی انگلیاں بھی مشکل ہی سے نظر آ رہی تھیں۔

بازاروف نے جواب دیا ''مگر میں ٹھہروں کیوں؟''

مادام اودن تسوف نے اک ذرا پھر کر اسے دیکھا اور کہنے لگی ''آپ پوچھتے ہیں کیوں ٹھہروں؟ کیا میری صحبت میں آپ کو ذرا لطف حاصل نہیں ہوا؟ اور کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کی جدائی کو میں محسوس نہیں کروں گی؟''

''سمجھنا کیا معنی' اس کا مجھے یقین ہے۔''

مادام اودن تسوف منٹ بھر خاموش رہی ''آپ کا خیال غلط ہے' لیکن مجھے آپ کا اعتبار نہیں۔ آپ سنجیدگی سے ایسی بات نہیں کہہ سکتے۔'' بازاروف بدستور بت بنا بیٹھا تھا ''یوگینی وسل یوچ۔ آخر آپ بولتے کیوں نہیں؟''

''آخر میں آپ سے کیا کہوں؟ لوگ عام طور پر اتنی اہم حیثیت نہیں رکھتے کہ ان کی جدائی محسوس کی جائے اور میں تو خیر سب سے ہی گیا گزرا ہوں۔''

''آخر کیوں؟''

''میں ٹھہرا عملی قسم کا غیر دلچسپ سا آدمی۔ میں تو ڈھنگ سے بات کرنا بھی نہیں جانتا۔''

''یوگین وسل یوچ۔ یہ آپ گول مول باتیں کیوں کر رہے ہیں؟''

''یہ میری عادت نہیں ہے۔ کیا آپ خود یہ نہیں جانتیں کہ تہذیب و شائستگی سے مجھے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے اور آپ اِن چیزوں کو بڑی اہمیت دیتی ہیں۔''

مادام اودن تسوف اپنے رومال کا کونہ دانتوں میں دبا کر چبانے لگی۔ ''یوں آپ کا جو چاہے خیال قائم کر لیں' لیکن اگر آپ چلے گئے تو مجھے ہوگی بہت کوفت۔''

''ارکادی تو یہاں رہے گا!'' بازاروف بولا۔

مادام اودن تسوف نے کاندھے مچکائے اور کہنے لگی ''مجھے بہت کوفت ہوگی۔''

''واقعی؟ بہر حال یہ کوفت زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہے گی۔''

''آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا؟''

''اس لیے کہ خود آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کو صرف اس وقت کوفت ہوتی ہے' جب آپ کے روزمرہ میں خلل پڑتا ہے۔ آپ نے تو اپنی زندگی میں اتنی سخت قسم کی تنظیم کر رکھی ہے کہ کوفت یا افسردگی کی...... کسی بھی ناخوشگوار جذبے کی اس میں گنجائش ہی نہیں ہے۔''

''کیا واقعی آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں ایسی سخت پتھر ہوں...... یعنی میں نے اپنی زندگی میں ایسی سخت تنظیم قائم کر رکھی ہے؟''

''میں تو یہی سمجھتا ہوں اور ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ ابھی چند منٹ میں دس بجنے والے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ دس بجتے ہی آپ مجھے یہاں سے نکال باہر کریں گی۔''

''نہیں یوگینی وسل یوچ۔ میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔ آپ یہاں ٹھہریں۔ وہ کھڑکی ذرا کھولیے...... میرا دَم گھٹا جا رہا ہے۔''

بازاروف اُٹھ کھڑا ہوا اور کھڑکی کو ایک دھکا لگایا۔ کھڑکی بڑے شور کے ساتھ دھڑ سے کھل گئی...... اسے درحقیقت یہ امید نہیں تھی کہ اتنی آسانی سے کھل جائے گی۔ پھر یہ کہ اس کے ہاتھ بھی تو کانپ رہے تھے۔ نرم و تاریک رات نے کمرے میں جھانکنا شروع کر دیا۔ آسمان پر چاروں طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ درختوں سے پتیوں کی جنبش کے باعث دھیما دھیما شور ہو رہا تھا اور صاف کھلی ہوا میں ایک شاداب عطر بیز کیفیت تیر رہی تھی۔

مادام اودن تسوف کہنے لگی ''پردے کھینچ دیجیے اور پھر تشریف رکھیئے۔ میں چاہتی ہوں کہ رخصت سے پہلے آپ سے کچھ باتیں کر لوں۔ آپ کچھ اپنے متعلق مجھے بتائیں۔ اپنا ذکر تو آپ کبھی کرتے ہی نہیں۔''

''اینا سرگیونا۔ میں کوشش یہ کرتا ہوں کہ آپ سے اعلیٰ موضوعات پر گفتگو کروں۔''

''آپ واقعی بڑی انکساری برتتے ہیں...... لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ آپ کے متعلق' آپ کے خاندان کے متعلق' آپ کے والد کے متعلق اور آپ کی والدہ کے متعلق جن کی خاطر آپ ہم سے جدا ہو رہے ہیں' کچھ معلوم ہو۔''

بازاروف سوچنے لگا۔ ''آخر وہ اِس انداز میں گفتگو کیوں کر رہی ہے؟'' پھر بلند

آواز سے بولا ''یہ سب باتیں بڑی غیر دلچسپ ہیں۔ بالخصوص آپ کے لیے۔ ہم ٹھہرے غریب گمنام لوگ.....''

''اور مجھے آپ رئیس سمجھتے ہیں؟''

بازاروف نے نگاہیں اٹھا کر مادام اودن تسوف کو دیکھا۔

''جی!'' اس نے ایک مبالغہ آمیز تیزی کے ساتھ کہا۔

وہ مسکرانے لگی۔ ''میں سمجھتی ہوں کہ آپ مجھ سے بہت کم واقف ہیں۔ آپ تو اس کے قائل ہیں کہ سب انسان ایک سے ہیں اور ہر ایک کے متعلق الگ الگ غور کرنا بیکار سی بات ہے۔ میں کسی وقت آپ کو اپنا حال سناؤں گی..... لیکن پہلے آپ اپنا حال سنائیے۔''

بازاروف نے اس کا فقرہ دُہراتے ہوئے کہا ''میں آپ سے بہت کم واقف ہوں۔ آپ بجا کہتی ہیں۔ شاید ہر شخص ایک معمہ ہوتا ہے۔ مثلاً آپ' آپ صحبت سے کتراتی ہیں' آپ کو صحبت سے خفقان ہوتا ہے اور آپ نے دو طلبہ کو اپنے یہاں مہمان بلایا ہے۔ پھر نہ جانے کیوں آپ جیسی ذہین اور حسین عورت دیہات کے ایک کونے میں پڑی ہے؟''

''جی؟ آپ نے کیا فرمایا؟'' مادام اودن تسوف نے بڑے شوق سے سوال کیا۔

''مجھ جیسی..... حسین؟''

بازاروف کی بھنویں تن گئیں۔ وہ بڑبڑانے لگا ''وہ کوئی بات نہیں تھی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں یہ سمجھ نہیں سکا کہ آخر آپ دیہات میں کیوں رہتی ہیں؟''

''آپ یہ نہیں سمجھتے..... لیکن آپ کسی نہ کسی طور پر اس کی توجیہ تو کرتے ہوں گے؟''

''جی..... میرا خیال یہ ہے کہ آپ نے یہاں مستقل طور پر اس وجہ سے قیام کر رکھا ہے کہ آپ آرام پسند ہیں۔ آپ عیش و آرام کی شوقین ہیں۔ باقی ہر چیز سے متنفر ہیں۔''

مادام اودن تسوف پھر مسکرائی۔ ''آپ یہ ماننے سے قطعاً انکار کر دیں گے کہ میں کسی بھی رو میں بہنے کی صلاحیت رکھتی ہوں؟''

بازاروف نے کنکھیوں سے اسے دیکھا، پھر کہنے لگا ''کرید کے شوق میں آپ کسی رو میں بہہ جائیں تو بہہ جائیں اور کوئی صورت تو نظر آتی نہیں ہے۔''

''واقعی؟ اب میں سمجھی کہ ہم اور آپ میں اتنی دوستی کیوں ہے؟ دیکھئے آپ بھی بالکل میری طرح ہیں۔''

''ہم میں اتنی دوستی ہے.....؟'' بازاروف بھنچی ہوئی آواز میں بولا۔

بازاروف اُٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے کی تاریک عیش پرور فضا میں لیمپ بدستور ٹمٹمارہا تھا۔ کبھی کبھی پردے کو جنبش ہوتی تھی اور رات کی شادابی تیرتی ہوئی کمرے میں آجاتی اور اس کی پُراسرار سرگوشیوں کی آواز سنائی دینے لگتی۔ مادام اودن تسوف بے حس وحرکت بیٹھی رہی، لیکن رفتہ رفتہ ایک ڈھکا ہوا جذبہ اُبھرا اور اس پہ طاری ہو گیا۔

اور اس جذبے کی آہٹ بازاروف نے بھی سن پائی۔ اسے اچانک احساس ہوا کہ وہ یہاں اکیلا ہے اور ایک جوان اور حسین وجمیل عورت......

''آپ کہاں جارہے ہیں؟'' وہ آہستہ سے بولی۔

اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ بس دھم سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اور آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں لاڈلی، باولی اور پوستی قسم کی عورت ہوں۔'' اس کا وہ لہجہ بدستور قائم تھا اور اس کی نگاہیں کھڑکی پہ جمی ہوئی تھیں۔ ''اور میں اپنے متعلق اتنا کچھ جانتی ہوں کہ مجھے ملال ہونے لگتا ہے۔''

''آپ اور ملال؟ آخر کیوں؟ آپ بے معنی افواہوں کو تو یقیناً اہمیت نہیں دیتی ہوں گی؟'

مادام اودن تسوف اس پہ بہت بھنائی۔ اس خیال سے اسے بڑی تکلیف ہوئی کہ بازاروف نے اس کے الفاظ سے اِس قسم کا مطلب نکالا۔

''یوگین وسل یوچ! اس قسم کی افواہوں کی تو میں ذرّہ برابر بھی پروانہیں کرتی۔ مجھ جیسی دماغ والی کوئی ہو تو سہی۔ ایسی باتوں کو تو میں خاطر ہی میں نہیں لاتی۔ میں تو اس وجہ سے ملول رہتی ہوں کہ...... مجھ میں امنگیں نہیں رہیں، جینے کی ہوس نہیں رہی۔ آپ مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ یہ رئیس عورت ہے، عیش کرتی ہے، زندگی کو

بسترِ سنجاب و سمور سمجھتی ہے اور میں یہ بات چھپاتی بھی نہیں۔ آپ جسے عیش و آرام کہتے ہیں' اس پہ واقعی میں جان چھڑکتی ہوں' لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ مجھ میں جینے کی امنگ نہیں ہے۔ اب آپ اس تضاد کی توجیہات کیسے چلے جائیے۔ لیکن آپ تو ان باتوں کو رومان زدگی سمجھتے ہیں۔''

بازاروف نے اپنے سر کو ایک جھٹکا دیا ''ماشاءاللہ آپ کی صحت خوب ہے۔ آپ خودمختار ہیں۔ دولت مند ہیں۔ آپ کو اور کیا ملتا' آخر آپ اور کیا چاہتی ہیں؟''

''میں اور کیا چاہتی ہوں؟'' مادام اودن تسوف ٹھنڈا سانس بھر کر بولی ''تھکن نے میرا چورا کر دیا۔ تھکن میری نس نس میں رچ گئی ہے۔ میری جوانی بیت گئی۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ میں ایک عمر' ایک بہت لمبی عمر گزار چکی ہوں۔ ہاں جوانی تو اب بیت ہی گئی۔'' اور اس نے اپنی جھالر کے کنارے آہستہ سے اپنے عریاں شانوں پر پھیلا دیئے۔ اس کی آنکھیں بازاروف کی آنکھوں سے جا لڑیں اور اس کے چہرے پہ حجاب کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔

''میرے بیتے ہوئے دنوں سے جانے کتنی یادیں وابستہ ہیں۔ میرا پیٹرسبرگ کا زمانہ' دولت کی ریل پیل' پھر غربت و افلاس' پھر باپ کی موت' شادی' مجبوری کا سفر...... کتنی یادیں ہیں اور کوئی یاد ایسی نہیں جسے یاد کیا جائے اور میرے سامنے ایک طول طویل راستہ چلا گیا ہے اور کوئی منزل نہیں کوئی مقصد نہیں...... یہ راستہ طے کرنے کی مجھ میں کوئی خواہش نہیں ہے۔''

''آپ کچھ مایوس معلوم ہوتی ہیں؟'' بازاروف نے سوال کیا۔

''نہیں! ہاں میں غیر مطمئن ضرور ہوں۔'' مادام اودن تسوف ایک ایک حرف پہ زور دے رہی تھی۔ ''میں سوچا کرتی ہوں کاش کسی چیز سے مجھے گہرا شغف ہوتا......''

بازاروف نے اسے ٹوک دیا ''آپ محبت کرنا چاہتی ہیں اور محبت کر نہیں سکتیں۔ بس یہ ہے آپ کے رنج و غم کی وجہ۔''

مادام اودن تسوف اپنی آستین کی جھالر کا جائزہ لینے لگی۔ پھر بولی ''کیا واقعی میں محبت نہیں کر سکتی؟''

''میں تو یہی کہوں گا کہ نہیں۔ میں نے بس اتنی غلطی کی ہے کہ اسے رنج و غم کی بات قرار دیا ہے۔ اس کے برخلاف زیادہ قابلِ رحم وہ شخص ہے جو اس بلا میں گرفتار

ہو جائے۔''

''بلا.... کیسی بلا؟''

''عشق کی بلا۔''

''مگر اس کا انکشاف آپ پر کیسے ہوا؟''

باز اروف نے تاؤ میں آ کر جواب دیا ''یہی لوگوں کی زبانی۔''

وہ سوچنے لگا ''تم مجھ سے نخرے کر رہی ہو' تمہارا حلیہ تنگ ہو رہا ہے۔تم مجھے دق کر رہی ہو تا کہ کچھ کیا جائے اور میں .....'' اور واقعی یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔اس نے اپنے آپ کو آگے کی طرف جھکا دیا اور کرسی کے کناروں سے کھیلتے ہوئے کہنے لگا ''اس کے علاوہ غالباً آپ.....''

''ممکن ہے۔ میں تو اس کی قائل ہوں کہ برائے نام ہونے سے کچھ نہ ہونا بہتر ہے۔ جان کا بدلہ جان۔ میری جان تجھ پہ قربان ہے۔تو مجھ پہ جان نثار کر دے اور یہ قربانی یہ جانثاری بغیر کسی ہچر مچر کے کسی تأسف کے ہونی چاہیے اور اگر یہ نہیں ہے تو پھر بہتر یہ ہے کہ کچھ بھی نہ ہو۔''

''اچھا؟'' باز اروف بولا۔ ''دوٹوک سودا ہے۔ میں حیران ہوں کہ آپ کو اب تک.....جو چاہیے وہ نہیں ملا۔''

''آپ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی چیز پہ بغیر کسی ہچر مچر کے زندگی کی بازی لگا دینا بچوں کا کھیل ہے۔''

''اگر آپ سوچتے رہیں' غور کرتے رہیں' اپنے آپ کو کوئی چیز سمجھتے رہیں' اپنی جان کو سونا چاندی تصور کریں' تو پھر تو واقعی بچوں کا کھیل نہیں ہے' لیکن بے سوچے سمجھے جان کی بازی لگا دینا واقعی بچوں کا کھیل ہے۔''

''یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ آدمی اپنی جان کی قیمت نہ سمجھے۔اگر میری کوئی قیمت نہیں ہے تو میری لگن کو کوئی کیوں خاطر میں لانے لگا ہے۔''

''یہ میرا کام تو نہیں ہے۔ یہ دوسرے طے کریں کہ میری حیثیت' میری قیمت کیا ہے۔بس بات تو اتنی ہے کہ آدمی لو لگا لے۔''

مادام اوون تسوف کرسی کی پشت چھوڑ کر آگے کی طرف جھک گئی اور کہنے لگی۔

''آپ ایسے باتیں کرتے ہیں، گویا آپ یہ سب کچھ کر چکے ہیں۔''

''اپنا سر گیونا۔ بات نکل آئی میں نے کہہ دی۔ ویسے آپ جانتی ہیں کہ مجھے ان مشغلوں سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔''

''لیکن آپ کیا کسی سے لو لگا سکتے ہیں؟''

''میں کیا جانوں، شیخی بگھارنے کا میں قائل نہیں۔''

مادام اوون تسوف نے کوئی جواب نہیں دیا اور بازاروف کی زبان بھی گنگ ہوگئی۔ ڈرائنگ روم سے پیانو کی آوازیں تیرتی ہوئی آرہی تھیں۔

مادام اوون تسوف کہنے لگی ''آج یہ کاتیا کب تک باجا بجاتی رہے گی؟''

بازاروف اٹھ کھڑا ہوا ''جی واقعی اب دیر ہوگئی ہے۔ آپ کے بھی آرام کا وقت ہے۔''

''ٹھہریئے تو سہی۔ ایسی جلدی کیا ہے؟ کون سی آپ کی گاڑی نکلی جارہی ہے..... میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔''

''کیا بات؟''

''ذرا ٹھہریئے!'' مادام اوون تسوف نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ اس کی نگاہیں بازاروف کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا گویا بڑے غور سے وہ اس کا جائزہ لے رہی ہے۔

وہ چلنے لگا۔ پھر یک لخت وہ اس کے پاس پہنچا۔ بڑی عجلت میں اس نے سلام کیا اور اس کا ہاتھ اِس زور سے دابا کہ اس کی چیخ نکل گئی اور پھر یہ جا وہ جا۔ اس نے اپنی مسلی ہوئی انگلیاں ہونٹوں پر رکھ لیں اور انہیں سانس سے گرمانا شروع کیا۔ پھر ایکا ایکی وہ اپنی کرسی سے اٹھی اور تیزی سے دروازے کی طرف چلی۔ گویا وہ بازاروف کو واپس لانا چاہتی تھی..... ایک خادمہ چاندی کے طشت میں ایک ڈیکانٹر رکھے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ مادام اوون تسوف کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس نے خادمہ کو وہاں سے رخصت کیا اور پھر بیٹھ گئی اور پھر خیالات میں ڈوب گئی۔ اس کے بال پریشان ہوگئے تھے اور سیاہ گچھوں کی شکل میں اس

کے کاندھوں پر ڈھلک آئے تھے۔ اینا سرگیونا کے کمرے میں لیمپ رات گئے تک خاموشی سے جلتا رہا اور رات گئے تک وہ بت بنی بیٹھی رہی۔ کبھی کبھی وہ انگلیاں ضرور مسلتی تھی، جن میں رات کی ٹھنڈک کی وجہ سے ہلکی ہلکی ٹیس ہونی شروع ہوگئی تھی۔

بازاروف کہیں دو گھنٹے کے بعد سونے کے کمرے میں پہنچا۔ اس کے جوتے شبنم کی نمی سے تر تھے، بال پریشان تھے اور تیور کچھ بگڑے ہوئے تھے۔ اس نے دیکھا کہ ارکادی دفتری میز پر بیٹھا ہے، اس کے ہاتھ میں کتاب ہے اور اس کے کوٹ کے بٹن نیچے سے لے کر گلے تک لگے ہوئے ہیں۔

''تم ابھی تک نہیں سوئے؟'' اس کے لہجے میں اک ذرا جھلاہٹ بھی پیدا ہوگئی تھی۔

ارکادی نے جواب سے پہلو بچاتے ہوئے کہا ''آج آپ نے اینا سرگیونا کے ساتھ بہت دیر لگائی۔''

''ہاں! جب تک تم کاتیا سرگیونا کے ساتھ پیانو بجاتے رہے، میں اس کے پاس بیٹھا رہا۔''

''میں پیانو نہیں بجا رہا تھا......'' ارکادی کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ اس نے ایسا محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں اور اس نے یہ نہیں چاہا کہ اپنے طنز پرست دوست کے سامنے گریہ وزاری کا مظاہرہ کیا جائے۔

(18)

دوسرے دن صبح کو جب مادام اودن تسوف چائے پر آئی تو بازاروف بہت دیر تک اپنی پیالی پر جھکا رہا۔ یک لخت اس نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا......وہ کچھ اِس انداز سے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ گویا اس نے اس کے گھونسا دے مارا ہے اور وہ سوچنے لگا کہ مادام کا چہرہ کل رات کی نسبت کچھ زیادہ پیلا پڑ گیا ہے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور پھر کھانے کے وقت تک اپنی صورت نہیں دکھائی۔ صبح سویرے سے مینہ برس رہا تھا۔

ٹھلنے جانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ سب لوگ ڈرائنگ روم میں جمع ہو گئے۔ ارکادی نے ایک رسالے کا نیا شمارہ اٹھالیا اور زور زور سے پڑھنا شروع کر دیا۔ خالہ جان حسب دستور اپنے چہرے کے خطوط کے ذریعے حیرت و تعجب کے اظہار کی کوشش کرنے لگیں۔ وہ یہ جتا رہی تھیں کہ یہ شخص بڑی نازیبا بات کر رہا ہے۔ پھر انھوں نے غصے سے اسے گھورنا شروع کیا، لیکن وہ انہیں خاطر ہی میں نہیں لایا۔

اینا سرگیونا بولی ''یوگینی وسل یوچ، ذرا میرے کمرے میں تو آیئے..... مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے..... کل آپ نے ایک ٹیکسٹ بک کا ذکر کیا تھا۔''

وہ اٹھ کر دروازے کی طرف چلی۔ خالہ جان نے گھوم کر کچھ اِس انداز سے منہ بنا کر دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں ''مجھے تو دیکھو، میں تصویر حیرت بنی جا رہی ہوں۔'' پھر وہ ارکادی کو گھورنے لگیں، لیکن اس نے اپنی آواز کچھ اور اونچی کر دی اور کاتیا سے، جو برابر ہی بیٹھی تھی، آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کر کے پھر پڑھنا شروع کر دیا۔

مادام اودن تسوف بڑی تیزی سے اپنے کمرے میں گئی۔ بازاروف بھی لپک جھپک اِس کے پیچھے چلا۔ اس نے اپنی نگاہیں نہیں اٹھائی تھیں۔ البتہ اس کا سامعہ اس ریشمیں جامے کی لطیف اور نرم سرسراہٹ کو گرفت کرنے میں مصروف رہا، جو اس کے آگے آگے سرکتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ مادام اودن تسوف پھر اسی آرام کرسی پر دراز ہو گئی، جس پر وہ کل شام بیٹھی ہوئی تھی اور بازاروف پھر اپنے اسی زاویے سے کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولی ''اس کتاب کا کیا نام تھا؟''

بازاروف نے جواب دیا ''پیلوز اور فریمی کی ''عام اصول''۔ میرے خیال میں گینوت کی کتاب ''تجرباتی فزکس کی مبادیات'' بھی آپ پڑھیں۔ اس کتاب میں مثالیں ذرا زیادہ واضح ہیں اور پھر وہ ایک ٹیکسٹ بک بھی ہے۔''

مادام اودن توف نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا ''یوگینی وسل یوچ۔ میں گستاخی کی معافی چاہتی ہوں، لیکن میں نے درسی کتابوں پر مغز مارنے کے لیے آپ کو نہیں بلایا تھا۔ کل رات جو ہم باتیں کر رہے تھے، میں وہی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ آپ ایکا ایکی اٹھ کر چلے گئے..... آپ کو کوفت تو نہیں ہوگی.....''

''میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں' لیکن رات ہم باتیں کیا کر رہے تھے؟''

مادام اودون تسوف نے بازاروف پر ایک نگاہ ڈالی۔

''میرے خیال میں ہم مسرت کے سوال پر بحث کر رہے تھے۔ میں نے کچھ اپنا ذکر کیا تھا۔ ہاں دیکھئے میں نے ابھی ابھی ''مسرت'' کا لفظ بولا ہے۔ یہ بتایئے کہ آخر ایسا کیوں ہے کہ جب ہم موسیقی یا کسی سہانی شام یا اچھے بھلے لوگوں کی گفتگو سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے ہیں' اس وقت بھی بس یوں لگتا ہے کہ کہیں دُور سب سے الگ مسرت کا ایک اتھاہ سمندر موجزن ہے۔ واقعی مسرت سے الگ میرا مطلب ہے کہ جس قسم کی خوشی ہم محسوس کر رہے ہوتے ہیں' اس سے الگ' ایسا کیوں ہے؟ یا ممکن ہے آپ کو اِس قسم کے احساس کا تجربہ نہ ہو؟''

بازاروف نے جواب دیا ''آپ نے سنا نہیں مسرت اس دنیا کی چیز ہے' جہاں ہماری پہنچ نہیں۔ اس کے علاوہ کل آپ یہ کہہ رہی تھیں کہ آپ کو بے اطمینانی کا روگ لگ گیا ہے۔ میرے دماغ میں تو اس قسم کے خیالات کبھی نہیں آتے۔''

''غالباً آپ کو وہ مضحکہ خیز نظر آتے ہیں؟''

''نہیں! وہ سرے سے میرے ذہن ہی میں نہیں آتے۔''

''واقعی؟ مجھے یہ جاننے کا بڑا اشتیاق ہے کہ آپ کے ذہن میں کس قسم کے خیالات آتے ہیں۔''

''کیا کہا؟ میں سمجھا نہیں۔''

''سنیئے! میں مدت سے سوچ رہی تھی کہ آپ سے کھل کر بات کروں۔ آپ سے یہ کہنے کی تو ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو خود ہی احساس ہے کہ آپ ایسے ویسے آدمی نہیں ہیں۔ آپ کی ابھی جوانی ہے۔ پوری زندگی آپ کے سامنے پڑی ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو کس مقصد کے حصول کی تمنا ہے؟ آپ کا مرکز نگاہ کیا ہے؟ آپ کے دل میں کیا ہے؟ مختصر یہ کہ آپ کون ہیں' کیا ہیں؟''

''اپنا سر گیونا آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں طبیعات پڑھ رہا ہوں اور رہا یہ سوال کہ میں کون....؟''

''جی! آپ کون ہیں؟''

''میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں دیہات میں ڈاکٹر بن جاؤں گا۔''

اینا سر گیونا بے چین ہو کر بولی ''آخر آپ ایسی بات کیوں کرتے ہیں؟ اس قسم کی بات کو خود آپ کا دل نہیں مانتا۔ ارکادی بات کا اس طرح مجھے جواب دے تو خیر مضائقہ نہیں، لیکن آپ کو تو یوں جواب نہیں دینا چاہیے۔''

''آخر ارکادی میں اور مجھ میں....''

''بس ختم کیجیے بات! کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اس قسم کی عاجزانہ سی ملازمت پر قناعت کر کے بیٹھ جائیں۔ کیا آپ خود ہی یہ ثابت کرنے میں مصروف نہیں رہتے کہ طب سے آپ کو کوئی دلچسپی نہیں ہے؟ آپ..... آپ جیسے عزائم والا آدمی ڈسٹرکٹ ڈاکٹر بن کر رہ جائے۔ آپ مجھے چڑانے کے لیے ایسے جواب دیتے ہیں۔ آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔ لیکن یوگین وسل یوچ۔ آپ غالباً یہ نہیں جانتے کہ آپ کی رگ رگ کو میں سمجھتی ہوں۔ میں بھی آپ کی طرح غریب و نادار تھی۔ میں نے بھی آپ کی طرح بڑے بڑے عزائم باندھ رکھے تھے۔ میں بھی شاید اسی قسم کی آزمائشوں سے گزری ہوں، جس قسم کی آزمائشوں سے آپ کو سابقہ پڑا ہے۔''

''اینا سر گیونا! آپ کی ساری باتیں سر آنکھوں پر، لیکن آپ مجھے معاف کریں..... میں اپنے متعلق بے تکلفی سے گفتگو کرنے کا قطعاً عادی نہیں ہوں اور آپ کے اور میرے درمیان تو ایسی خلیج حائل ہے....''

''کیسی خلیج؟ آپ کیا مجھ سے پھر وہی کہنا چاہتے ہیں کہ میں رئیس ہوں؟ یوگین وسل یوچ۔ یہ بات ختم کیجیے۔ میں سمجھتی تھی کہ میں آپ پر یہ جتا چکی ہوں....''

بازاروف بات کاٹتے ہوئے بولا ''اس بات کو جانے دیجیے پھر بھی آخر کس بنا پر کوئی مستقبل کے بارے میں سوچے اور گفتگو کرے۔ مستقبل کا انحصار ہم پر نہیں ہے۔ یہ تو چھپر پھٹنے کی بات ہے۔ اگر کوئی کام کرنے کا موقع نکل آئے تو کیا کہنے ہیں، لیکن اگر موقع نہ نکلے تو آدمی اطمینان کا سانس لے گا کہ چلو اچھا ہوا اس نے پہلے سے دون کی نہیں لی تھی۔''

''آپ آپس کی بات چیت کو دون کی لینا بتاتے ہیں؟..... یا شاید آپ مجھ پر

اعتبار نہیں کرتے' اس لیے کہ میں عورت ہوں؟ میں جانتی ہوں کہ آپ ہم سب سے نفرت کرتے ہیں۔''

''اینا سرگیونا! میں آپ سے نفرت نہیں کرتا اور آپ کو یہ بات معلوم ہے۔''

''نہیں! مجھے کچھ معلوم نہیں ہے..... لیکن چلئے یہ فرض کر لیا۔ اپنے مستقبل کے بارے میں آپ بات کرنے سے گریز کرتے ہیں' اس کا جواز سمجھ میں آتا ہے' لیکن اس وقت جو آپ کے نفس میں واردات گزر رہی ہے......''

''واردات گزر رہی ہے۔'' بازاروف نے سرگیونا کے الفاظ دہرائے۔ ''گویا میں بھی کوئی حکومت یا کوئی سماج ہوں۔ بہرصورت یہ بات ہے غیر دلچسپ۔ اس کے علاوہ آدمی کے نفس میں جو واردات گزرتی ہے' کیا ہمیشہ وہ اس کا اظہار کر سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں! میں نہیں سمجھتی کہ آپ کے دل میں جو جو بات گزرتی ہے' آپ اس کا اظہار کیوں نہیں کر سکتے؟''

''آپ کر سکتی ہیں؟'' بازاروف نے پوچھا۔

اینا سرگیونا نے اک ذرا ہچکچاہٹ کے بعد جواب دیا ''جی ہاں!''

بازاروف نے سر جھکا دیا ''میرے مقابلے میں آپ بہت خوش نصیب ہیں۔''

اینا سرگیونا سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگی اور بولی ''آپ کی مرضی ہے' لیکن میرے دل میں اب تک کوئی یہ کہے جا رہا ہے کہ ہم جو ایک دوسرے سے ملے ہیں' تو بلاوجہ نہیں ملے ہیں' ہمارا ابا ہمی ربط وضبط بڑھے گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا یہ اجتناب' یہ لیا دیا پن کسی نہ کسی دن ضرور ختم ہو جائے گا۔''

''تو آپ اسے اجتناب سمجھتی ہیں.... جسے آپ نے لیے دیئے پن سے تعبیر کیا ہے؟''

''جی!''

بازاروف اٹھ کر کھڑکی کی طرف چلا ''اور آپ اِس اجتناب کی وجہ جاننا چاہتی ہیں؟ آپ یہ سمجھنا چاہتی ہیں کہ اس وقت میرے نفس میں کیا واردات گزر رہی ہے؟''

''جی'' مادام اودن تسوف نے سہم کر جواب دیا۔ سہم جانے کی وجہ اس کی سمجھ میں اس وقت بالکل نہیں آئی۔

''اور آپ کو غصہ تو نہیں آئے گا؟''

''نہیں!''

''نہیں؟'' بازاروف اس کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔ ''تو لو میں تمہیں بتاتا ہوں' مجھے تم سے عشق ہے' جنون کی حد تک عشق ہے۔ میں دیوانوں کی طرح تم پر جان دیتا ہوں.....اور آخر تم نے مجھ سے اگلوا ہی لیا۔''

مادام اوون تسوف نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے آگے کر لیے' لیکن بازاروف جھکا کھڑا تھا اور کھڑکی کے شیشے سے اپنی پیشانی رگڑ رہا تھا۔ اس کا سانس تیزی سے چل رہا تھا۔ اس کا پورا جسم تھر تھر کر رہا تھا' لیکن یہ نوجوانی کی کم ہمتی کی کپکپاہٹ نہیں تھی۔ یہ اس کیفیت کے اعلان سے پیدا ہونے والا شیریں تحیر بھی نہیں تھا' جو اس پر طاری تھی۔ یہ تو ایک نفسانی ہیجان تھا' جس نے اس کے نفس کے اندر قیامت بپا کر رکھی تھی' جس میں شدت تھی' غم و درد کی ایک کیفیت تھی۔ نفسانی ہیجان جو نفرت سے کچھ ایسا غیر مشابہ نہیں تھا' بلکہ یوں کہیئے کہ اس سے بہت ملتا جلتا تھا..... مادام اوون تسوف کو اس سے کچھ خوف بھی آیا اور کچھ ترس بھی۔

''یوگین وسل یوچ'' اس کی آواز میں غیر شعوری طور پر ایک نرمی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

اس نے جلدی سے مڑ کر عجب نظروں سے اسے دیکھا اور اس کے دونوں ہاتھ کھینچ کر یک لخت اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔

اس نے فوراً اس کی آغوش سے نکلنے کی کوشش نہیں کی' لیکن گھڑی بھر بعد وہ الگ ایک کونے میں کھڑی بازاروف کو تک رہی تھی۔ وہ اس کی طرف جھپٹا.....

''تم نے مجھے غلط سمجھا ہے!'' اس نے سہم کر اور بڑی عجلت میں سرگوشی کے انداز میں یہ بات کہی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اگر ایک قدم اور بڑھایا تو وہ چیخ پڑے گی...... بازاروف دانت کاٹتا ہوا باہر نکل گیا۔

آدھ گھنٹے بعد خادمہ نے بازاروف کی طرف سے اینا سرگیونا کو ایک پرچہ لا کر دیا۔ اس میں بس ایک سطر لکھی ہوئی تھی ''میں آج چلا جاؤں یا کل تک ٹھہر سکتا ہوں؟''

''آپ جاتے ہی کیوں ہیں؟ میں آپ کو نہیں سمجھی ہوں۔ آپ مجھے نہیں سمجھے

ہیں۔'' اینا سرگیونا نے اس کے پرچے کا تو یہ جواب دے دیا' لیکن خود اپنے دل میں وہ یہ سوچ رہی تھی ''میں خود بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھی ہوں۔''

کھانے کے وقت تک وہ باہر نہیں آئی اور کمرے میں ٹہلتی رہی۔ کبھی وہ کھڑکی کے سامنے ٹھہر جاتی تھی اور کبھی آئینے کے سامنے رُک کر کھڑی ہو جاتی تھی اور گردن کو آہستہ آہستہ رومال سے ملتی تھی۔ اسے اپنی گردن پر اب تک ایک بھبکتا ہوا داغ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آپ سے پوچھنے لگی کہ آخر اس نے بازاروف کو یہ الفاظ کہنے پر کیسے مجبور کیا اور کیا اسے اس کا مطلق شبہ نہیں تھا...... ''قصور میرا ہی ہے'' اس نے اونچی آواز سے کہا۔ ''لیکن مجھے یہ خبر تو نہیں تھی کہ یہ ہو جائے گا۔'' وہ خیالات میں غرق ہو گئی اور جب اسے یہ یاد آیا کہ بازاروف کے چہرے پر حیوانی جذبہ کس شدت سے نمودار ہوا تھا اور کس بری طرح وہ اس پر جھپٹا تھا...... تو اس کے چہرے پر شرم کی سرخی دوڑ گئی۔

''یا؟'' اس نے اچانک زور سے کہا اور پھر کہتے کہتے رک گئی۔ اس نے اپنے بالوں کی لٹیں سمیٹ کر پیچھے ڈال لیں...... اس کی نظر آئینے میں اپنے چہرے پر جا پڑی۔ اس کا سر پیچھے کی طرف ڈھلک گیا تھا اور اس کی نیم وا آنکھوں میں اور ہونٹوں پر ایک پُر اسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور اس کیفیت کے عکس نے شاید بجلی کی سی تیزی سے وہ پوری بات اس پر آشکارا کر دی جس نے اس کے ذہن میں الجھن پیدا کر رکھی تھی......

''نہیں!'' آخر اس نے فیصلہ کر ہی لیا'' جانے اس کا کیا انجام ہو۔ اس کے ساتھ یہ کھیل نہیں کھیلا جا سکتا۔ بہر صورت دنیا میں سب سے بہتر چیز اطمینان ہے۔''

اس کے ذہن کا اطمینان غارت نہیں ہوا تھا۔ ہاں وہ اداس ضرور تھی اور ایک مرتبہ تو اس کے آنسو بھی نکل آئے تھے۔ ان آنسوؤں کی وجہ وہ خود بھی نہیں سمجھ سکی تھی' لیکن اس کی وجہ یہ تو ہرگز نہیں تھی کہ اس کی آبرو پر ہاتھ ڈالا گیا تھا۔ اسے یہ احساس تو مطلق نہیں تھا کہ اس کی بے آبروئی ہوئی ہے۔ وہ اپنے آپ کو مجرم تصور کرنے پر زیادہ مائل تھی۔ مختلف مبہم جذبوں نے اسے شہ دی تھی۔ زندگی کے بیتنے کا احساس' منہ کا مزہ بدلنے کی خواہش اور اس قسم کے دوسرے جذبوں نے مل ملا کر اسے ایک مخصوص راستے پر ڈال دیا۔ آخر اس نے اپنی ذات کے پردے سے باہر نکل کر دیکھا۔ اس نے جو کچھ دیکھا وہ کھائی نہیں تھی'

خندق نہیں تھی۔ وہ تو خلا تھا..... نفرت انگیز چیز تھی۔

(19)

مادام اودن تسوف کو اپنے آپ پر قابو بہت تھا اور پھر وہ ہر قسم کے تعصبات سے بلند واقع ہوئی تھی، اس لیے جب وہ کھانے کے کمرے میں کھانے پر گئی، تو اس نے اِک ذرا اکھڑا اکھڑا اپن تو ضرور محسوس کیا، تاہم کھانے کے دوران میں کوئی گڑ بڑ نہیں ہوئی۔ پورفیری پلاتو تموفش بھی آ گیا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر کے قصے سناتا رہا۔ حال ہی میں وہ قصبے سے واپس آیا تھا۔ منجملہ اور باتوں کے اس نے انہیں یہ بھی اطلاع دی کہ گورنر صاحب نے اپنے معتمدین خصوصی کو یہ ہدایت کر دی ہے کہ اگر کسی کام پر انہیں کہیں گھوڑے کی سواری کے ساتھ بھیجا جائے، تو وہ اسپرز بھی ضرور پہنیں۔ ارکادی کاتیا سے کھسر پھسر باتیں کر رہا تھا اور سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر خالہ جان کی خواہشات سے بھی بے خبر نہیں تھا۔ بازاروف کا منہ پھولا ہوا تھا۔ بات نہ کرنے کی اس نے قسم کھا رکھی تھی۔ مادام اودن تسوف نے دو مرتبہ اس کی طرف دیکھا اور کچھ لُک چھپ کر نہیں، بلکہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور بازاروف کی کیفیت یہ تھی کہ اس کا چہرہ سونتا ہوا تھا۔ اس پر زردی کھنڈ گئی تھی۔ آنکھیں جھک گئی تھیں اور چہرے کے ایک ایک خط ایک ایک تیور پر حقارت آمیز عزم کی مہر ثبت تھی اور اودن تسوف سوچنے لگی "نہیں..... نہیں..... "..... کھانے کے بعد وہ سب کے ہمراہ باغ میں ٹہلنے چلی گئی اور جب اس نے یہ دیکھا کہ بازاروف اِس سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے تو وہ قدم اٹھا کر ایک طرف ہو لی اور رُک گئی۔ وہ اس کے پاس پہنچا، لیکن نگاہیں اس نے پھر بھی اُدھر نہیں اٹھائیں۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولا "اینا سرگیونا میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ آپ مجھ سے خفا ہوں گی۔"

"نہیں! یوگین وسل یوچ۔ میں آپ سے خفا تو نہیں ہوں، لیکن مجھے افسوس ضرور ہے۔"

"یہ اور بھی بری بات ہے۔ بہر صورت اب تو مجھے کافی سزا مل چکی ہے۔ آپ کو

اس سے اتفاق ہوگا کہ میری حیثیت بہت احمقانہ سی بن گئی ہے۔ آپ نے مجھے لکھا تھا کہ ''آپ جاتے ہی کیوں ہیں؟'' لیکن میں یہاں ٹھہر بھی تو نہیں سکتا اور ٹھہرنا نہیں چاہتا۔ میں کل چلا جاؤں گا۔''

''یوگین وسل یوچ! آپ کیوں....؟''

''میں کیوں جا رہا ہوں؟''

''نہیں! میں یہ کہنا نہیں چاہتی تھی۔''

''اینا سر گیونا! جو ہوا سو ہوا.....اور جلد یا بدیر یہ دن تو آنا ہی تھا۔ چنانچہ اب مجھے یہاں سے چلا ہی جانا چاہیے۔ یہاں ٹھہرنے کی مجھے تو ایک ہی صورت نظر آتی ہے، لیکن وہ صورت کبھی پیدا نہیں ہوگی۔ معاف کرنا یہ گستاخی تو ضرور ہے۔ آپ مجھ سے محبت نہیں کرتیں اور نہ شاید کبھی کر سکتی ہیں۔''

بازاروف کی آنکھیں اس کی کالی کالی پلکوں کے اندر ایک لمحہ کے لیے چمک اٹھیں۔

اینا سر گیونا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک خیال بجلی کی طرح اس کے دماغ میں دوڑ گیا۔ ''میں اِس شخص سے ڈرتی ہوں۔''

''اچھا تو آداب عرض ہے۔'' بازاروف نے یوں کہا گویا اس نے اِس خیال کو بھانپ لیا ہے اور واپس گھر چلا گیا۔

اینا سر گیونا آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلی اور کاتیا کو بلا کر اس کے شانے کا سہارا لیا۔ جب تک بالکل شام نہ ہوگئی، وہ اس سے الگ نہیں ہوئی۔ اس نے تاش نہیں کھیلے اور برابر ہنستی رہی، لیکن یہ ہنسی اس کے چہرے کی پلا پلی اور پریشانی سے مطلق ہم آہنگ نہیں تھی۔ ارکادی بہت سٹپٹایا اور جس انداز سے کم عمر والے دیکھا کرتے ہیں، اسی انداز سے وہ بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ یوں سمجھئے کہ وہ برابر اس سے یہ سوال کیے جا رہا تھا۔ ''اس کا مطلب کیا ہے؟'' بازاروف کمرے میں جا گھسا۔ البتہ چائے کے وقت وہ ضرور باہر نکلا تھا۔ اینا سر گیونا نے یہ چاہا تھا کہ اس سے دوستی کے ایک دو کلمے کہہ دے، لیکن پھر اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ اسے مخاطب کیسے کیا جائے۔

خلاف توقع ایک ایسا واقعہ ہوگیا کہ اسے اس پریشان کن صورتحال سے نجات مل گئی۔ خانساماں نے آکر بتایا کہ سیتنی خوف آئے ہیں۔

ترقی کے اِس نوجوان علمبردار نے کمرے میں داخل ہوکر جو تماشا کیا ہے' اس کا نقشہ الفاظ میں تو کھینچا نہیں جاسکتا۔ نہ اس سے میل ملاقات تھی نہ کبھی بلانا چلانا ہوا' لیکن اس بھلے آدمی کی فطرت تو یہ تھی کہ جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام۔ کہیں سے وہ یہ خبر لے اڑا کہ اس کے ذہین وفطین اور پُرخلوص دوست ایک خاتون کے یہاں مہمان ہیں۔ بس پھر کیا تھا' وہ وہاں آن دھمکا' لیکن وہ آنے کو تو آ گیا تھا' مگر اب اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ معذرت اور سلام دعا کے جتنے فقرے اس نے بڑی عرق ریزی سے رٹے تھے' وہ سب کے سب صاف ہوگئے۔ ان کے بجائے وہ اندوتیا کوکشین کی طرف سے لایعنی باتیں کرنے لگا کہ انہوں نے مجھے آپ کی خیروعافیت دریافت کرنے بھیجا ہے اور انہوں نے ارکادی نکولائی وچ کی خیریت بھی پوچھی ہے اور وہ تو آپ کی بڑی تعریفیں کرتی ہیں..... اِس مقام پر آ کر اس کی زبان لڑکھڑا گئی اور اوسان اس بری طرح خطا ہوئے کہ وہ اپنے ہیٹ پر بیٹھ گیا' لیکن جب کسی نے اسے وہاں سے نکال باہر نہیں کیا اور اینا سرگیونا نے تو اِس حد تک مروت برتی کہ اپنی خالہ جان اور بہن تک سے اس کا تعارف کرا دیا' تب اس کے حواس ٹھکانے آئے اور پھر اس نے باتوں کے دریا بہانے شروع کیے۔ رسمی اور مبتذل باتیں شروع کردینے سے بسااوقات بڑا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اُس سے ماحول کی غیر معمولی شدت دھیمی پڑ جاتی ہے اور اعتماد اور ایثار کے جذبات اعتدال پر آ جاتے اس لیے کہ فوراً یہ یاد آ جاتا ہے کہ اِن جذبات کا ابتذال سے خاصا گہرا تعلق ہے۔

سیتنی خوف کے آ جانے سے ایک بے کیفی سی پیدا ہوگئی۔ انہوں نے کھانا بھوک سے کچھ زیادہ ہی کھایا اور معمول سے آدھ گھنٹہ پہلے سونے کی تیاریاں کرنے لگے۔

ارکادی جب بستر پر دراز ہوگیا تو وہ بازاروف سے جو اپنی شب خوابی کا لباس تبدیل کررہا تھا' کہنے لگا ''ایک مرتبہ آپ نے جو مجھ سے بات کہی تھی' وہی بات اب میں آپ سے کہتا ہوں۔ آپ اتنے افسردہ کیوں ہیں؟ یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کوئی مقدس فریضہ انجام دیا ہے۔'' تھوڑی دیر بعد بے تکلفانہ ہنسی مذاق کی ایک ایسی مصنوعی سی

فضا پیدا ہوگئی، جو ہمیشہ چھپی ہوئی خفگی یا اَن کہے شبہات کی قطعی علامت ہوتی ہے۔

بازاروف کہنے لگا ''کل میں اپنے باپ کے یہاں جا رہا ہوں۔''

ارکادی کہنیاں ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اسے تعجب بھی ہوا اور جانے کس وجہ سے خوشی بھی ہوئی۔ وہ بولا ''اچھا تو آپ اسی وجہ سے رنجیدہ ہیں؟''

بازاروف نے جمائی لی ''اگر تمہاری معلومات میں ضرورت سے زیادہ اضافہ ہوگیا تو تم بوڑھے ہو جاؤ گے۔''

ارکادی نے کہا ''اور اینا سرگیونا؟''

''اینا سرگیونا کیا؟''

''میرا مطلب ہے، وہ تمہیں جانے دے گی؟''

''میں اس کا نوکر تو نہیں ہوں۔''

ارکادی سوچ میں پڑ گیا اور بازاروف لیٹ گیا۔ اس نے اپنا سر دیوار کی سمت کر لیا۔

چند منٹ خاموشی رہی، پھر یکا یک ارکادی بولا ''یوگین؟''

''خیر باشد؟''

''میں بھی کل تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

بازاروف نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ارکادی کہنے لگا ''مجھے تو گھر جانا ہے۔ ہالفسکی تک ہم ساتھ ساتھ جائیں گے اور وہاں تمہیں فیدوت کے یہاں سے سواری مل جائے گی۔ تمہارے گھر والوں سے ملنے کو جی تو چاہتا ہے، لیکن میں ان کے اور تمہارے بیچ میں خواہ مخواہ کیوں حائل ہوں۔ تم ہمارے یہاں پھر آ ؤ گے نا؟''

بازاروف نے مڑے بغیر جواب دیا ''میں اپنی ساری چیزیں تمہارے یہاں چھوڑ آیا ہوں۔''

ارکادی سوچنے لگا ''وہ مجھ سے یہ کیوں نہیں پوچھتا کہ اس کی طرح میں بھی کیوں یکا یک جا رہا ہوں۔ آخر میں یکا یک جا رہا ہوں۔ آخر میں کیوں جا رہا ہوں اور وہ کیوں

جار ہا ہے؟" اس نے بہت سوچ بچار کیا۔ اسے اپنے سوال کا کوئی جواب نہ ملا۔ اگر چہ اس کا دل تلخ احساسات سے لبریز تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ جس زندگی سے وہ اب اس قدر مانوس ہو چکا ہے' اس سے کنارہ کشی اس کے لیے مشکل ہو جائے گی' لیکن یہاں اس کا اکیلا رہ جانا بھی ایک بے تکی سی بات ہو گی۔ اس نے دل ہی دل میں یہ دلیل پیش کی "ان میں آپس میں کوئی بات ہو گئی ہے۔ اس کے چلے جانے کے بعد میرا یہاں پڑا رہنا بیکار ہے۔ وہ مجھ سے تنگ آ چکی ہے۔ ایک تنکے کا جو سہارا تھا' وہ بھی ختم ہوا۔" اس نے اپنا سر گیونا کا تصور باندھنا شروع کر دیا۔ پھر دوسرے نقوش ابھرنے لگے اور ان میں اس نوجوان بیوہ کی وہ دلکش صورت آہستہ آہستہ ڈوبنے لگی۔

"کاتیا سے جدائی کا بھی مجھے رنج ہے۔" اس نے چپکے سے اپنے تکیے کی طرف منہ کر کے کہا۔ اِس تکیے پر آنسو کا ایک قطرہ پہلے ہی گر کر جذب ہو چکا تھا...... اس نے یکا یک اپنے بال جھٹکے اور زور سے بولا "یہ کمبخت بے دال کا بودم سیتنی خوف جانے کہاں سے آن ٹپکا۔"

بازاروف نے بستر میں پڑے پڑے پہلے ذرا حرکت کی' پھر جواب میں بولا "صاحبزادے! تم ابھی بچے ہو۔ سینتی خوفوں کے بغیر تو چارہ ہی نہیں۔ مجھے تو اُس جیسے بے دال کے بودموں کی ضرورت رہتی ہے۔ سمجھتے ہو؟ روٹیاں تھوپنا دیوتاؤں کا کام تو نہیں ہے۔"

"ہوں!" ارکادی دل ہی دل میں سوچنے لگا اور بازاروف کی طنز کے اتھاہ پہلو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کی نگاہوں کے سامنے آ گئے۔ "تو ہم اور تم دیوتا ہیں؟ کم از کم تم ضرور دیوتا ہو۔ تو پھر میں بے دال کا بودم ہوا؟"

"ہاں" بازاروف بولا۔ "تم ابھی بچے ہو۔"

دوسرے دن جب ارکادی نے مادام اودن تسوف کو یہ بتایا کہ وہ بازاروف کے ہمراہ جا رہا ہے' تو اس نے کسی خاص تعجب کا اظہار نہیں کیا۔ وہ کچھ تھکی ہوئی اور کھوئی کھوئی سی تھی۔ کاتیا نے بہت خاموشی اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ خالہ جان نے شال کے اندر کچھ اس انداز سے پہلو بدلا کہ اسے ان پر نظر ڈالنی ہی پڑی۔ سیتنی خوف غریب کی سٹی گم ہو گئی۔

ابھی ابھی وہ بڑا چھیلا بن کر ناشتے پر آیا تھا۔ اس مرتبہ جو لباس وہ پہن کر آیا تھا' وہ سلا فیل تراش کے نہیں تھے۔ جو خادم اس کے لیے مقرر ہوا تھا' کل شام جب اس نے اس کے پاس تن زیب کے اتنے بہت سے کپڑے دیکھے تھے' تو اس کے ہوش اڑ گئے تھے اور اب یکا یک اس کے رفیق اس سے جدا ہو رہے تھے۔ اُس نے آہستہ آہستہ قدم اٹھائے۔ وہ یوں دوہرا ہوا جا رہا تھا' جیسے کوئی شکار کیا ہوا خرگوش گھاس پر دوہرا ہوا جا رہا ہو۔ اس نے اچانک بڑے بے ڈھنگے پن سے اور کچھ سہم کر اور ایک تھوڑے سے افسوس کے ساتھ اعلان کیا کہ میں بھی جا رہا ہوں۔ مادام اودن تسوف نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

وہ غریب ارکادی کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا ''میری گاڑی بہت آرام دہ ہے۔ میں آپ کو لے چلوں گا اور یوگین وسل یوچ۔ آپ کی گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ اس میں بڑی آسانی رہے گی۔''

''لیکن آپ کا راستہ دوسرا ہے۔ میرا راستہ دوسرا۔ پھر یہ کہ میرا گھر ہے بھی بہت دُور۔''

''اس میں کیا بات ہے۔ مجھے تو فراغت ہی فراغت ہے۔ اس کے علاوہ مجھے اُدھر کی طرف ایک کام بھی ہے۔''

''تاڑی بیچنے کا؟'' ارکادی نے بڑے حقارت آمیز انداز میں کہا۔

لیکن سیتنی خوف تو جی جان سے اتنا بیزار ہو چکا تھا کہ اس نے معمول کے مطابق ہنسنا بھی گوارا نہیں کیا۔ وہ بڑبڑانے لگا۔ ''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ گاڑی بڑی آرام دہ ہے اور اس میں سب کے لیے جگہ نکل آئے گی۔''

اینا سرگیونا کہنے لگی ''آپ نے انکار کیا تو موسیو سیتنی خوف کو افسوس ہوگا۔''

ارکادی نے اس پر ایک نظر ڈالی اور معنی خیز انداز میں سر جھکا لیا۔

ناشتے کے بعد مہمان چل پڑے۔ مادام اودن تسوف جب بازاروف کو الوداع کہنے لگی تو ساتھ میں اپنا ہاتھ بھی اس کی طرف بڑھایا اور بولی ''پھر ملاقات ہوگی نا؟''

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔'' بازاروف نے جواب دیا۔

''تو گویا ملاقات ضرور ہوگی۔''

پہلے ارکادی سیڑھیاں اترا اور سیتنی خوف کی گاڑی میں جا بیٹھا۔ ایک خانساماں نے بڑے ادب سے اسے نشست پر بٹھا کر دروازہ بند کر دیا' لیکن اس پر یہ کیفیت گزر رہی تھی کہ وہ یا تو خوشی کے مارے اسے ہلاک کر ڈالتا یا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ بازاروف بھی کوچ میں بیٹھ گیا۔ ہالفسکی پہنچ کر ارکادی نے انتظار کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ گاڑیوں کے اڈے کے داروغہ نے گھوڑے جوت دیئے۔ اس وقت ارکادی گاڑی کے پاس پہنچا اور مسکرا کر بازاروف سے بولا ''یوگین مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں تمہارے ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔''

بازاروف دانت کاٹتے ہوئے بولا ''آؤ! بیٹھ جاؤ!!''

سیتنی خوف اپنی گاڑی کے پہیوں کے اردگرد چکر کاٹ رہا تھا اور بڑی گرمجوشی سے سیٹی بجا رہا تھا۔ جب اُس نے یہ الفاظ سنے تو بیچارے کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ارکادی نے بڑے اطمینان سے اپنا سامان گاڑی سے نکالا اور بازاروف کے پاس جا بیٹھا۔ اپنے سابق ہم سفر کو اس نے بہت جھک کر سلام کیا اور پھر بولا ''گاڑی ہانکو۔'' گاڑی چل پڑی اور تھوڑی دیر میں آنکھوں سے اوجھل ہو گئی...... سیتنی خوف حیران و پریشان کھڑا اپنے گاڑی بان کو دیکھ رہا تھا' لیکن گاڑی بان گھوڑے کی دُم کو چابک سے ہلکورے دینے میں مصروف تھا۔ پھر سیتنی خوف اچھل کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ دو کسان پاس سے گزر رہے تھے۔ ان پر وہ غرایا ''احمقو سر پر ٹوپی تو رکھ لو۔'' اور پھر وہ قصبے کی طرف چل پڑا' وہاں وہ بہت دیر سے پہنچا۔ دوسرے دن مادام کوکشین کے یہاں پہنچ کر اس نے ان دونوں ''مکروہ صورت نک چڑھے اجڈوں'' پر پیٹ بھر کر تبرا بھیجا۔

جب وہ گاڑی میں بازاروف کے برابر بیٹھ گیا' تو اس نے بڑی گرمجوشی سے اس کا ہاتھ دبایا اور بڑی دیر تک ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا۔ یوں لگتا تھا گویا بازاروف اس مصافحہ اور اس خاموشی کو سمجھ رہا ہے' محسوس کر رہا ہے۔ ساری رات اس نے جاگ کر کاٹی تھی اور سگریٹ بھی نہیں پی تھی' بلکہ چند دنوں سے وہ کھانا بھی بس برائے نام ہی کھا رہا تھا۔ اس کا چہرہ ایک تو پہلے ہی سے سونتا ہوا تھا۔ اب وہ اس ٹوپی کے نیچے جو کھسک کر اس کی بھوؤں تک آ گئی تھی' کچھ اور سونتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

آخر وہ بولا ''اچھا بھائی ذرا ایک سگریٹ تو دو، لیکن ذرا دیکھنا کیا میری زبان پیلی ہے؟''

''ہاں ہے تو سہی'' ارکادی نے جواب دیا۔

''ہوں۔ اور سگریٹ بھی بدمزہ لگتی ہے۔ پہیہ دھری سے اُتر گیا ہے۔''

ارکادی کہنے لگا'' کچھ دنوں سے تمہاری صورت بھی کچھ بدلی ہوئی سی نظر آتی ہے۔''

''یہ کچھ نہیں ہے۔ تھوڑے دن میں ہم ٹھیک ٹھاک ہو جائیں گے۔ بھئی ایک بات ہے۔ میری ماں کا دل بہت نرم ہے۔ اگر تم موٹے تازے نہیں ہو اور دن میں دس مرتبہ پیٹ پوجا نہیں کرتے، تو بس وہ پریشان ہو جائے گی۔ میرا باپ ٹھکانے کا آدمی ہے۔ وہ زمانے کے نشیب و فراز سے خوب واقف ہے۔ نہیں میں سگریٹ نہیں پیوں گا۔'' اس نے سگریٹ سڑک پر پھینک دی۔

''تمہارا خیال ہے کہ یہاں سے بیس میل کا فاصلہ ہے؟'' ارکادی نے پوچھا۔

''ہاں! ان بڑے میاں سے اور پوچھ لو۔'' اس نے اس کسان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جو فیدوت کا مزدور تھا اور بکس پر ڈٹا بیٹھا تھا۔

لیکن بڑے میاں تو بس اتنا جواب دے کر رہ گئے کہ کیا پتہ ہے۔ یہاں کوسوں کی نپائی تھوڑا ہی ہووے ہے اور پھر وہ اس گھوڑے کو گالی کوسنے دینے میں مصروف ہو گیا، جو اپنے سر کو جواباً جھٹکے دیئے جا رہا تھا۔

''ہاں۔ ہاں'' بازاروف کہہ رہا تھا'' میرے کمسن دوست تمہارے لیے یہ ایک سبق ہے۔ ایک عبرت آموز مثال ہے۔ خدا جانے یہ کیا بکواس ہے۔ ہر شخص پل صراط پر کھڑا ہے، مگر پھر بھی یار لوگ اپنے لیے ہر قسم کی پریشانیاں پیدا کرتے ہیں اور اپنی زندگی تباہ کر لیتے ہیں۔''

''تم کس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہو؟''

''اشارہ کس بات کی طرف کرتا۔ میں تو صاف صاف اعلانیہ کہہ رہا ہوں کہ ہم دونوں احمق بنے رہے۔ خیر اس کے ذکر سے اب کیا فائدہ۔ پھر بھی میں نے شفاخانوں میں

یہ دیکھا ہے کہ جس شخص کو اپنی بیماری پر بہت تاؤ آ جاتا ہے وہ اس پر غلبہ پالیتا ہے۔''

ارکادی نے جواب دیا ''میں تمہاری بات کچھ سمجھا نہیں۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

''اور چونکہ تم میری بات اچھی طرح نہیں سمجھے ہو تو لو میں تمہیں بتاتا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ آدمی سڑک پر پتھر کوٹ لے مگر عورت اگر کانی انگلی کی پور بھی پکڑنے لگے تو صاف کہہ دے ''پرے ہٹ'' بس اتنی سی بات تھی.....'' بازاروف اپنا وہ پسندیدہ لفظ ''رومانیت زدگی'' دُہرانے ہی والا تھا' لیکن وہ کہتے کہتے رُک گیا اور بولا '' بکواس ہے۔ تم آج میرا اعتبار نہیں کرتے' لیکن میں کہے دیتا ہوں' مجھے اور تمہیں عورتوں کی صحبت ملی۔ اس صحبت کو ہم نے بہت پُر لطف پایا' لیکن اس صحبت سے یوں کنارہ کشی کر لینا ایسا ہے جیسے گرمیوں میں کوئی ٹھنڈے پانی میں ڈبکی لگا لے۔ اِن فضول باتوں کے لیے آدمی کے پاس وقت ہی کہاں ہے۔ ایک ہسپانوی ضرب المثل ہے کہ آدمی کبھی کسی کا غلام نہ بنے۔''

پھر وہ کسان کی طرف مخاطب ہوا ''بڑے میاں! تمہاری جورو ہے؟''

کسان نے اپنا بدرنگ سوجھی ہوئی آنکھوں والا چہرہ ان دونوں کی طرف کر لیا۔

''جورو؟ ہر شخص کی جورو ہووے ہے۔''

''تم اسے مارتے ہو؟''

''جورو کو؟ ہونے کو تو ہر بات ہووے ہے۔ پر میں اسے بلا وجہ تھوڑا ہی ماروں ہوں۔''

''بہت خوب! اچھا وہ بھی تمہیں مارتی ہے؟''

کسان نے لگام کو ایک جھٹکا دیا۔ ''میاں کیا کہہ رئے او۔ مجاخ کرو ہو.....'' وہ دراصل ناراض ہو چلا تھا۔

''ارکادی نکولائی وچ سن رہے ہو' لیکن ہم پر مار پڑی ہے...... تعلیم یافتہ لوگوں کا ہمیشہ یہی حشر ہوتا ہے۔''

ارکادی ہنسا تو سہی' لیکن زبردستی کر کے۔ بازاروف نے اپنا منہ پھیر لیا اور پھر پورے سفر کے دوران میں اس نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔

ارکادی کے لیے وہ بیس میل چالیس میل بن گئے، لیکن آخر کار بلندی پر وہ چھوٹی سی بستی نظر آئی، جہاں بازاروف کے والدین رہتے تھے۔ پیڑوں کے ایک جھنڈ میں چھپروالی چھت کا ایک چھوٹا سا مکان نظر آرہا تھا۔ جو پہلی کٹیا نظر آئی، وہاں دو کسان ہیٹ پہنے کھڑے تھے اور آپس میں گالم گلوچ کرر ہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا ''ابے تو تو سور ہے سور، بلکہ سور کے بچے سے بھی بدتر ہے۔''

دوسرے نے تڑ سے جواب دیا ''اور تیرلگائی ڈائن ہے۔''

بازاروف نے ارکادی سے کہا ''ان لوگوں کی بے لگامی اور فقرہ بازیوں سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ میرے باپ کی رعایا پر زیادہ جبر نہیں ہوتا۔ لو وہ خود ہی آرہے ہیں۔ گھنٹیوں کی آواز سن لی ہوگی۔ ہاں ہاں، وہی ہیں۔ باپ کو بھی میں نہ پہچانوں گا، مگر بال تو اب بالکل سفید ہو چلے ہیں۔ ہا، بڑے میاں!''

(20)

بازاروف گاڑی سے باہر جھکا ہوا تھا اور ارکادی اس کی پیٹھ کے پیچھے سے سر نکال کر جھانک رہا تھا۔ ایک چھوٹے سے مکان کی سیڑھیوں پر اس نے ایک دبلے پتلے لمبے سے شخص کو کھڑے دیکھا۔ بال بکھرے ہوئے، پتلی ستواں سی ناک، بر میں ایک پرانا دُہرانا کوٹ جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ ہونٹوں میں ایک لمبا سا پائپ۔ وہ ٹانگیں پھیلائے کھڑا تھا اور دھوپ کی چکا چوند سے بچنے کی خاطر آنکھیں میچے لے رہا تھا۔

گھوڑے رُک گئے۔

''بہت انتظار دکھا کے آئے۔'' بازاروف کا باپ اب بھی پائپ پیئے جا رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ پائپ نے اس کی انگلیوں کے درمیان ایک رقص کی کیفیت کے ساتھ اوپر نیچے حرکت کرنا شروع کر دی تھی ''آؤ، اترو، اتر آؤ نا۔ تمھیں سینے سے تو لگا لوں۔''

اس نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا..... اتنے میں ایک عورت کی کانپتی ہوئی آواز سنائی دی ''اینوشا۔ اینوشا'' دروازہ کھلا اور ایک پلپلے جسم کی پستہ قد بڑی بی دکھائی دیں، جنھوں نے

ایک سفید کیپ اور ایک پٹی دار واسکٹ پہن رکھی تھی۔ انہوں نے سسکیاں لینا شروع کر دیں۔ ان کے پاؤں لرزنے لگے اور اگر بازاروف ان کو سنبھال نہ لیتا تو وہ یقیناً گر پڑی ہوتیں۔ ان کے پلپلے چھوٹے چھوٹے ہاتھ یک لخت اس کی گردن میں حمائل ہو گئے۔ ان کا سر اس کے سینے پر جا ٹکا اور ایک سکوت ایک سناٹا چھا گیا۔ بس ایک ان کی سسکیوں کی اکھڑی اکھڑی آواز ضرور سنائی دے رہی تھی۔

بوڑھے بازاروف کا دم رُکنے لگا۔ انہوں نے اپنی آنکھیں کچھ اور زیادہ سکیڑ لیں۔

''بہت ہو گیا۔ اریشا اسے چھوڑ و نا۔ میں کہتا ہوں بس بہت ہو گیا۔ للّٰہ اسے چھوڑ دو۔'' یہ الفاظ کہتے ہوئے بڑے میاں نے ارکادی کی طرف دیکھا' جو گاڑی میں یہ سب کچھ دیکھ کر بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا تھا۔ کسان نے بھی اپنا رُخ دوسری طرف کر لیا تھا۔

بڑھیا کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگی ''بیٹا اینوشا میر العل' میرے کلیجے کا ٹکڑا' میری آنکھوں کا تارا برسوں سے.......'' اور انہوں نے اپنے جھریوں دار چہرے کو ذرا الگ کیا' اگر چہ ان کی بانہیں گردن میں بدستور پڑی رہیں۔ چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا اور شفقت و محبت کی پوری کیفیت اس پر نمایاں تھی۔ بازاروف سے چہرے کو ذرا ہٹا کر انہوں نے اسے مسرت بھری نگاہوں سے دیکھا اور پھر اس کی گردن سے لپٹ گئی۔

واسلی الوٗنووچ کہنے لگے ''ہاں' ہاں! ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ اب تم اندر آ جاؤ۔ دیکھو یوگین کے ساتھ یہ ایک مہمان آئے ہیں۔'' اور ارکادی سے مخاطب ہو کر پیر سے زمین کھرچتے ہوئے' وہ کہنے لگے ''بھئی معاف کرنا۔ آپ تو سمجھتے ہیں عورتوں کا دل بڑا کمزور ہوتا ہے اور پھر ماں کا دل.....''

دراصل ان کے ہونٹ اور پلک بھی کپکپا رہے تھے اور ان کی داڑھی میں ارتعاش پیدا ہو گیا تھا.... لیکن وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے اور کچھ بے نیازی جتانا چاہتے تھے۔

بازاروف کہنے لگا ''اماں جان اچھا اب اندر چلی چلو۔'' اور یہ کہہ کے وہ بڑی بی کو اندر لے گیا۔ انہیں ایک آرام دہ کرسی پر بٹھا کر وہ پھر جلدی سے باپ کے سینے سے لگ گیا

اوران سے ارکادی کا تعارف کرایا۔

واسلی الوئنووچ کہنے لگے ''تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، مگر بھائی ہم خاطر تواضع کے لائق نہیں ہیں۔ گھر میں دال دلیا ہے۔ کچھ فوجیوں کا سا انداز ہم نے اختیار کر رکھا ہے۔ ایرینا ولاسیونا خدا کے لیے اب چپ ہو جاؤ نا۔ کیا بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ تمہارے یہاں مہمان آئے ہیں۔ یہ کیا سوچیں گے۔''

بڑی بی اسی طرح روتے دھوتے ارکادی کی طرف مخاطب ہوئیں ''بیٹا تمہارا نام کیا ہے؟''

''ارکادی نکلوائی وچ'' واسلی الوئنووچ نے بڑی سنجیدگی سے آہستہ سے کہا۔

بڑی بی اپنی ناک پوچھنے لگیں۔ انہوں نے اپنا سر پہلے سیدھی طرف جھکایا تھا' الٹی طرف اور بڑی احتیاط سے ایک کے بعد دوسری آنکھ کے آنسو پونچھے اور بولیں ''بھیا مجھ بڑھیا کو معاف کر دیجو۔ میں تمہیں کیا بتاؤں۔ مجھے رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ میں اپنے لعل کی صورت کے لیے ترس ترس کے مر جاؤں گی۔'' واسلی الوئنووچ بیچ میں بول اٹھے ''مگر بڑی بی اب تو تم نے اپنے لعل کی صورت دیکھ لی۔'' پھر وہ ایک تیرہ سالہ لڑکی کی طرف متوجہ ہو گئے' جو تیز سرخ رنگ کے کپڑے پہنے ننگے پیر کھڑی تھی اور دروازے سے ڈرتے ڈرتے جھانک رہی تھی۔ ''تانیوشکا اپنی بی بی کے لیے ایک گلاس پانی تو لا۔ ٹرے میں رکھ کر لانا۔ اری سن رہی ہے؟ اور بھئی تم'' اس نے پرانے زمانے والی شگفتہ مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ''بھئی اس بوڑھے گوشہ نشین سپاہی کی کٹیا میں چلے چلو۔''

ارینا ولاسیونا نے رقت بھرے لہجے میں کہا ''اینوشا بیٹا ایک دفعہ اور گلے لگ جا'' بازاروف اس کی طرف جھک گیا ''میرا بیٹا نکھر کر چاند سا نکل آیا ہے۔''

واسلی الوئنووچ کہنے لگے ''چاند سا نکل آیا ہے یا نہیں' یہ تو میں جانتا وانتا نہیں ہوں' لیکن ماشاء اللہ اب وہ جوان ہو گیا ہے اور ارینا ولاسیونا اب تم نے ماں کی مامتا کا تو پیٹ بھر کے مظاہرہ کر لیا' لیکن اب ان غریب مہمانوں کے پیٹ بھرنے کا بھی تو انتظام کرو۔ خالی خولی باتیں کس کام کی۔ پریوں کی کہانیاں خوب ہوتی ہیں' مگر پیٹ تو ان سے بلبلوں تک کا نہیں بھرتا۔''

بڑی بی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئیں ''واسلی الؤنووچ تلی مت اکھیڑے دو۔ ابھی چٹکیوں میں کرتی ہوں۔ باورچی خانے جا کے سماوار چولھے پہ چڑھاتی ہوں۔ ابھی سب چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ ائے ہئے میں نے اپنے لعل کو تین برس سے اپنے ہاتھ سے کچھ کھلایا پلایا نہیں۔ ہے نا ستم کی بات۔''

''اچھا تم بہت اچھی ماں ہو۔ سن لیا۔ سن لیا۔ اب تم ذرا جلدی کرو۔ کیوں ہمیں شرمندہ کرتی ہو۔ اچھا صاحبان تم میرے ساتھ چلو۔ یوگین یہ تموفش تمہیں سلام کرنے آیا ہے۔ میاں کو دیکھ کے بہت خوش ہے۔ کیوں بے تو خوش ہے نا؟ اچھا اب تم لوگ میرے ساتھ چلو۔''

اور واسلی الؤنووچ سٹر پٹر کرتے ہوئے آگے آگے چلے۔ ان کے سلیپر کا تلا گھس کر علیحدہ ہو گیا تھا اور اس لیے سلیپر سٹاک سٹاک بول رہا تھا۔

ان کے مکان میں چھوٹے چھوٹے کل چھ کمرے تھے۔ ایک کمرہ جس میں وہ ان دونوں دوستوں کو لے گئے تھے' مطالعہ کا کمرہ کہلاتا تھا۔ دو کھڑکیوں کے درمیان جو تھوڑی بہت جگہ تھی' اسے ایک بھاری پایوں والی میز نے گھیر لیا تھا۔ اس کے اوپر کاغذ چپکے ہوئے تھے جن پر نہ جانے کس زمانے سے گرد جمع ہو رہی تھی اور اس کی وجہ سے وہ اس قدر سیاہ ہو چکے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان میں دھواں رچ گیا ہے۔ دیواروں پر ترکی کے آتشیں اسلحہ اور مختلف چیزیں لٹکی ہوئی تھیں..... ہنٹر' ایک بھالا' دو نقشے' جسمانی ساخت کے خاکے' باف لینڈ کی ایک تصویر' ایک سیاہ چوکھٹے میں لگا ہوا ایک مونوگرام اور شیشے میں جڑا ہوا ایک ڈپلوما۔ شیلفوں پر کتابیں' ڈبے' چڑیوں کے مسالہ لگے ہوئے جسم' جگ اور بوتلیں اس بے ترتیبی سے رکھی تھیں کہ اس میں گڈ مڈ ہو گئی تھیں۔ ایک کونے میں ایک بیٹری رکھی تھی۔

واسلی الؤنووچ کہنے لگے ''بیٹا ارکادی نکولائی وچ۔ میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ہم نے سپاہیوں کا سا طور بنا رکھا ہے.....''

بازاروف بات کاٹتے ہوئے بولا ''بس بس ختم کیجیے۔ آخر آپ معافی کس بات کی مانگ رہے ہیں۔ کرسانوف کو خوب معلوم ہے کہ ہم کہیں کے نواب نہیں ہیں۔ ہمارے یہاں بیرے اور خانساماں نہیں ہیں۔ سوال بس اتنا ہے کہ انہیں ٹھہرنے کے لیے

کون سی جگہ ملے گی؟"

"یوگین! چھوٹے گھر میں ایک بہت اچھا کمرہ ہے۔ وہاں انہیں ہر طرح کا آرام رہے گا۔"

"تو کیا آپ نے کوئی چھوٹا گھر بھی بنوالیا ہے؟"

تموفش نے دخل در معقولات کی "ہاں ہاں وہیں جہاں غسل خانہ ہے۔"

واسلی الؤنووچ جلدی سے بولے "غسل خانے کے ساتھ میں ہے۔ اب تو گرمیاں ہیں نا..... میں ابھی جاتا ہوں اور جا کے انتظام درست کرتا ہوں اور اے تموفش تو ذرا جا کے ان کا سامان لا اور یوگین تمہارے لیے تو میرے مطالعہ کا کمرہ ٹھیک رہے گا۔"

"دیکھا تم نے" واسلی الؤنووچ کے جاتے ہی بازاروف بولا "بڑے میاں اچھے خاصے لطیفہ ہیں۔ بالکل گئو آدمی ہیں۔ بس تمہارے والد کی طرح یہ بھی اپنی جگہ پر ایک چیز ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ باتیں بے تحاشا کرتے ہیں۔"

ارکادی کہنے لگا "اور تمہاری والدہ بہت نیک معلوم ہوتی ہیں۔"

"ہاں وہ ڈھکوسلے نہیں کرتیں۔ دیکھنا کس غضب کا کھانا کھلائیں گی۔"

تموفش بازاروف کا بکس گھسیٹ کر اندر لا رہا تھا۔ بولا "اجی تمہارے آنے کی خبر تو تھی نہیں۔ گوشت نہیں آیا ہے۔"

"گوشت بغیر ہی گزارہ کر لیں گے۔ جو چیز ہے نہیں اس کا غم بھی کیوں کیا۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ غریبی عیب نہیں ہے۔"

ارکادی نے اچانک پوچھا "تمہارے والد کے یہاں زرعی غلام کتنے ہیں؟"

"بھئی جائداد والد کی نہیں، والدہ کی ہے۔ یہی کوئی پندرہ ہوں گے۔"

"نہیں صاب! بائیس ہیں۔" تموفش دخل در معقولات کے ساتھ ساتھ کچھ ناراض بھی ہو چلا تھا۔

اتنے میں سلیپروں کی سٹ پٹ کی آواز سنائی دی اور واسلی الؤنووچ پھر آن موجود ہوئے۔ انہوں نے بڑے فاتحانہ انداز میں چمک کر کہا "چند منٹ میں تمہارا کمرہ درست ہو جائے گا۔ ارکادی.... نکولائچ؟ ٹھیک ہوا نا؟ اور یہ تمہارا خدمتگار ہے۔" یہ آخری

الفاظ انہوں نے ایک ٹھگنے سے لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہے تھے۔ وہ ان کے ساتھ ساتھ آیا تھا۔ اس نے ایک نیلا کوٹ پہن رکھا تھا' جس کی آستینیں گھس چکی تھیں۔ جو بوٹ اس نے پہن رکھے تھے وہ دراصل اس کے نہیں تھے۔ ''اس کا نام ہے فیدکا۔ اگرچہ میرا بیٹا معذرت کے خلاف ہے' مگر میں ایک مرتبہ پھر کہوں گا کہ بھائی ہم چھوٹے آدمی ہیں۔ خاطرداری میں کسر رہ جائے تو دل پر میل نہ لانا۔ یہ لونڈا پائپ بھرنا جانتا ہے' تم سگریٹ تو پیتے ہونا؟''

''جی میں عام طور پر سگار پیتا ہوں۔''

''بھئی یہ عقلمندی کی بات کرتے ہو۔ میں خود سگار کا قائل ہوں' لیکن یہاں اللہ میاں کے پچھواڑے ہم پڑے ہیں۔ سگار بڑی مشکل سے ملتا ہے۔''

''بہت خاکساری برت چکے' بس کیجیے'' بازاروف نے پھر اس کی بات کاٹ دی ''صوفے پر بیٹھ جائیے۔ ہم ذرا دل بھر کے آپ کو دیکھ لیں۔''

واسلی الئونووچ ہنس پڑے اور پھر صوفے پر بیٹھ گئے۔ ان کی صورت اپنے بیٹے سے بہت ملتی جلتی تھی۔ ان کی بھنویں اک ذرا زیادہ پتلی اور جھکی ہوئی تھیں اور دہانہ بھی کچھ زیادہ بڑا تھا۔ بیقراری ان کی سرشت میں داخل تھی۔ بار بار اپنے کاندھے مچکاتے تھے' گویا آستینوں پر سے ان کا کوٹ انہیں کاٹ رہا ہے۔ کبھی آنکھیں مٹکاتے تھے' گلا صاف کرتے تھے اور انگلیاں نچا نچا کر باتیں کرتے تھے۔ اس کے برخلاف ان کے بیٹے کی فطرت یہ تھی کہ بڑی بے نیازی کے ساتھ گم متھان بنا بیٹھا رہتا تھا۔

''خاکساری'' واسلی الئونووچ نے بازاروف کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا ''یوگین اس میں خاکساری واکساری کیا ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں اپنے مہمان پر یہ جتانا چاہتا ہوں کہ ہم سب سے الگ جنگل میں پڑے ہیں اور یہ جتا کر میں ان کی ہمدردی لوٹنا چاہتا ہوں۔ نہیں' میں تو یہ کہتا ہوں کہ غور و فکر کرنے والوں کے لیے کوئی بھی جگہ جنگل نہیں ہوتی۔ کم از کم میں تو یہی کوشش کرتا ہوں جتنی بھی میری بساط ہے کہ میں دقیانوسیت کا شکار نہ ہو جاؤں میرا مطلب ہے کہ زمانے سے پیچھے نہ رہ جاؤں۔''

واسلی الئونووچ نے اپنی جیب سے ایک نیا ریشمیں زرد رومال نکالا۔ ارکادی کے

کمرے میں جاتے جاتے انہیں رومال اٹھانے کی مہلت بھی مل ہی گئی تھی۔ اسے ہوا میں لہراتے ہوئے وہ کہنے لگے ''میں اس واقعہ کی طرف اشارہ نہیں کر رہا ہوں کہ خاصی بڑی قربانیاں دے کر میں نے اپنے کسانوں کے لیے لگان داری کا طریقہ رائج کر دیا اور انہیں آدھے منافع پر اپنی زمین دے ڈالی۔ یہ تو میرا فرض تھا۔ موٹی عقل والا بھی یہ بات آسانی سے سمجھ سکتا ہے، اگرچہ دوسرے زمینداروں کے تصور میں یہ بات نہیں آتی، لیکن میں دراصل نئے علوم کا اور کلچر کا ذکر کر رہا ہوں۔''

بازاروف بولا ''ہاں ہاں میں سمجھ گیا آپ کے پاس ''رفیق صحت برائے 1855ء'' کہیں سے آ گئی ہے۔''

واسلی الوئووچ نے عجلت سے جواب دیا ''یہ کتاب تو ایک پرانے ساتھی نے محض دوستی میں بھیج دی ہے، لیکن مثال کے طور پر ہمیں تھوڑا بہت علم کاسہ سُر کا بھی اتا پتا ہے۔'' اس نے یہ فقرہ مخصوص طور پر ارکادی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تھا اور ساتھ میں اس نے مصالحہ لگی ہوئی ایک کھوپڑی کی طرف اشارہ کیا، جس پر چوکور خانے بنے ہوئے تھے اور ان میں نمبر پڑے ہوئے تھے۔ ''اس کے علاوہ ہم لوگ شینلن اور رادیماشیر کے نظریات سے بھی تھوڑی بہت واقفیت ضرور رکھتے ہیں۔''

بازاروف پوچھنے لگا ''آخر اِس صوبے میں لوگ رادیماشیر کو اب تک کیوں مانے جاتے ہیں؟''

واسلی الوئووچ نے اپنا گلا صاف کیا ''اس صوبے میں...... ہاں بھائی تم بہتر سمجھ سکتے ہو۔ تمہارے ساتھ ساتھ چلتے رہنا ہمارے بس کا کہاں ہے۔ اب ہماری جگہ تم ہی لوگے۔ مجھے اپنے زمانے کی بات یاد ہے۔ اس زمانے میں ہیومرسٹوں کا ایک مکتبہ فکر تھا۔ پھر ہاف مان تھا اور براؤن اپنا حیاتیات کا نظریہ پیش کر رہا تھا۔ ہم انہیں مسخرے سمجھا کرتے تھے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اپنے اپنے زمانے میں وہ بڑے آدمی تھے۔ اب رادیماشیر کی جگہ کسی نئے آدمی نے لے لی ہوگی۔ تم اب اس کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے ہو، لیکن اگلے بیس سال کے بعد ان کی بھی باری آئے گی۔ لوگ ان پر ہنسا کریں گے۔''

بازاروف نے جواب دیا ''آپ کے اطمینان کے لیے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ

ہم سرے سے طب ہی کو مسخراپن سمجھتے ہیں۔ ہم کسی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے ہی نہیں۔''

''یہ کیسے' پھر تم ڈاکٹر بننے کی تیاریاں کیوں کررہے ہو؟ یا نہیں کررہے؟''

''ہاں کررہا ہوں۔ مگر ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ کی تردید لازم نہیں آتی۔'' واسلی الؤنووچ نے اپنی تیسری انگلی سے پائپ کو کریدا۔ اس میں ایک چنگاری ابھی تک سلگ رہی تھی۔ ''اچھا یونہی سہی۔ میں بحث کرنے سے تو رہا۔ میری بساط بھی کیا ہے؟ ایک پنشن یافتہ فوجی ڈاکٹر ہوں۔ قسمت میں لکھا تھا کہ کھیتی باڑی کروں سو کھیتی باڑی کررہا ہوں۔ میں نے آپ کے داداجان کی بریگیڈ میں کام کیا ہے۔'' اس کا رُخ پھر ارکادی کی طرف ہوگیا ''ہاں میں نے اپنے زمانے میں کیا کیا نہیں دیکھا۔ قسم قسم کی محفلوں میں اٹھنا بیٹھنا رہا۔ طرح طرح کے لوگوں سے سابقہ پڑا۔ یہ شخص جو اس وقت تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔ اس نے شہزادہ وتگنستین اور زوکوفشکی کی نبض دیکھی۔ وہ اس وقت جنوبی فوج میں یعنی چودھویں فوج میں تھے'' (اور اب واسلی الؤنووچ نے بڑے معنی خیز انداز میں اپنا منہ بھینچ لیا) ''خیر! ہمارا کام اور تھا۔ ہم نے تو یہ اصول رکھا کہ اپنے کام سے کام رکھو۔ باقی دنیا بھاڑ میں جائے اپنی بلا سے۔ آپ کے داداجان کا بڑا نام تھا۔ وہ بھی سچے سپاہی تھے۔''

بازاروف نے الکساتے ہوئے کہا ''اب یہ مان لو نا کہ ان کے دماغ میں بھس بھرا ہوا تھا۔''

''یوگین تم یہ کیسے الفاظ زبان سے نکالتے ہو۔ ذرا سوچو کہ..... یہ واقعہ ہے کہ جنرل کرسانوف ان لوگوں میں سے نہیں تھے....''

''چھوڑو اس قصے کو'' بازاروف بات کاٹتے ہوئے بولا ''جب میں یہاں آرہا تھا تو آپ کے درختوں کو دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ بڑے گھنے درخت ہیں۔''

واسلی الؤنووچ کا چہرہ چمک اٹھا۔ ''اب تم چل کر دیکھنا میں نے ایک باغیچہ لگایا ہے۔ اس کے ہر درخت کی پود میں نے اپنے ہاتھوں سے لگائی ہے۔ رس بھریاں ہیں' دوسرے پھل ہیں اور ہر قسم کی جڑی بوٹیاں ہیں۔ بھائی تم آج کل کے نوجوان بڑے دانا بینا سہی' لیکن سچی بات بوڑھے پاراکلیس نے کہی ہے۔

تم جانو کہ میں نے اب ڈاکٹری تو چھوڑ چھاڑ دی ہے' لیکن ہفتے میں دو تین مرتبہ ضرور میں اپنا پرانا مشغلہ تازہ کر لیتا ہوں۔ لوگ طبی مشورے کے لیے آ جاتے ہیں۔ اب آئے ہوؤں کو نکالا تو نہیں جاتا۔ اکثر بیچارے غریب غرباء آ کر فریاد کرنے لگتے ہیں۔ یہاں ڈاکٹر ناپید ہیں۔ قریب ہی میں ایک ڈاکٹر صاحب ہیں۔ وہ پنشن یافتہ ٹیچر ہیں۔ ذرا غور کیجیے وہ حضرت لوگوں کا علاج کرتے ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ پوچھ لیا تھا ''ان حضرت نے کچھ طب بھی پڑھی ہے؟'' جواب ملا ''نہیں' پڑھا انہوں نے کچھ نہیں ہے۔ وہ تو خلق خدا کے فائدے کے لیے یہ کام کرتے ہیں'' خاخاخا۔ خلق خدا کے فائدے کے لیے۔ ذرا سوچا۔ خاخاخا۔''

بازاروف جھلّا کر بولا ''فیدکا' مجھے ذرا پائپ بھر کر دینا۔''

''اور ایک دوسرے ڈاکٹر صاحب ہیں۔ وہ ان سے بھی اعلیٰ ہیں'' واسلی الئونووچ بھی اب سر پر کفن باندھے میدان میں ڈٹ ہی گئے تھے۔ ''جناب مریض کے پاس اس وقت پہنچے جب وہ بستر بوریا باندھے ملک الموت کے ساتھ چل دیا تھا۔ ملازم نے ڈاکٹر کو بولنے نہیں دیا۔ کہنے لگا ''جناب! تشریف لے جائیں۔ اب آپ کی ضرورت نہیں رہی۔'' اسے اس کی ہرگز توقع نہ تھی۔ گڑبڑا گیا اور پوچھنے لگا ''اچھا یہ تو بتاؤ کہ مریض کو موت سے پہلے ہچکی بھی آئی تھی؟'' ۔ ''جی ہاں'' ۔ ''خوب ہچکیاں آئی تھیں؟'' ۔ ''جی ہاں'' ۔ ''اچھا تو بس ٹھیک ہے گھبرانے کی بات نہیں ہے۔'' اور یہ کہہ کر حضرت واپس ہو لیے۔ ہاہاہا۔''

بڑے میاں اکیلے ہنستے رہے۔ ارکادی نے تو خیر زبردستی چہرے پر مسکراہٹ پیدا کر بھی لی تھی۔ بازاروف کا تو منہ اور سوج گیا۔ ایک گھنٹے تک اسی انداز میں باتیں ہوتی رہیں۔ آخر ارکادی اپنے کمرے کو چلا۔ پتہ یہ چلا کہ یہ کمرہ غسل خانے سے نتھی ہے' لیکن تھا وہ بہت صاف ستھرا۔ آخر کار تانیوشا نے آ کر اعلان کیا کہ کھانا تیار ہے۔

سب سے پہلے واسلی الئونووچ اٹھے اور کہنے لگے ''اچھا بھائیو! اٹھو! اگر میری باتوں سے آپ لوگوں کو کوفت ہوئی ہے تو وسیع القلبی سے کام لے کر معاف کر دینا۔ یہ کہنے کی جرأت میں ضرور کروں گا کہ میری بیوی کی باتوں سے آپ کو زیادہ تسکین ہوگی۔''

کھانا اگرچہ بڑی افراتفری میں تیار ہوا تھا' مگر پھر بھی وہ بہت لذیذ تھا اور پھر

خوب افراط تھی۔ البتہ شراب ڈھنگ کی نہ تھی۔ اسے سیاہ رنگ کی شیری سمجھ لیجیے۔ تموفش قصبے کے ایک مشہور سوداگر کی کان سے خرید کر لایا تھا۔ اس میں ہلکا ہلکا تانبے کا سا اور کچھ دوا کا سا مزہ تھا۔ پھر اوپر سے مکھیوں نے جان ضیق میں ڈال رکھی تھی۔ عام طور پر زرعی رعیت میں سے ایک لونڈا ایک بڑی سی ہری شاخ لے کر کھڑا ہو جاتا اور مکھیوں کو اڑاتا رہتا' لیکن آج واسلی الئونووچ کو یہ اندیشہ ستا رہا تھا کہ یہ آج کل کے نوجوان کہیں اس پر نکتہ چینی نہ کرنے لگیں اور اس لیے انہوں نے اسے وہاں سے نو دو گیارہ کر دیا تھا۔ ارینا ولاسیونا نے اسی بھاگ دوڑ کے عالم میں کپڑے بدلنے کا وقت بھی نکال لیا تھا۔ ایک ریشمیں ربن لگی ہوئی اونچی سی کیپ ان کے سر پر سجی ہوئی تھی اور ایک پھولدار بدرنگ نیلی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اپنے اینوشا کو دیکھتے ہی ان کا دَم پھرا کھڑ گیا' لیکن بڑے میاں کو ملامت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ انہوں نے اپنے آپ ہی جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے۔ دراصل انہیں یہ خدشہ پیدا ہو چلا تھا کہ کہیں ان کی شال پر دھبے نہ پڑ جائیں۔ کھانا تو بس ان نوجوانوں ہی نے کھایا۔ بڑے میاں اور بڑی بی تو پہلے ہی کھا چکے تھے۔ فید کا میز پر حاضری دیتا رہا۔ اس غریب نے پہلی مرتبہ بوٹ پہنے تھے۔ بھلا بے کلی کیوں محسوس نہ کرتا۔ ایک اور عورت انفشو شکا اس کی کمک پر موجود تھی۔ اس کے چہرے کی ساخت مردانہ پن لیے ہوئے تھی اور ایک آنکھ سرے سے غائب تھی۔ گھر کی خادمہ' دھوبن اور مرغیوں کی رکھوالن' یہ سارے فرض وہ انجام دیتی تھی۔ واسلی الئونووچ کھانے کے دوران میں مستقل طور پر ٹہلتے رہے۔ ان کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ وہ ٹہلتے جاتے تھے اور نپولین کی پالیسی اور اطالیہ کے الجھے ہوئے مسئلے پر بڑی تشویش کے ساتھ گفتگو کرتے جاتے تھے۔ ارینا ولاسیونا نے ارکادی کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔ ان کا وہ گول مول چہرہ جس پر سرخ سرخ ہونٹوں کی وجہ سے اور رخساروں اور بھنوؤں سے اوپر والے چھوٹے چھوٹے تلوں کے سبب سادگی اور شرافت کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اپنا چہرہ جھکائے مٹھیاں باندھے وہ اپنے بیٹے کو تکے جا رہی تھیں اور مستقل طور پر ٹھنڈے سانس بھر رہی تھیں۔ انہیں تو یہ کرید تھی کہ وہ کتنے دنوں کے لیے آیا ہے' لیکن ڈر کے مارے پوچھنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔

وہ سوچنے لگیں کہ "اگر کہیں اس نے کہہ دیا کہ دو دن کے لیے تو پھر کیا ہوگا؟" اور

اس خیال کے ساتھ ان کا دل ڈوبنے لگا۔ کھانے کے بعد واسلی الؤنووچ چند لمحوں کے لیے آنکھوں سے اوجھل ہو گئے اور پھر شیمپیئن کی کھلی ہوئی آدھی بوتل لیے درآمد ہوئے۔ وہ چمک کر بولے "یہ لو۔ یوں ہم ویرانے میں پڑے ہیں' لیکن دعوتوں وغیرہ کے لیے چیز گھر میں ڈال رکھتے ہیں۔" انہوں نے شیمپیئن کے تین گلاس بھرے اور ایک شراب کے چھوٹے سے گلاس میں شراب ڈالی۔ "اپنے عزیز مہمانوں" کا جام صحت قرار دے کر وہ اپنے گلاس کو فوجی انداز میں غٹا غٹ چڑھا گئے۔ ادھر وہ ارینا ولاسیونا سے بھی بے خبر نہیں تھے۔ جب تک ارینا نے ایک ایک قطرہ اپنے گلاس کا نہ پی لیا' انہیں صبر نہیں آیا۔ اس کے بعد جب مربے سامنے آئے تو ارکادی اگرچہ میٹھی چیزوں سے متنفر تھا' لیکن اس نے فرض کے طور پر ان چار مختلف اقسام کو چکھ چکھ کر دیکھا جو تازہ تازہ تیار کی گئی تھیں۔ اس نے اپنے اوپر اس لیے اور بھی یہ فرض عائد کیا تھا کہ بازاروف نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے صاف انکار کر کے فوراً سگریٹ پینا شروع کر دی تھی۔ پھر کریم مکھن اور اخروٹوں کے ساتھ چائے آئی۔ اس کے بعد واسلی الؤنووچ ان سب کو شام کی رنگینیاں دکھانے باغ میں لے گئے۔ جب وہ باغ کی ایک نشست کے پاس سے گزر رہے تھے' تو انہوں نے چپکے سے ارکادی کے کان میں کہا۔

"یہاں بیٹھ کر میں غروبِ آفتاب کا نظارہ کرتا ہوں اور غور و فکر میں ڈوب جاتا ہوں۔ مجھ جیسے گوشہ نشین کے لیے یہ بات زیب دیتی ہے اور اس سے ذرا ہٹ کر اُدھر میں نے چند درخت لگائے ہیں' جو ہوریس کو بہت عزیز تھے۔"

بازاروف کے کان میں بھنک پڑ گئی۔ فوراً بولا "کیسے درخت؟"

"ہا.....ں۔ میول کے درخت۔"

بازاروف جمائیاں لینے لگا۔

واسلی الؤنووچ نے بڑے تکلف سے کہا "میرا خیال ہے کہ یہ ہمارے مسافروں کا نیند کی پریوں کی آغوش میں آرام کرنے کا وقت ہے۔"

بازاروف بات کاٹ کر بولا "یعنی آپ کا مطلب ہے کہ سونے کا وقت ہے۔ درست خیال ہے۔ واقعی اب سونے کا وقت ہے۔"

جب وہ اپنی ماں سے رخصت ہو کر جانے لگا تو اس نے ان کی پیشانی پر بوسہ دیا اور انہوں نے اسے گلے لگایا اور جب وہ مڑ کر چلا تو اس نے چپکے چپکے تین مرتبہ اسے دعائیں دیں۔ واسلی الئونووچ ارکادی کو اس کے کمرے میں پہنچا آئے اور دعا دی کہ رات چین و آرام سے گزرے اور ارکادی واقعی اپنے کمرے میں مزے سے چادر تان کر سویا۔ پیپرمنٹ کی ہلکی ہلکی بُو ضرور آتی رہی اور اسٹو کے پیچھے دو جھیرے اپنی غنودآمیز چیں چاں میں رات بھر بیت بازی کرتے رہے۔ واسلی الئونووچ ارکادی کے کمرے سے اپنے پڑھنے لکھنے کے کمرے میں پہنچ کر بیٹے کے پائنتی صوفے پر ڈٹ کر بیٹھ گئے۔ دراصل وہ اس سے ذرا گپ بازی کرنے آئے تھے، لیکن بازاروف نے تو فوراً ہی یہ کہہ کر انہیں واپس بھیج دیا کہ مجھے نیند آرہی ہے، حالانکہ نیند اسے صبح تک نہیں آئی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے طیش کے عالم میں وہ تاریکی میں گھورتا رہا۔ بچپن کی یادیں اس پر غلبہ پانے کی مطلق سکت نہیں رکھتی تھیں۔ اس کے علاوہ جن تلخ جذبات کی آگ سے اسے گزرنا پڑا تھا، ان کا نقش ابھی تازہ تھا۔ ان سے نجات پانے کے لیے اسے ابھی وقت ہی کہاں ملا تھا۔ ارینا ولاسونا نے پہلے تو خوب دل کھول کر اور گود پھیلا کر دعائیں مانگیں۔ پھر انفوشکا سے بے تحاشا باتیں کرنا شروع کر دیں۔ وہ غریب تو بھوچکی بنی کھڑی رہی۔ پھر اس کی حیرت زدہ نگاہیں مالکہ کے چہرے پر جم جاتیں اور وہ بڑے پُراسرار انداز میں کھسر پھسر کر کے اور کچھ ہاتھ کے اشارے کر کے یوگین وسل یوچ کے بارے میں اپنے تمام خیالات ظاہر کر ڈالتی۔ بڑی بی کی حالت یہ تھی کہ خوشی سے پھولی نہ سماتی تھیں۔ شراب اور تمباکو کے نشے نے انہیں اور بھی سرشار کر دیا تھا۔ بڑے میاں نے ان سے بات کرنا بھی چاہی تھی، لیکن پھر بڑی مایوسی کے عالم میں انہوں نے ہاتھ جھٹکے اور وہاں سے چل دیئے۔

ارینا ولاسیونا اگلے وقتوں کی ٹھیٹ روسی عورت تھیں۔ انہیں آج سے دو صدی قبل قدیم ماسکو کے زمانے میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ بڑی نیک پارسا بی بی تھیں۔ جذباتی بلا کی تھیں۔ نجوم، جادو ٹونے، خواب غرض ہر قسم کے شگون میں اعتقاد رکھتی تھیں۔ مجذوبوں کی پیشگوئیوں کی بڑی قائل تھیں۔ بھوت پریت، چھلاوا، بدشگنی کی ملاقات، کانے سے مڈھ بھیڑ، ٹونہ ٹوٹکا، ان سب ہی چیزوں میں ان کا اعتقاد تھا۔ جمعرات کی جمعرات خاص طور پر تیار کیا

ہوا نمک کھاتی تھیں اور یہ یقین رکھتی تھیں کہ بس اب قیامت آنے والی ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر ایسٹر کی اتوار کو شام کے وقت گرجا میں گھنٹہ بجتے وقت روشنیاں گل نہ ہوں تو گیہوں کی فصل بہت اچھی ہوتی ہے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ جس کیڑے مکوڑے پر آدمی کی نظر پڑ جاتی ہے' اس کی بڑھوتری ماری جاتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی مانتی تھیں کہ جہاں پانی ہوتا ہے' وہاں جن رہنے لگتے ہیں اور یہ کہ ہر یہودی کے سینے پر خون میں ڈوبا ہوا ایک داغ ہوتا ہے۔ چوہیوں سے' سانپوں سے' ابابیلوں سے' جونکوں سے' بجلی کی کڑک سے' ٹھنڈے پانی سے' گھوڑوں کے ہنہنانے سے' بکریوں سے' سرخ بالوں والے آدمیوں سے اور کالی بلیوں سے وہ بے حد ڈرتی تھیں۔ جھینگروں اور کتوں کو سمجھتی تھیں کہ یہ نجس جانور ہیں۔ بچھڑے کا گوشت' فاختہ' بڑی مچھلی' چیز' جھینگا مچھلی' ایسپریگس' خرگوش یہ چیزیں انہوں نے کبھی نہیں کھائیں۔ انہیں تربوز سے بھی پرہیز تھا' اس لیے کہ کٹے ہوئے تربوز سے ذہن یوحنا بپتسم دینے والے کے کٹے ہوئے سر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ گھونگھوں کا نام لیتے ہی ان کے جسم کو جھرجھری سی آ جاتی تھی۔ کھانے پینے پر جان دیتی تھیں' لیکن روزہ کبھی قضا نہیں کیا۔ چوبیس گھنٹوں میں دس گھنٹے سونے کے لیے وقف تھے' لیکن واسلی الوئوو وچ کے سر میں ذرا درد بھی ہو جاتا تھا' تو سونے کا قصہ سرے سے اڑ جاتا تھا۔ ''الیکسیز'' اور ''جنگل کی کٹیا'' سے قطع نظر انہوں نے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ سال بھر میں ایک اور بہت ہوا تو دو خط لکھتی تھیں' لیکن گھر داری کا انہیں بڑا سلیقہ تھا۔ اچار ڈالنا اور چٹنی اور مربے تیار کرنا یہ انہوں نے اپنا مشغلہ بنا رکھا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنے ہاتھ سے انہوں نے کسی چیز کو کبھی نہیں چھوا' بلکہ وہ تو عام طور پر اپنی جگہ سے بھی ہلنا گوارا نہیں کرتی تھیں۔ اریناولاسیونا بڑی نرم دل عورت تھیں اور سچ پوچھئے تو اپنے طور پر وہ ایسی بھولی بھالی بھی نہیں تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ دنیا دو طبقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ آقاؤں کا فرض یہ ہے کہ وہ حکم چلائیں اور بھولے بھالے عوام کا کام یہ ہے کہ ان کی خدمت کریں' لہٰذا کوئی بوٹ کے تسمے کھولے یا زمین پر ناک رگڑے' انہیں ان باتوں سے کبھی کراہت نہیں ہوئی' لیکن جو لوگ بھی ان کی رعیت رہتے تھے' ان سے وہ بڑی شرافت اور نرمی سے پیش آتی تھیں۔ ان کے دروازے سے کبھی کوئی فقیر خالی ہاتھ نہیں پھرا۔ کسی کی کبھی انہوں نے برائی نہیں کی' حالانکہ وہ گپ شپ کی بڑی شوقین تھیں۔

جوانی میں وہ خوبصورت تھیں، گاتی بجاتی تھیں اور تھوڑی تھوڑی فرانسیسی بھی بول لیتی تھیں، لیکن شوہر کے ساتھ جس سے ان کی شادی ان کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی، برسوں تک سیر سپاٹے کرنے کی وجہ سے ان پر چربی چڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ فرانسیسی اور موسیقی بھی بھول بیٹھیں۔ بیٹے پر وہ جان چھڑکتی تھیں اور بے طرح ڈرتی تھیں۔ جائداد کا انتظام انہوں نے واسلی الؤنووچ کے سپرد کر دیا تھا اور اب کسی بات میں دخل نہیں دیتی تھیں۔ جب بڑے میاں آمدہ سرکاری اصلاحات اور خود اپنے منصوبوں پر گفتگو شروع کرتے تھے تو وہ بڑبڑانے لگتی تھیں، اپنا رومال باربار ہلاتی تھیں اور گفتگو جتنا زور پکڑتی جاتی تھی، اتنی ہی ان کی آنکھیں دہشت میں پھٹتی چلی جاتی تھیں۔ وہ ڈری ڈری رہتی تھیں اور ہمیشہ انہیں یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اب آفت آئی، اب مصیبت ٹوٹی۔ جہاں انہیں کوئی غم و افسوس کی بات یاد آئی اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے......اب ایسی عورتیں کہاں نظر آتی ہیں۔ یہ رونے کا مقام ہے، یا خوش ہونے کا، یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

(21)

ارکادی سو کر جب اٹھا تو اس نے کھڑکی کھولی۔ پہلی چیز جس سے اس کی مڈھ بھیڑ ہوئی وہ واسلی الؤنووچ تھا۔ انہوں نے مشرقی طرز کا ایک ڈریسنگ گاؤن پہن رکھا تھا۔ کمر پر ایک پیٹی بندھی تھی اور جیب میں ایک رومال ٹھنسا ہوا تھا۔ بڑی عرق ریزی سے وہ باغ کی نلائی کر رہے تھے۔ اپنے نوجوان مہمان کو دیکھ کر وہ پھاوڑا ٹیک کر کہنے لگے ''جیتے رہو کڑوے نیم سے بڑے ہو۔ رات کیسی گزری؟''

''بہت مزے میں گزری۔''

''میاں دیکھ رہے ہو۔ ہم یاں......کیاریاں بنا رہے ہیں۔ اب تو وہ وقت ہے اور خدا کا بڑا شکر ہے کہ یہ وقت آ گیا کہ ہر شخص کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ دوسروں پر تکیہ کرنا کس نے بتایا ہے۔ آدمی کو اپنا کام آپ کرنا چاہیے۔ اب تو یہ ثابت ہو چکا ہے کہ روسو سچ ہی کہتا تھا۔ میاں صاحبزادے آدھ گھنٹے پہلے تم مجھے دیکھتے تو میرا دوسرا ہی رنگ تھا۔

ایک کسان عورت یہ شکایت لے کر آئی تھی کہ میرے پیٹ میں مروڑ ہو رہا ہے۔ یہ لوگ اسے یہی کہتے ہیں۔ اپنی زبان میں اسے پیچش کہا جاتا ہے۔ میں نے..... میں کیسے بتاؤں؟ میں نے اسے ذرا سی افیم دے دی۔ پھر میں نے اس کا دانت نکال دیا۔ میں نے اس کے لیے بیہوشی کی دوا تجویز کی تھی، مگر وہ رضامند ہی نہ ہوئی۔ بھئی بات یہ ہے کہ مجھے مفت میں اس کام کا شوق سا ہے۔ بس میں اس کا عادی ہوں۔ یوں آپ جانیں کہ میں اناڑی ہوں۔ بس سٹرپٹر کر لیتا ہوں...... اِدھر سائے میں آ جایئے گا نا۔ چائے سے پہلے صبح کی ذرا تازہ تازہ ہوا بھی کھا لیجیے۔"

ارکادی ان کے پاس جا پہنچا۔

واسلی الؑونووچ نے فوجی انداز میں اپنے سر پر منڈی ہوئی چکنی ٹوپی پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا اور بولے "خوش رہو۔ میرا خیال ہے کہ تم عیش و آرام اور سیر و تفریح کے عادی ہو، لیکن دنیا کے بڑے بڑے لوگ بھی چند ایک دن جھونپڑوں میں گزار دینے میں مضائقہ نہیں سمجھتے۔"

ارکادی احتجاجاً کہنے لگا "آپ کیا فرما رہے ہیں۔ گویا میں بڑی ہستی ہوا اور پھر یہ کہ میں عیش و آرام کا قائل ہوں۔"

واسلی الؑونووچ نے بڑی لجاجت سے جواب دیا "میاں کوئی غلطی ہو تو معاف کر دو۔ یوں میں اب گوشہ نشین ہوں، لیکن ایک زمانے میں، مَیں بھی زمانے کی خاک چھان چکا ہوں۔ اب بھی یہ حالت ہے کہ اڑتی چڑیا کو پہچان لیتا ہوں۔ مجھے نفسیات میں بھی شدھ بدھ ہے اور تھوڑی بہت علم الابدان میں بھی اٹکل رکھتا ہوں۔ میں یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ اگر مجھے اِن چیزوں کی شدھ بدھ نہ ہوتی تو میرا تو کبھی کا پٹرا ہو گیا ہوتا۔ مجھ جیسے غریب آدمی کے لیے بھلا کیا گنجائش ہو سکتی تھی۔ اس میں کوئی خوشامد کی بات نہیں ہے۔ مجھے واقعی یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ تمہاری اور میرے بیٹے کی اتنی دوستی ہے۔ میں نے ابھی ابھی اسے دیکھا تھا۔ معمول کے مطابق وہ منہ اندھیرے اٹھا۔ تم تو اس کی عادت سے واقف ہو گے ہی۔ یہاں سے وہ گھومنے نکل گیا۔ اچھا میاں یہ تو کہو کہ کیا تم اسے دیر سے جانتے ہو؟"

''پچھلے جاڑوں سے!''

''اچھا'ایک بات اور پوچھوں؟لیکن ہم بیٹھ جائیں نا۔بھئی میں آخرکواس کا باپ ہوں۔اگر میں اس کے متعلق بے تکلفی سے کوئی بات پوچھ لوں تو تمہیں اعتراض نہ ہونا چاہیے۔میرے یوگین کے متعلق تمہاری رائے کیا ہے؟''

ارکادی نے بڑے زور اور جوش سے جواب دیا''آپ کے بیٹے کے کیا کہنے۔ایسے زبردست آدمی میں نے زندگی میں کم دیکھے ہیں۔''

واسلی الٔونووچ کی آنکھیں یک لخت چمک اٹھیں اوران کے رخساروں پرایک ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔پھاؤڑاان کے ہاتھ سے گر پڑا۔

''تو تمہیں توقع یہ ہے....''

انہوں نے کہنا شروع ہی کیا تھا کہ ارکادی بیچ میں بول اٹھا''مجھے یقین ہے کہ آپ کے بیٹے کا مستقبل بڑا شاندار ہے۔آپ کا نام اونچا کرے گا۔میں جب پہلی مرتبہ اس سے ملا تھا'اسی وقت سے مجھے اس کا یقین ہے۔''

''کیسے.....کیسے ملے؟''واسلی الٔونووچ کے منہ سے یہ الفاظ بمشکل نکل سکے۔ ان کے چوڑے دہانے پرایک فاتحانہ مسکراہٹ کھیلنے لگی'جوکسی طرح زائل ہونے ہی کو نہ کہتی تھی۔

''آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اس ملاقات کا ذکر کروں؟''

''ہاں.....اور بالکل.....''

ارکادی نے قصہ سنانا شروع کردیا اور بڑی گرمجوشی سے بازاروف کی باتیں کرنے لگا۔اس نے تو وہ گرمجوشی دکھائی کہ اس کے سامنے وہ جوش وخروش بھی ماند پڑ گیا' جس کا مظاہرہ اس نے اس شام کو کیا تھا'جب وہ اودن تسوف کے ساتھ مازرکا ناچ ناچا تھا۔

واسلی الٔونووچ باتیں سننے لگے۔پھروہ آنکھیں جھپکنے لگے اور رومال کی گیند بنا کر اپنے دونوں ہاتھوں میں گھمانے لگے۔ایک ذرا کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا۔بالوں پر ہاتھ پھیر کرانہیں سنوارا اور آخرکار صبر کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔انہوں نے جھک کر ارکادی کے شانے کا بوسہ لیا اور مسکرا کر کہنے لگے''تم نے میرا دل خوش کردیا۔''وہ بدستور

مسکرائے جا رہے تھے۔ ''میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں.....اپنے بیٹے کی پرستش کرتا ہوں۔ اپنی بوڑھی بیوی کا میں ذکر نہیں کروں گا۔ کون نہیں جانتا کہ ماؤں کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن مجھے یہ ہمت نہیں پڑتی کہ اس کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کروں۔ اسے یہ باتیں پسند نہیں۔ جذبات کا مظاہرہ کسی بھی قسم کا ہو وہ اس سے متنفر رہتا ہے۔ بہت سے لوگ تو اس کی اِس کردار کی پختگی میں بھی کیڑے ڈالتے ہیں اور اسے غرور یا خشک مزاجی کا ثبوت بتاتے ہیں، لیکن اس جیسے لوگوں کو عام معیار سے تو نہیں جانچنا چاہیے، یا جانچنا چاہیے؟ اس کی مثال یوں لے لو کہ اس کی جگہ اور کوئی شخص ہوتا، تو ماں باپ کے لیے ایک مستقل بار بن کر رہ جاتا۔ مگر تمہیں یقین نہ آئے گا۔ خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ اس نے ضرورت سے کبھی ایک کوڑی زیادہ نہیں مانگی۔''

ارکادی نے فتویٰ لگایا ''وہ بڑا بے نیاز اور دیانتدار قسم کا انسان ہے۔''

''واقعہ ہے یہ۔ بڑا بے نیاز شخص ہے۔ ارکادی نکولائی وچ! سچ جاننا میں صرف اس کی پرستش نہیں کرتا، مجھے اس پر ناز ہے اور میری آرزو تو یہ ہے کہ ایک دن وہ آئے کہ اس کی سوانح عمری میں یہ سطریں لکھی جائیں ''ایک معمولی سے فوجی ڈاکٹر کے گھر پیدا ہوا، لیکن بچپن ہی میں اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ ایک روز وہ بڑا آدمی بنے گا اور اس نے لوہے کے چنے چبا کر تعلیم حاصل کی......'' بڑے میاں کی آواز نے یہاں آ کر دم توڑ دیا۔

ارکادی نے ان کا ہاتھ دبایا۔

واسلی الؤنووچ نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد پوچھا ''اچھا میاں یہ بتاؤ کہ تم نے اس کی نام آوری کی جو پیشگوئی کی ہے، تو کیا وہ ڈاکٹری میں نام پیدا کرے گا؟ کیا خیال ہے تمہارا؟''

''نہیں ڈاکٹری میں نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس میدان میں بھی وہ چوٹی کے آدمیوں کا ہمسر بنے گا۔''

''تو بھئی ارکادی نکولائی وچ! وہ کس میدان میں نام پیدا کرے گا؟''

''ابھی سے یہ بتانا تو مشکل ہے، بہر حال وہ ہو گا نامی گرامی آدمی۔''

''نامی گرامی آدمی ہو گا وہ۔'' بڑے میاں نے یہ الفاظ دہرائے اور پھر وہ خیالات

کی دنیا میں ڈوب گئے۔

اتنے میں انفسوشکا تازہ تازہ رس بھریوں سے بھری ہوئی ایک تھالی لے آئی اور بولی ''ارینا ولاسیونا بی بی نے مجھے بھیجا ہے۔ کہتی ہیں چائے تیار ہے۔''

واسلی الوئنووچ چونک کر بولے ''رس بھریوں کے لیے ٹھنڈی کریم بھی ہے؟''

''جی!''

''ارکادی نکولائی وچ! بھئی تکلف مت کرو۔ لونا' مگر یوگین کیوں نہیں آتا؟''

''میں یہ رہا۔'' ارکادی کے کمرے سے بازاروف کی آواز آئی۔

واسلی الوئنووچ نے جلدی سے مڑ کر دیکھا ''اخا' تم! اپنے دوست سے ملنے گئے تھے' لیکن بڑی دیر سے پہنچے۔ ہم تو لمبی چوڑی باتیں کر کے نبٹ بھی گئے۔ اب چلو چائے پی لو۔ تمہاری ماں بلا رہی ہیں۔ ہاں میں ذرا تم سے ایک دو باتیں کرنا چاہتا تھا۔''

''کس بارے میں؟''

''یہاں ایک کسان ہے' اسے یرقان ہو گیا ہے....''

''یرقان ہو گیا ہے؟''

''ہاں بڑی مہلک اور خطرناک قسم کا یرقان ہوا ہے۔''

''لیکن یہ تو روک تھام کی تدبیریں ہوئیں۔ اس کا زیادہ معقول اور ٹھوس علاج ہونا چاہیے۔ یہ اور بات ہے کہ تم طب کا مذاق اڑاتے ہو' مگر یہ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے کوئی مفید مشورہ دے سکتے ہو' لیکن خیر اس پر بعد میں باتیں ہوں گی۔ اب تو تم چل کر چائے پی لو۔''

واسلی الوئنووچ بڑی پھرتی سے اپنی جگہ سے اٹھے اور ایک شعر گنگنانے لگے۔

یہ اصول یہ ضابطے ہم نے خود وضع کیے ہیں۔
محض اس لیے کہ زندگی چین سے گزرے۔

''واہ کیا تر و تازگی ہے؟'' بازاروف کھڑکی کی طرف سے ہٹتے ہوئے بولا۔

دوپہر ہو چلی تھی۔ سفیدی مائل بادلوں کے باریک نقاب کے پیچھے سورج تپ رہا تھا۔ چاروں طرف ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سارے ہنگامے خاموش تھے۔ بس ایک مرغے

تھے، جو تاؤ میں آ آ کر ایک دوسرے کے جواب میں ککڑوں کوں کی صدائیں بلند کیے جا رہے تھے اور ان آوازوں کو جو بھی سنتا تھا، اس پر غنودگی اور بیزاری کا ایک عجیب سا عالم طاری ہو جاتا تھا اور کہیں کسی درخت کی اونچی چوٹی پر ایک شکرے کا بچہ غم آلود آواز میں لگاتار چہچہائے جا رہا تھا۔ ارکادی اور بازاروف پھونس کے ایک چھوٹے سے چھپر کے نیچے لیٹے تھے۔ انہوں نے دو گودیں بھر کر گھاس اپنے نیچے بچھائی تھی۔ یہ گھاس تھی خشک اور چرمر بول رہی تھی، لیکن ابھی اس میں ہریائی اور سوندھا پن باقی تھا۔

بازاروف کہنے لگا "اس بید مجنوں کے درخت کو دیکھ کر مجھے اپنا بچپن یاد آ جاتا ہے۔ وہ اس غار کے کنارے پر جہاں سے اینٹیں کھدی ہوئی ہیں، اگا ہوا ہے۔ ان دنوں میرا یہ بڑا پختہ عقیدہ تھا کہ اس غار میں اور اس درخت میں کوئی طلسماتی طاقت ہے۔ جب میں اس جگہ ہوتا تھا، تو کبھی اکتاہٹ نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ اکتاہٹ اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ میں بچہ ہوں، لیکن اب میں بڑا ہو گیا ہوں، طلسم ٹوٹ چکا ہے۔"

"تم یہاں کل کتنے عرصے رہے؟" ارکادی نے دریافت کیا۔

"دو سال، پھر ہم سفر پر نکل پڑے۔ آوارہ گردی اپنا شیوہ بن گئی۔ گاؤں گاؤں مارے مارے پھرتے تھے۔"

"اور یہ مکان کیا بہت پرانا ہے؟"

"ہاں، میرے نانا نے اسے بنوایا تھا۔"

"تمہارے نانا کیا تھے؟"

"اپنی بلا جانے، یہی کچھ سیکنڈ میجر ویجر تھے۔ سودروف کی فوج میں رہے تھے۔ جب دیکھو الپس عبور کرنے کی داستانیں سنا رہے ہیں۔ غالباً گپیں ہوتی تھیں۔"

"ڈرائنگ روم میں سودروف کی ایک تصویر بھی لگی ہے۔ تمہارا یہ چھوٹا سا گھر خوب ہے۔ مجھے ایسے گھر بہت پسند ہیں۔ اپنا وہی پرانا طرز اور خوب گرم رہتے ہیں۔ بس ان کی ایک خاص ہی فضا ہوتی ہے۔"

"ہاں لالٹین کے تیل اور تیتپا گھاس کی بدبو کی فضا۔"

بازاروف نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ "اور ان چھوٹے چھوٹے پیارے مکانوں

میں وہ مکھیاں بھنکتی ہیں کہ الٰہی توبہ۔"

ارکادی اک ذرا وقفے کے بعد پھر بولا "اچھا یہ بتاؤ کہ جب تم بچے سے تھے تو یہ لوگ تم پر سختی کرتے تھے؟"

"یہ تو تم اندازہ لگا ہی سکتے ہو کہ میرے والدین کس قسم کے آدمی ہیں۔ ان کے مزاج میں سختی و خشی نہیں ہے۔"

"یوگین! تمہیں ان سے اُنس بھی ہے؟"

"ہاں، ہاں ارکادی مجھے ان سے اُنس ہے۔"

"اور انہیں تم سے کتنا اُنس ہے؟"

بازاروف تھوڑی دیر چپ رہا، پھر اپنے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ کر بولا "جانتے ہو میں کیا سوچ رہا ہوں؟"

"نہیں! کیا سوچ رہے ہو؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ میرے والدین کی زندگی بڑے چین سے گزرتی ہے۔ میرا باوا اب ساٹھ کے پیٹے میں ہے، مگر دیکھو کیا دندناتا پھرتا ہے۔ لوگوں کے علاج معالجہ کرتا ہے، روگ کی دوائیاں تجویز کرتا ہے، کسانوں پر عنایتیں کرتا ہے، آقائیت بگھارتا ہے۔ مختصر یہ کہ راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ ہماری ماں ہیں وہ بھی عیش کرتی ہیں۔ قسم قسم کے فرائض کے نیچے دبی پڑی ہیں، پھر سسکیاں اور سرد آہیں بھی اچھا خاصا مشغلہ ہیں۔ غرضیکہ سر اٹھانے کی فرصت نہیں ہوتی۔ اپنے متعلق سوچنے کی مہلت کہاں سے ملے اور ایک میں ہوں......"

"اور ایک تم ہو؟"

"میں سوچ رہا ہوں۔ میں ایک چھپر کے نیچے پڑا ہوں..... یہ تل بھر جگہ جو میں نے گھیر رکھی ہے، وہ باقی کی اس بسیط مکانی فضا کے مقابلے میں کیا بساط رکھتی ہے، جہاں میں نہیں ہوں اور جس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور جو مدت ہمارے نوشتہ حیات میں لکھی گئی ہے، وہ اس ابدیت کے مقابلے میں ہیچ ہے، جس میں میری کوئی جگہ نہیں ہے، جس میں میری کوئی جگہ نہیں ہوگی..... اور اس پدی جیسے جسم میں، اس ذرّے میں، ریاضی کے اِس نقطہ میں

خون گردش کر رہا ہے، دماغ کام کر رہا ہے اور کسی چیز کی آرزو کر رہا ہے..... کتنی حقیر سی بات ہے؟ یہ کم مائیگی نہیں تو اور کیا ہے؟''

''اجازت ہو تو عرض کروں کہ جناب جوار شاد فرما رہے ہیں، اس کا اطلاق مجموعی طور پر تمام انسانوں پر ہوتا ہے۔''

''درست ہے!'' بازاروف بات کاٹ کر بولا۔ ''میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ لوگ یعنی میرے ماں باپ اپنے حال میں مگن ہیں۔ اپنی بے بضاعتی پر وہ غور کرنے کی تکلیف مول ہی نہیں لیتے۔ انہیں یہ فکر کبھی ستاتی ہی نہیں...... اس کے برخلاف میں...... اکتاہٹ اور غصے کے سوا مجھے کسی اور چیز کا احساس ہی نہیں ہوتا۔''

''غصہ؟ آخر غصہ کیوں؟''

''کیوں؟ یہ تم پوچھتے ہو کہ کیوں؟ تم بھول گئے؟''

''مجھے ہر بات یاد ہے، پھر بھی میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ ہمیں غصہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ مان لیا کہ تم بدقسمت ہو لیکن......''

''چہ چہ! اس کا مطلب یہ ہے کہ ارکادی نکولائی وچ صاحب! آپ بھی محبت کو وہی سمجھتے ہیں، جو باقی جدید رنگ کے نوجوان اس کے متعلق تصور رکھتے ہیں۔ کڑ کڑ کر کے تم مرغی کو اپنے پاس بلاتے ہو اور جب مرغی قریب آتی ہے تو تم بھاگ کھڑے ہوتے ہو۔ میں اس قماش کا آدمی نہیں ہوں، مگر خیر بہت ہوئی، جس میں اپنا بس نہ ہو اس کے متعلق باتیں کرنا فضول ہے۔'' پھر وہ پہلو بدل کر بولا ''اوہو ہو! دیکھو یہ ایک جیالا چیونٹا ایک آدھ مری مکھی کو گھسیٹے لیے جا رہا ہے۔ ہاں بھائی لے جا لے جا، اسے ہاتھ پیر مارنے دو۔ چھوڑنا مت۔ بھائی تو حیوان ہے۔ حیوان کی حیثیت سے تجھے حق ہے کہ رحم کے جذبے کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دے۔ اپنی حیوانیت سے زیادہ سے زیادہ تجھے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ہمارا کیا ہے، ہم تو بامروّت قسم کے حیوان ہیں۔ اپنے آپ پر ظلم توڑتے ہیں۔ ہم پر نہ جانا۔''

''یوگین! تمہیں تو یہ نہیں کہنا چاہیے۔ تم نے اپنے آپ پر کب ظلم توڑا ہے۔''

بازاروف نے اپنا سر اٹھایا۔ ''بس یہی تو ایک بات ہے جس پر مجھے ناز ہے۔ میں نے اپنے آپ کو تباہ نہیں کیا ہے، اس لیے کوئی عورت بھی مجھے تباہ نہیں کر سکتی۔ آمین۔ چلیے

قصہ ختم ہوا۔ اب اس کے بارے میں تم میری زبان سے ایک لفظ نہیں سنو گے۔''

دونوں دوست تھوڑی دیر خاموش لیٹے رہے۔

''واہ'' بازاروف پھر شروع ہو گیا۔ ''آدمی بھی عجب جناور ہے۔ ہمارے بزرگ جو یہاں زندہ درگور قسم کی زندگی گزار رہے ہیں' اس پر اگر دور سے ایک سمت میں کھڑے ہو کر نظر ڈالی جائے تو دیکھنے والا سوچنے لگتا ہے کہ اس سے بہتر اور کیا صورت ہو سکتی تھی۔ آپ کھاتے ہیں' پیتے ہیں اور سمجھ بیٹھتے ہیں کہ آپ کا طرز عمل بڑا معقول بڑا اسلجھا ہوا ہے اور اگر یہ نہیں ہے تو آپ کو بیزاری گھیر لیتی ہے۔ ایک شخص دوسرے لوگوں سے محض اِس نیت سے ملتا ہے کہ ان سے ناجائز فائدہ اٹھائے۔''

ارکادی نے بڑے گمبھیر انداز میں اس خیال کی تائید کی ''آدمی کو اپنی زندگی میں ایسا قرینہ پیدا کرنا چاہیے کہ اس کا ہر لمحہ اہم ہو با معنی ہو۔''

''میں یہاں تک کہنے پر تیار ہوں کہ جس بات کی کوئی اہمیت ہوتی ہے۔ اس میں صحیح یا غلط قسم کا ایک لطف بھی ہوتا ہے اور یوں ایسی بات کے لیے بھی آدمی اپنے آپ کو ذہنی طور پر آمادہ کر سکتا ہے' جس کی کوئی اہمیت نہ ہو' لیکن جو چیز برداشت نہیں ہوتی' وہ چھچھورپن ہے۔''

''انسان جب تک چھچھورپن کے وجود کو تسلیم نہ کرے' چھچھورپن اس کے لیے وجود ہی نہیں رکھتا۔''

''ہوں..... تم نے بس اتنا کیا ہے کہ ایک پیش پا افتادہ بات کو الٹ کر کہہ دیا ہے۔''

''کیا؟ کیا مطلب ہے تمہارا اس اصطلاح سے؟''

''میں بتاتا ہوں۔ مثلاً اگر یہ کہا جاتا ہے کہ تعلیم مفید چیز ہے' تو یہ پیش پا افتادہ بات ہوئی' لیکن اگر یہ کہا جائے کہ تعلیم ضرر رساں چیز ہے تو یوں سمجھئے کہ پیش پا افتادہ بات کی ٹانگیں اوپر سر نیچے کر دیا گیا ہے۔ اس میں انداز بیان کی خوبی تو ضرور ہے' مگر دراصل ہے یہ وہی چیز۔''

''اور اس میں سچ بات کون سی ہے؟''

''کون سی ہے؟ میرا جواب اس سوال کی صدائے بازگشت ہے'کون سی ہے'؟''

''یوگین! آج تم پر افسردگی کا دورہ پڑ رہا ہے۔''

''واقعی؟ شاید سورج کی گرمی سے میرا دماغ کھدبدانے لگا ہے اور پھر اتنی رس بھریاں ہضم کرنا بھی تو میرے لیے آسان نہیں ہے۔''

ارکادی نے جواب دیا''تو میرا مشورہ یہ ہے کہ ایک نیند لے لو۔''

''ضرور' مگر شرط یہ ہے کہ مجھے دیکھنا مت۔ سوتے وقت ہر شخص کے چہرے پر حماقت برسنے لگتی ہے۔''

''لیکن لوگ تمہارے متعلق کچھ ہی سوچا کریں' تمہاری بلا سے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کیا جواب دوں۔ بھلے آدمی کو اس پر توجہ تو نہیں دینی چاہیے۔ بھلا آدمی وہ ہے جس کے متعلق سوچنا فضول سی بات ہو' جس کے آگے یا تو لوگ سر تسلیم خم کر دیں یا نفرت کرنا شروع کر دیں۔''

ارکادی نے ایک لمحہ سوچ کر جواب دیا''یہ خوب لطیفہ ہے۔ میں تو کسی سے نفرت نہیں کرتا۔''

''اور میں سینکڑوں سے نفرت کرتا ہوں۔ تم ٹھہرے ڈھیلے ڈھالے لجلجے قسم کے انسان۔ تم کسی سے نفرت کر کیسے سکتے ہو؟..... تم بزدل ہو۔ تمہیں اپنے آپ پر بھروسہ ہی نہیں ہے۔''

''اور تم؟'' ارکادی ٹوک کر بولا۔''تمہیں اپنے متعلق بڑا حسن ظن ہے۔ تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو؟''

بازاروف نے اِک ذرا تامل کیا' پھر ایک ایک لفظ ایک ایک حرف پر زور دیتے ہوئے بولا''جب مجھے کوئی ایسا شخص ملے گا جو میرے سامنے ٹک سکے تو میں اپنے متعلق اپنی رائے بدل ڈالوں گا۔ ہاں نفرت' نفرت۔ مثلاً آج جب ہم فلپ کارندے کے گھر کے پاس سے گزرے تھے (یہی ایک گھر یہاں صاف ستھرا نظر آتا ہے) تو تم نے کہا تھا کہ جب غریب سے غریب کسان کا بھی گھر ایسا ہو جائے تو سمجھ لینا کہ روس کی نیاّ تر گئی اور ہم میں سے ہر شخص کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ یہ دن جلد آئے.....اور اس غریب سے غریب

کسان سے مجھے بے حد نفرت ہوگئی۔ میں اس کے لیے اپنی کھال تک بیچ دینے کے لیے تیار ہوں اور وہ اس کے لیے مجھ سے دو حرف شکریے کے بھی نہیں کہے گا..... اور آخر وہ کیوں میرا شکریہ ادا کرے؟ فرض کیجیے وہ صاف ستھرے مکان میں رہتا ہے اور میرے گھر کی کیفیت یہ ہے کہ در و دیوار پر سبزہ اگ رہا ہے' تو بتائیے مجھے اس سے کے کوڑی کا نفع ہوا؟"

"یوگینی بس کرو...... اگر آج کوئی تمہاری باتیں سن پائے تو اسے ان لوگوں کی باتوں کا یقین آ جائے گا' جو ہم پر لعنت ملامت کرتے ہیں کہ تم بے اصولے لوگ ہو۔"

"تم تو اپنے تایا جان کی سی باتیں کرتے ہو۔ عمومی اصول سرے سے وجود ہی نہیں رکھتے۔ تم اب تک یہ بھی نہ سمجھے۔ بس ایک احساسات کا وجود ہے۔ ہر بات کا انحصار ان پر ہے۔"

"یہ کیسے؟"

"مثلاً میں ہوں۔ میں نے اپنے محسوسات کی بنا پر منفی رویہ اختیار کیا ہے۔ مجھے اسی میں مزہ آتا ہے کہ ہر چیز سے انکار کروں۔ میری ذہنیت اسی کینڈے کی ہے۔ اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ مجھے کیمسٹری سے کیوں شوق ہے؟ تمہیں سیبوں کا کیوں شوق ہے؟ محض اپنے محسوسات کی بنا پر۔ بات ایک ہی ہے۔ اس سے آگے انسان کے ذہن کی رسائی کبھی نہیں ہوگی اور یہ بات بھی تمہیں ہر شخص نہیں بتائے گا اور واقعہ یہ ہے کہ اگلی مرتبہ خود میں بھی یہ نہیں بتاؤں گا۔"

"اچھا اور کیا ایمانداری بھی احساسات کا معاملہ ہے؟"

"میں تو یہی سمجھتا ہوں۔"

"یوگین۔" ارکادی نے بڑے مایوسانہ انداز میں بات شروع کی تھی.... بازاروف بات کاٹ کر بولا "کہو کہو کیا کہتے ہو؟ بھائی میرے اگر تم ہر چیز کی جڑیں کاٹنے پر ہی تلے ہو تو اپنی ٹانگوں کو کیوں بخشتے ہو؟ مگر خیر الٰہیات پر بہت بحث ہو چکی۔ پشکن نے کہا ہے۔ "فطرت کے تنفس میں نیند کی خاموشی بسی ہوتی ہے۔"

ارکادی نے اس پر احتجاج کیا "اس نے اس قسم کا کوئی شعر نہیں کہا ہے۔"

''اچھا اگر اس نے نہیں کہا تو شاعر کی حیثیت سے وہ کہہ ضرور سکتا تھا' بلکہ اسے یہ کہنا چاہیے تھا۔ سرا سر ایک بات اور' یہ شخص ضرور کوئی فوجی تھا۔''

''پشکن فوج میں کبھی نہیں رہا۔''

''مگر پھر اس کے دیوان کے ہر صفحہ پر کیا لکھا ہے۔ روس کی عزت کے لیے رَن کو چلو' لڑ مرو۔''

''بھئی تم تو افسانے تراشتے ہو' میں اعلانیہ کہتا ہوں' یہ سراسر تہمت ہے۔''

''تہمت؟ یہ معاملہ تو بہت زیادہ سنگین ہے۔ جناب کو بھی ڈرانے کے لیے کون سا لفظ ملا ہے۔ کسی آدمی پر تم جو بھی الزام لگاؤ اس کے متعلق یہ یقین کر لو کہ وہ دراصل اس سے بیس گنا زیادہ الزام کا مستحق ہے۔''

ارکادی بہت کڑھا اور بولا ''بہتر یہ ہے کہ ہم چل کر اب سو جائیں۔''

''بڑی خوشی سے۔'' بازاروف نے جواب دیا' لیکن نیند ان میں سے کسی کو بھی نہ آئی۔ دونوں پر ایک عجیب ہی سا احساس طاری ہو گیا' گویا وہ ایک دوسرے سے تپ گئے ہیں۔ پانچ منٹ بعد دونوں نے آنکھیں کھول دیں اور چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

''دیکھو' ارکادی ایکا ایکی بول اٹھا ''وہ ایک خشک پتی جھڑی ہے اور زمین پر گر رہی ہے۔ اس کی جنبشوں کو دیکھ کر بالکل یہ گمان گزرتا ہے کہ کوئی تیتری اڑ رہی ہے۔ ہے نا عجیب سی بات؟ اداسی اور زوال میں بھی ایک چمک' ایک زندگی ہوتی ہے۔''

بازاروف چیخ کر بولا ''یار! میرے ارکادی نکولائچ!! میں تیرے ہاتھ جوڑتا ہوں' بس ایک بات مان لے۔ یہ شاعرانہ باتیں مت کر۔''

''میری مرضی ہے جو باتیں کروں...... اور میں اعلان کرتا ہوں کہ یہ واقعی مطلق العنانی ہے۔ میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے۔ میں اس کا اظہار آخر کیوں نہ کروں؟''

''ہاں..... آں اور میں اپنے خیالات کا اظہار کیوں نہ کروں؟ میرا خیال یہ ہے کہ شاعرانہ گفتگو قطعی طور پر ناشائستہ گفتگو ہوتی ہے۔''

''اور شائستہ گفتگو کیا ہوتی ہے؟''

''ہاہاہا..... میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم واقعی اپنے تایا جان کے نقش قدم پر چلنے کی نیت باندھ رہے ہو۔ اگر اس مریل نے تمہاری یہ باتیں سن لی ہوتیں تو خوشی سے پھولا نہ سماتا۔''

''تم نے پافل پیئر وچ کو کیا کہا ہے؟''

''میں نے انہیں مریل کہا ہے اور بالکل ٹھیک کہا ہے۔''

ارکادی چیخ کر بولا ''لیکن یہ انتہائی نا قابل برداشت ہے۔''

بازاروف نے بڑے سکون کے ساتھ کہا ''اخا.... یہ خاندانی احساس بول رہا ہے۔ مجھے خوب پتہ ہے یہ احساس کس بری طرح لوگوں سے چمٹا رہتا ہے۔ آدمی ہر چیز تیاگ دیتا ہے' ہر قسم کی عصبیت کو کچل ڈالتا ہے' لیکن مثال کے طور پر اگر یہ تسلیم کرنے کا سوال درپیش ہو کہ اس کا بھائی' جو رومال چراتا پھرتا ہے' چور ہے' تو یہ اس کے لیے قبول کرنا بہت بڑا مرحلہ ہوگا اور جب آدمی یہ سوچنے لگتا ہے کہ میرا بھائی' میرا..... جو عقل سے عاری ہے..... اِس تصور کو آسانی سے نہیں نگلا جا سکتا۔''

ارکادی نے بھنا کر تیزی سے جواب دیا ''یہ خاندانی احساس نہیں تھا' بلکہ انصاف کا تقاضا تھا' جس نے مجھ سے یہ الفاظ کہلوائے' لیکن چونکہ یہ ایسا تقاضا ہے' جسے تم نہیں سمجھتے' چونکہ تم احساس سے عاری ہو' اس لیے تم اسے پرکھ بھی نہیں سکتے۔''

''بالفاظ دیگر ارکادی کرسانوف صاحب اس بلند مقام پر ہیں' جو میری عقل وفہم سے بالاتر ہے۔ میں ان کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں اور آگے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔''

''یوگین! بس کرو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم میں لڑائی ہو پڑے گی۔''

''ارکادی! مجھ پر ایک عنایت کرو۔ میں تمہارے پیروں پڑتا ہوں۔ ایک مرتبہ ہم پورے خلوص کے ساتھ لڑ پڑیں.....''

''لیکن اس صورت میں شاید نوبت یہ پہنچے کہ.....''

''ہاتھا پائی ہو جائے؟'' بازاروف بیچ میں بول پڑا۔ ''کیا مضائقہ ہے؟ یہاں نرم نرم گھاس پر اِس سبزہ زار میں' دنیا سے دُور' انسانوں کی نگاہوں سے دُور اگر کشتی ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے' لیکن تم میرا جوڑ نہیں ہو۔ میں منٹ بھر میں تمہاری گردن پکڑ

کر چُر مُر کر دوں گا۔''

بازاروف نے اپنی لمبی لمبی خوفناک انگلیاں پھیلا لیں..... ارکادی نے ایک پھریری لی اور مزاحمت کے لیے یوں تیار ہوا گویا مذاق کر رہا ہو.....لیکن اسے اپنے دوست کے چہرے پر انتقامی جذبے کے اتنے شدید آثار نظر آئے اور اس کی اس مسکراہٹ میں جس نے اس کے ہونٹوں کی شکل بگاڑ دی تھی اور ان چمکتی ہوئی آنکھوں میں کچھ اس قدر بغض و عناد جھلکتا دکھائی دیا کہ وہ غیر ارادی طور پر سہم گیا۔

ٹھیک اسی لمحے واسلی آئونووچ کی آواز سنائی دی ''اچھا تو تم لوگ یہاں بیٹھے ہو!'' اور بڈھا فوجی ڈاکٹر ان کے سر پر آن دھمکا۔ اس نے گھر کی سلی ہوئی پی جیکٹ اور ایک تنکوں کا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ یہ ہیٹ بھی گھر کا ہی تیار کیا ہوا تھا۔ ''میں تمہیں دیکھتا پھر رہا تھا..... خیر تم نے جگہ تو اچھی چھانٹی ہے اور بڑے مصروف ہو۔ زمین پر لیٹے ہیں' آسمان پر نگاہیں جمی ہیں۔ معلوم ہے تمہیں اِس میں بھی ایک مخصوص کیفیت ہے؟''

''میں تو آسمان کی طرف صرف اُس وقت دیکھتا ہوں' جب مجھے چھینک آنے لگتی ہے۔'' بازاروف غرانے لگا اور ارکادی سے مخاطب ہو کر وہ آہستہ سے بولا ''افسوس انہوں نے آ کر کھنڈت ڈال دی۔''

اور واسلی آئونووچ اپنا سر ہلا ہلا کر اور اس مڑی ہوئی چھڑی پر' جس کی موٹھ پر ترک کی تصویر بنی ہوئی تھی' بازو ٹیکے کہہ رہے تھے ''یہ دیکھ کر میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔ تم میں اتنی جان ہے' جوانی اور تازگی ہے' دماغ ہے' صلاحیتیں ہیں' خوب جوڑی ہے۔ اسے قران السعدین سمجھنا چاہیے۔''

''دیومالا کا جھمیلا شروع ہو گیا۔ ہاں ہاں کہے جائیے۔'' بازاروف فقرہ بازی پر اتر آیا تھا۔ ''پہلی ہی نظر میں آدمی تاڑ سکتا ہے کہ یہ بھی اپنے زمانے میں لاطینی کے عالم فاضل رہے ہوں گے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ لاطینی نثر لکھنے پر آپ کو ایک چاندی کا میڈل بھی ملا تھا' ہیں ناں؟''

واسلی آئونووچ بولے ''ہاں' ہاں قران السعدین۔''

''باوا جان ختم کرو نا' یہ اترانا چھوڑیئے۔''

بڑے میاں بڑبڑانے لگے ''ایک طرح سے دیکھو تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ ہاں بھئی میں کسی اور شوق میں تمہیں نہیں دیکھتا پھر رہا تھا۔ ایک تو تمہیں یہ بتانا تھا کہ کھانے کا وقت قریب ہے۔ دوسرے یہ کہ یوگین تمہیں یہ بتانا تھا..... ماشاء اللہ تم سمجھدار ہو دنیا کی رِیت رسم سے واقف ہو اور پھر تم جانو کہ یہ عورتیں کچھ اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ لہٰذا معاف..... تمہاری ماں چاہتی ہیں کہ تمہارے آنے کی خوشی میں ڈھول بجنے بجانے کا سلسلہ ہو جائے۔ یہ نہ سمجھنا کہ اس دعا و شکر کے ہنگامے میں تمہیں لے جانے کے لیے آیا ہوں۔ وہ تو اب ختم بھی ہو گیا۔ البتہ فادر الکسی.....''

''گاؤں کا پادری؟''

''ہاں ہاں پادری صاحب! وہ..... ہمارے ساتھ..... کھانا تناول فرمائیں گے..... مجھے تو اس کا مطلق خیال نہیں اور نہ میں یہ چاہتا تھا..... مگر بس کچھ یہ بات ہو ہی گئی..... وہ میری بات ہی نہیں سمجھے..... اور پھر..... ارینا ولاسیونا..... اس کے علاوہ وہ بیچارے ہیں بہت قابل اور معقول آدمی۔''

بازاروف نے سوال کیا ''وہ میرا کھانا تو نہیں سونڈ جائیں گے؟''

واسلی آئونووچ ہنس پڑا ''کیسی باتیں کرتے ہو۔''

''ہاں بس مجھے یہی پوچھنا تھا۔ یوں میں کسی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکتا ہوں۔''

واسلی آئونووچ نے اپنا ہیٹ درست کیا ''مجھے تو پہلے ہی سے یقین تھا کہ تم اس قسم کے تکلّفات کے قائل نہیں ہو۔ اب دیکھو میں بوڑھا ہو گیا۔ باسٹھ سال کی عمر ہونے کو آئی اور میں اس قسم کا کوئی تکلف نہیں کرتا۔'' (واسلی آئونووچ کو یہ قبول کرنے کی جرأت نہیں پڑی کہ یہ سب کھڑاک انہوں نے ہی پھیلایا تھا۔ ان میں بھی بیوی سے کچھ کم مذہبیت نہیں تھی)

''اور فادر الکسی تم سے ملنے کے بڑے خواہشمند ہیں۔ تم دیکھ ہی لو گے، تم انہیں پسند کرو گے۔ انہیں تاش کھیلنے میں بھی کوئی عذر نہیں ہے اور کبھی کبھی، لیکن یہ بات ہمارے درمیان ہی رہے..... کبھی کبھی وہ پائپ بھی پی لیتے ہیں۔''

''خیر ٹھیک ہے۔ کھانے کے بعد ایک بازی ہو جائے گی۔ ان کی طبیعت صاف کر دوں گا۔''

"ہاہاہا..... دیکھا جائے گا۔ اس کا فیصلہ تو اسی وقت ہوگا۔"

بازاروف نے مخصوص انداز میں زور دیتے ہوئے کہا "ہمیں معلوم ہے آپ بڑے جہاندیدہ ہیں۔"

واسلی آلونووچ کے تمتماتے ہوئے گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔

"یوگین جانے دوناں..... گڑے مردے کیوں اکھیڑتے ہو۔ میں اِن صاحب کے سامنے یہ ماننے پر تیار ہوں کہ جوانی میں مجھ میں اس کی امنگ تھی اور مجھے اس کی سزا بھی بھگتنی پڑی ہے —— بھئی کچھ گرمی ہو رہی ہے۔ ذرا بیٹھ جاؤں۔ میں تم لوگوں کی باتوں میں مخل تو نہیں ہوا ہوں؟"

"نہیں صاب! ہرگز نہیں۔" ارکادی نے جواب دیا۔

واسلی آلونووچ گھاس پر بیٹھ گئے اور ٹھنڈا سا سانس بھرتے ہوئے کہنے لگے "میاں یہ تمہاری جگہ دیکھ کر مجھے اپنی فوجی زندگی یاد آ گئی۔ بس اسی قسم کے مقامات پر ہم پڑاؤ ڈال دیتے تھے اور اسے بھی بہت غنیمت سمجھتے تھے۔" اس نے پھر ٹھنڈا سانس لیا "ہم نے زندگی میں کیا کچھ نہیں دیکھا۔ اب مثلاً تم کہو تو میں تمہیں ایک عجیب وغریب واقعہ سناؤں۔ یہ بسار بیا میں طاعون پھیلنے کا واقعہ ہے۔"

بازاروف نے فوراً ٹوکا "وہی ناں جس کے سلسلے میں تمہیں ولادمیر کراس ملا تھا؟ ہمیں معلوم ہے، معلوم ہے..... اچھا ہاں یہ تو بتائیے کہ وہ کراس آپ نے آج کل لگا کیوں نہیں رکھا ہے؟"

واسلی آلونووچ منمنانے لگے "میں نے تم سے کہا ناں کہ میں اس قسم کے تکلّفات کا قائل نہیں ہوں۔" (اس نے کل شام ہی اپنے کوٹ پر سے سرخ ربن ادھیڑی تھی) اور انہوں نے طاعون کا واقعہ سنانا شروع کر دیا اور انہوں نے یکا یک یوگین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آہستہ سے ارکادی سے کہا "ارے یہ تو سو گیا" اور پھر بڑی شفقت سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "یوگین اُٹھ بیٹھو!" پھر انہوں نے بآواز بلند کہا "چلو بھئی کھانا کھا لیں۔"

فادر الکسی دیکھنے میں اچھے بھلے چاق و چوبند آدمی تھے۔ ان کے موٹے موٹے

بال تھے، جو بڑے اہتمام سے سنوارے گئے تھے۔ ان کے ریشمیں لبادے کے گرد زردوزی کے کام کی ایک پٹی نظر آ رہی تھی۔ آدمی معلوم ہوتے تھے کہ موقعہ شناس اور مرنجان مرنج قسم کے ہیں۔ انہوں نے پہلے خود مصافحہ کے لیے ارکادی اور بازاروف کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ گویا پہلے سے سمجھتے تھے کہ یہ لوگ ان کی دعاؤں کے ایسے متمنی نہیں ہیں اور بغیر کسی تکلف کے بہت کھل کر ملے۔ انہوں نے نہ تو اپنی آن ہاتھ سے جانے دی اور نہ دوسروں کو خفگی کا موقع دیا۔ لاطینی مکتب کے طلبہ کا استقبال انہوں نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے کیا اور جب ان کے بشپ صاحب تشریف لائے تو ادب سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ شراب کے دو گلاس پئے، تیسرے گلاس پر انکار کر دیا۔ ارکادی نے سگار پیش کیا، قبول کر لیا لیکن سلگایا نہیں۔ بس یہ کہہ دیا کہ اسے اپنے ساتھ گھر لے جاؤں گا۔ ان کے سلسلے میں ایک ناخوشگوار بات بس یہی تھی کہ وہ اپنے چہرے پر بھنکتی ہوئی مکھیوں کو پکڑنے کے لیے بار بار بڑے ارادے اور احتیاط سے ہاتھ اٹھاتے تھے اور بعض اوقات انہیں کچل ڈالنے میں کامیاب بھی ہو جاتے تھے۔ وہ سبز میز والی نشست پر بیٹھے اور جچے تلے الفاظ میں اس پر اطمینان کا اظہار کیا۔ کھیل میں انہوں نے بازاروف سے اڑھائی ربل کے کاغذ کے نوٹ جیت لیے۔ ارینا ولاسیونا کے گھر میں چاندی کے سکوں کی تو گنتی کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا..... وہ پہلے کی طرح اب بھی بیٹے کے گھٹنے سے گھٹنا ملائے بیٹھی تھیں (تاش انہوں نے نہیں کھیلے) ان کا رخسار بدستور ان کی ننھی منی مٹھی پر ٹکا ہوا تھا۔ بس کبھی کبھی کوئی نیا شربت پیش کرنے کے لیے انہیں ضرور اٹھنا پڑتا تھا۔ بازاروف کو گلے لگاتے ہوئے وہ کچھ ڈرتی تھیں اور بازاروف نے بھی ان کی ہمت افزائی نہیں کی۔ اس کے علاوہ واسلی آئیوانووچ نے انہیں یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ لونڈے کو زیادہ پریشان نہ کرنا۔ کہنے لگے کہ ''نوجوان اِس قسم کی باتیں پسند نہیں کرتے۔''
(یہ بیان کرنا فضول ہے کہ اس روز کھانے کی کیفیت کیا تھی۔ تموفش خود منہ اندھیرے ٹٹو پر چڑھ کر سرپٹ گائے کا گوشت لینے گیا تھا۔ کارندے صاحب مچھلیاں خریدنے ایک دوسری سمت میں روانہ ہوئے تھے۔ خالی ترکاری کے لیے کسان عورتوں کو نقد بیالیس فاردنگ ادا کیے گئے تھے)۔ لیکن ارینا ولاسیونا کی آنکھیں مستقل طور پر بازاروف پر جمی ہوئی تھیں۔ اُن سے صرف ماماتا اور بھگتی کا جذبہ ہی نہیں ٹپک رہا تھا، بلکہ ان میں ایک حزن کی کیفیت بھی

تھی، جس میں مرعوبیت اور کرید کے نشانات بھی جھلک رہے تھے۔ یوں سمجھئے کہ ایک انکسار آمیز خود ملامتی کی سی صورت پیدا ہو گئی تھی۔

تاہم بازاروف اِس وقت اپنی ماں کی صحیح کیفیت کا تجزیہ کرنے پر مائل نہیں تھا۔ وہ کبھی کبھار ان کی طرف متوجہ ہوتا اور کوئی مختصر سا سوال کر کے چپ ہو جاتا۔ ایک مرتبہ اس نے شگن کے لیے ان کا ہاتھ تھاما تھا۔ ماں نے بڑی متانت سے اپنا ننھا منّا نرم ہاتھ اس کے چوڑے چکلے کھردرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

تھوڑا انتظار کرنے کے بعد وہ پوچھنے لگیں "کچھ بات بنی؟"

اس نے بڑی بے اعتنائی سے ہنس کر جواب دیا "اور شگن بگڑ گیا۔"

فادر الکسی نے اپنی داڑھی کو جنبش دیتے ہوئے شفقت آمیز لہجے میں کہا "بڑے نڈر پن سے کھیلتے ہو حد ہے!"

واسلی آئونووچ نے ایکہ پھینکتے ہوئے ٹکڑا لگایا "نپولین کا اصول، پادری صاحب! نپولین کا اصول یہی تھا۔"

فادر الکسی نے ایکے پر ٹرمپ لگاتے ہوئے کہا "یہ اور بات ہے کہ اس کے چکر میں وہ سینٹ ہلینا کو لد گیا۔"

"انیوشا کشمش کی چائے پیو گے نا؟" ارینا ولاسیونا نے سوال کیا۔

بازاروف اپنے کاندھے مچکا کر رہ گیا۔

دوسرے دن وہ ارکادی سے کہہ رہا تھا "بس یہاں سے کل اڑلوں گا۔ میں تو بور ہو گیا۔ میں کام کرنا چاہتا تھا اور کام یہاں ہو نہیں سکتا۔ میں پھر تمہارے گھر ہی چلوں گا۔ وہاں میرا سارا سامان بھی پڑا ہے۔ تمہارے گھر میں یہ تو ہے کہ آدمی دروازہ بند کر کے بیٹھ سکتا ہے۔ یہاں ہمارے والد بزرگوار کی کیفیت یہ ہے کہ بار بار کہتے ہیں "میرے لکھنے پڑھنے کا کمرہ بس تمہارے سپرد ہے۔ تمہارے کام میں کوئی خلل انداز نہیں ہوگا" اور خود وہ ایک منٹ کے لیے میرے پاس سے نہیں ٹلتے۔ یہی حالت والدہ محترمہ کی ہے۔ دیوار کی پرلی طرف سے مسلسل ان کی سرد آہیں سنائی دیتی رہتی ہیں اور اگر کوئی ان کے پاس جائے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کہا کیا جائے۔"

ارکادی نے جواب دیا ''انہیں اس کا صدمہ بہت ہوگا اور تمہارے والد کو بھی رنج ہوگا۔''

''میں پھران کے پاس آجاؤں گا۔''

''کب؟''

''کب کیا' جب پیٹرسبرگ واپس جانے لگوں گا۔''

''بالخصوص تمہاری والدہ پر مجھے بڑا ترس آتا ہے۔''

''آخر کیوں؟ اس نے رس بھریاں کھلا کھلا کر تمہارا دل موہ لیا ہے یا اور کچھ بات ہے؟''

ارکادی کی نگاہیں جھک گئیں ''یوگین! تم اپنی والدہ کو نہیں سمجھتے۔ وہ نیک اور شریف ہی نہیں' بڑی عقلمند بھی ہیں۔ آج صبح وہ آدھ گھنٹے تک مجھ سے باتیں کرتی رہیں اور ان کی باتیں بے حد معقول اور دلچسپ تھیں۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ پوری گفتگو میں مجھ غریب پر مشق سخن کرتی رہی ہوں گی؟''

''تمہارے علاوہ باتیں اور بھی ہوئیں۔''

''ممکن ہے۔ بہت دیکھتے ہیں جو کم دیکھتے ہیں۔ اگر عورت آدھ گھنٹے ڈھنگ سے باتیں کرسکتی ہے تو یہ اچھی علامت ہے۔ بہرحال میں جارہا ہوں۔''

''لیکن انہیں اس ارادے سے مطلع کرنا کچھ ایسا آسان کام نہیں ہے۔''

''ہاں! یہ ایسا آسان کام تو نہیں ہے۔ آج مجھے شیطان نے ایسا ورغلایا کہ میں نے اپنے باپ کو خوب دق کیا۔ کل انہوں نے اپنے ایک لگاندار کسان کو کوڑوں سے مارا تھا اور بجا مارا تھا۔ ہاں' ہاں ٹھیک مارا تھا۔ تم آنکھیں پھاڑ کے مجھے کیا دیکھ رہے ہو۔ بات یہ ہے کہ وہ نمبری چور ہے اور پھر شرابی۔ میرے باپ کو یہ علم نہیں تھا کہ میں ان حالات سے واقف ہوں۔ وہ غریب بہت سٹپٹایا اور یہ خبر سن کے تو اس کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔ خیر کوئی بات نہیں ہے۔ اسے بھی وہ ہضم کر ہی لے گا۔''

بازاروف نے کہا تھا ''کوئی بات نہیں ہے۔'' لیکن سارا دن گزر گیا اور اس کی یہ ہمت نہ پڑسکی کہ واسلی آئوانووچ کو اپنے ارادے سے مطلع کردے۔ آخر کار جب وہ مطالعہ کے کمرے میں اسے شب بخیر کہہ رہے تھے' تو اس نے جھوٹ موٹ جمائی لی اور کہنے لگا۔

''اوہ.....میں آپ سے کہنا بھولا ہی جا رہا تھا.....فیدوت پر کہلا بھیجئے کہ کل گاڑی جوت دی جائے۔''

واسلی آلونووچ غریب تو سکتے میں آ گئے''تو کل مسٹر کرسانوف جا رہے ہیں؟''

''جی! اور میں اس کے ہمراہ جا رہا ہوں۔''

اب تو واسلی آلونووچ کا سر واقعی گھومنے لگا۔''تم جا رہے ہو؟''

''جی! مجھے جانا ہی پڑے گا۔''

''اچھا.....!!'' بڈھے کے قدم کانپ رہے تھے۔''فیدوت..... ہاں' ہاں.... اچھا...اچھا.....مگر.....مگر...... بات کیا ہے؟''

''میں تھوڑے دن اس کے ساتھ جا کر رہوں گا۔ویسے میں یہاں واپس آؤں گا۔''

''ہوں! ایک تھوڑے دن کے لیے.....بہت خوب!'' واسلی آلونووچ نے اپنا رومال نکالا اور ناک پونچھتے ہوئے اتنا جھکے کہ زمین کو چھوتے چھوتے رہ گئے۔''اچھا.....سارا انتظام ہو جائے گا۔میرا خیال تھا کہ تم ہمارے ساتھ.....کچھ دن اور رہو گے۔تین دن..... تین سال بعد تین دن۔کچھ بہت تھوڑا سا عرصہ ہے۔ہاں آں یوگین' بڑا تھوڑا عرصہ تھا یہ تو۔''

''لیکن میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ میں سیدھا یہیں واپس آؤں گا۔میرا جانا ضروری ہے۔''

''ضروری ہے.....اچھا۔فرض سب پر مقدم ہے۔تو بس گاڑی تیار ملے گی۔ بہت خوب! ویسے ارینا کو اور مجھے اس کا گمان نہیں تھا۔وہ ابھی ابھی ایک ہمسائے سے پھول مانگ کر لائی ہے۔تمہارے لیے کمرہ سجانا چاہتی تھی۔'' (واسلی آلونووچ نے اس کا تو اشارتاً بھی ذکر نہیں کیا کہ وہ روز صبح سویرے تموفش سے مشورہ کرتے ہیں۔وہ اس وقت خالی سلیپر پہنے ہوئے ہوتے ہیں۔اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے وہ ایک روبل کے نوٹ ایک ایک کر کے نکالتے ہیں۔مختلف چیزوں کی خریداری کی ہدایات کرتے ہیں' بالخصوص کھانے پینے کی اچھی اچھی چیزوں کی۔اس سلسلے میں سرخ شراب کا نام خاص طور پر لیا جاتا ہے' جو جہاں تک ان کا اندازہ ہے نوجوان بہت پسند کرتے ہیں)۔''آزادی.....بڑی چیز ہے۔یہ میرا

اصول ہے.....میں تمہیں کسی بات سے روکنا نہیں چاہتا.....نہیں....."

وہ کہتے کہتے رُک گئے اور دروازے کی طرف چلے۔

"باوا جان! واقعی میں پھر آ ؤں گا۔"

لیکن واسلی آ لُونو وچ نے پھر مڑ کر نہیں دیکھا۔انہوں نے بس ہاتھ ہلا کر اشارہ کیا اور باہر چلے گئے۔جب وہ اپنے سونے کے کمرے میں پہنچے تو بڑی بی سو چکی تھیں۔انہوں نے بہت دھیمی آ واز میں اللہ اللہ شروع کر دی' تا کہ کہیں ان کی آ نکھ نہ کھل جائے۔مگر ان کی آ نکھ کھل ہی گئی۔

وہ بول پڑی "کون؟ واسلی آ لُونو وچ تم ہو؟"

"ہاں!"

"اینوشا کے پاس سے آئے ہو؟ اجی تمہیں کچھ خبر بھی ہے۔میرا دل کٹا جا رہا ہے کہ اسے صوفے پر نیند کیسے آئے گی۔میں نے تو انفسوشکا سے کہہ دیا تھا کہ بی بی بڑے میاں کا سفری گدا اور نئے تکیے لگا دیئے۔میں اسے اپنے پروں کا گدا دے دیتی' مگر پھر مجھے یاد آیا کہ اُس ڈوبے کو تو نرم بستر بھاتا ہی نہیں ہے....."

"بڑی بی! چین لو نا ذرا۔مفت میں فکریں مول لیتی پھرتی ہو۔وہ ٹھیک ہے۔ یاالٰہی مجھ پر رحم کیجیو۔میں بڑا گنہگار بندہ ہوں۔" انہوں نے اپنی دھیمی آ واز میں پھر حمد شروع کر دی۔واسلی آ لُونو وچ کو اپنی بڑھیا بیوی پر ترس آ رہا تھا۔وہ اسے یہ بتانا نہیں چاہتے تھے کہ راتوں رات ان پر کیا آفت ٹوٹنے والی ہے۔

بازاروف اور ارکادی دوسرے دن چل کھڑے ہوئے۔صبح سویرے سے سارے گھر پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔انفسوشکا کے ہاتھوں سے ٹرے پھسل پڑی۔فیدکا تک حیران و پریشان تھا اور اس پریشانی میں اس نے اپنے بوٹ اتار پھینکے۔واسلی آ لُونو وچ آج کچھ بہت ہی زیادہ سٹر پٹر کرتے پھر رہے تھے۔یوں انہوں نے اپنی طرف سے ہنس مکھ بننے کی بہت کوشش کی تھی۔وہ زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔بار بار زمین پر پیر پٹختے تھے۔ لیکن ان کے چہرے پر ہونق پن برس رہا تھا اور وہ لگاتار اس کوشش میں تھے کہ بیٹے سے ان کی آ نکھیں چار ہو جائیں۔ارینا ولاسیونا کا دل رو رہا تھا۔وہ غم سے نڈھال تھیں اور اگر ان

کے بڑے میاں صبح ہی صبح پورے دو گھنٹے انہیں ہموار کرنے میں صرف نہ کرتے' تو وہ اپنا آپا دُھن ڈالتیں۔ جب بازاروف نے بار بار یہ وعدہ کیا کہ وہ واپسی میں ایک مہینے سے زیادہ نہیں لگائے گا' تب کہیں جا کر اس نے ان کی آغوش سے نجات پائی اور پھر اس نے گاڑی میں جا کر اپنی نشست سنبھالی۔ جب گھوڑے چل کھڑے ہوئے اور گھنٹی ٹن ٹن بجنے لگی اور پہیے چکر کاٹنے لگے' اور جب گاڑی کو پیچھے سے تکتے رہنا ایک فضول سی بات بن کر رہ گئی اور گرد تھک کر بیٹھنے لگی اور تموفش ہلتا کانپتا اپنی کوٹھڑی میں واپس چلا گیا' جب بڑھے بڑھیا اپنے اس چھوٹے سے گھر میں اکیلے رہ گئے' جواب یکا یک سکڑ گیا تھا اور بہت خستہ دکھائی دینے لگا تھا' تو واسلی آئونووچ سیڑھیوں پر کھڑے ہوئے' چند ایک منٹ اور خلوص قلب سے رومال ہلاتے رہے۔ پھر وہ دھم سے ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور ان کا سر ان کے سینے پر آ ٹکا۔ ''اس نے ہماری کمر توڑ دی۔ اس نے ہمیں چھوڑ دیا۔'' ان کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''ہمیں چھوڑ دیا۔ ہمارے پاس اسے خفقان ہوتا تھا۔ ہائے ری تنہائی' تنہائی۔'' انہوں نے بار بار یہ لفظ دہرایا۔ پھر ارینا ولاسیونا ان کے قریب پہنچیں۔ انہوں نے اپنے مٹیالے بالوں والا سر ان کے مٹیالے سر پر ٹکا دیا اور کہنے لگیں ''داسیا! اس میں کسی کا کیا بس ہے۔ کوکھ سے نکل کر جایا پرایا ہو جاوے ہے۔ وہ تو پنچھی ہے۔ من میں آئی گھونسلے میں آ بیٹھا' من میں آئی اُڑ گیا۔ ہمارا تمہارا کیا ہے۔ ہم تو سانپ کی چھتریاں ہیں' جو پیڑ کی کھوہ میں اگ آوے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے اونگھا کرتے ہیں۔ جگہ سے نہیں ہلتے۔ کسی اور کا آسرا کیوں ٹٹولو ہو۔ اندھے کوڑھی تو ہم ہیں۔ اللہ نے ہماری جوڑی ملائی ہے۔''

واسلی آئونووچ نے چہرے سے ہاتھ ہٹا لیے اور اپنی شریک حیات اپنی ہمراز کو اس شدت سے بازوؤں میں دبوچا کہ شاید کبھی جوانی میں بھی یوں نہ دبوچا ہوگا۔ انہوں نے غم واندوہ کے عالم میں بڑے میاں کو تسلی دی تھی۔

(22)

ہمارے یہ دونوں دوست فیدوت کے اڈے تک چپ چاپ چلتے رہے۔ کبھی

کبھار بے معنی سی ایک ڈیڑھ بات ہوتی اور ختم ہو جاتی۔ بازاروف بھی اپنے آپ سے کچھ ایسا خوش نہیں تھا اور ارکادی تو خیر اس سے ناخوش تھا ہی۔ بلاوجہ بلاسبب کی اس افسردگی نے اسے بھی گھیر رکھا تھا، جس سے صرف کمسن اور نابالغ بچے واقف ہوتے ہیں۔ کوچوان نے اڈے پر پہنچ کر گھوڑے بدلے اور اپنی نشست پر بیٹھ کر پوچھنے لگا "اجی سیدھے کو چلوں یا اُلٹے کو؟"

ارکادی چونک پڑا۔ سیدھے ہاتھ والی سڑک قصبے کو اور وہاں سے اس کے گھر کو جاتی تھی۔ الٹے ہاتھ والی سڑک مادام اودن تسوف کے گھر کو جاتی تھی۔

اس نے بازاروف پر نظر ڈالی۔

"یوگین!" وہ پوچھنے لگا "اُلٹے ہاتھ کو چلیں؟"

بازاروف نے منہ پھیر لیا اور بڑبڑانے لگا۔ "کیا حماقت ہے؟"

"میں جانتا ہوں یہ حماقت ہے، لیکن ہرج کیا ہے؟ یہ پہلا موقع تو ہے نہیں۔"

بازاروف نے اپنی ٹوپی کھینچ کر بھنوؤں تک کر لی۔ پھر آخر اس نے کہہ ہی دیا "جو تمہاری مرضی میں آئے کرو۔"

ارکادی چلّا کر بولا "الٹے ہاتھ کو مڑ چلو۔"

گاڑی کا رُخ نکولسکو کی طرف ہو گیا۔ دونوں دوستوں نے حماقت کا عزم تو کر لیا تھا، لیکن اب انہیں کچھ اور زیادہ چپ لگ گئی اور مزاج مکدر ہو گیا۔

مادام اودن تسوف کے مکان پر جب وہ پہنچے تو سیڑھیوں پر ہی خانساماں سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ دونوں دوستوں کو اس کا احساس تو ہو گیا تھا کہ انہوں نے یہ کچھ اچھا نہیں کیا کہ ایک لہر آئی اور وہ بے سوچے سمجھے اِدھر ہو لیے۔ یہ تو ظاہر تھا کہ اس وقت ان کی آمد کی توقع نہیں تھی۔ ڈرائنگ روم میں وہ بہت دیر بیوقوف سے بنے بیٹھے رہے۔ بالآخر مادام اودن تسوف ان کے پاس آئی۔ اس نے اپنی اسی وضع داری سے ان کی مزاج پرسی کی، لیکن ان کے اتنی جلدی واپس آ جانے پر اسے تعجب ضرور ہو رہا تھا۔ اس کی حرکات وسکنات اور الفاظ کا تکلف یہ بھی غماری کر رہا تھا کہ وہ اس پر کچھ بہت زیادہ خوش نہیں ہے۔ انہوں نے جھٹ سے اعلان کر ڈالا کہ ہم تو چلتے چلتے راستے میں ٹھہر گئے ہیں۔ چار گھنٹے کے اندر اندر ہم یہاں

سے چل پڑیں گے اور قصبے کو جائیں گے۔ اس نے ایک ذرا حیرت کا اظہار کیا۔ پھر کہنے لگی کہ اپنے والد صاحب کی خدمت میں میرا آداب کہیے۔ اس کے بعد اس نے خالہ جان کو بلا بھیجا۔ شہزادی صاحبہ سوئی سوئی سی ہو رہی تھیں اور اس لیے ان کے جھریوں دار پیچ چہرے کے خطوط کچھ اور زیادہ بگڑ گئے تھے۔ کاتیا کے دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں آئی۔ ارکادی کو اس وقت اچانک احساس ہوا کہ وہ کاتیا کی صورت دیکھنے کے لیے زیادہ نہیں تو اتنا ضرور بیتاب ہے جتنا اینا سرگیونا کو دیکھنے کے لیے بیتاب تھے۔ چار گھنٹے اِدھر اُدھر کی بے معنی باتوں میں گزر گئے۔ اینا سرگیونا نے باتیں کیں بھی اور سنیں بھی، مگر اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں آئی۔ البتہ رخصت کے وقت اس کا وہ پرانا دوستانہ انداز انگڑائی لے کر جاگتا نظر آیا تھا۔

وہ کہنے لگی ''مجھ پر ابھی ابھی ایک مراق کا دورہ سا پڑ گیا تھا، لیکن آپ اس کا خیال نہ کریں اور پھر یہاں جلد آئیں۔ میں آپ دونوں سے یہ کہہ رہی ہوں۔''

بازاروف اور ارکادی دونوں نے اس کے جواب میں خاموشی سے جھک کر سلام کیا۔ گاڑی میں جا کر وہ اپنی نشستوں پر جا بیٹھے اور کہیں رُکے بغیر سیدھے میرینو کی طرف چلے۔ دوسرے دن شام کو وہ بخیریت وہاں جا پہنچے۔ پورے سفر میں دونوں میں سے ایک کی زبان پر بھی مادام اودن تسوف کا نام نہ آیا اور بازاروف کی حالت تو یہ تھی کہ اس کے ہونٹ سِل کر رہ گئے تھے۔ سڑک سے ایک طرف کو وہ غصے کے عالم میں گھور کر دیکھے جا رہا تھا۔

میرینو میں ہر شخص انہیں دیکھ کر باغ باغ ہو گیا۔ بیٹے کی مسلسل غیر حاضری کی وجہ سے نکولائی پیٹروچ کو بے کلی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ جب فینشکا خوش خوش اس کے پاس لپکی ہوئی پہنچی اور ان کے آنے کی اسے اطلاع دی تو خوشی کے مارے اس کی چیخ نکل گئی اور ٹانگوں کو نیچے لٹکا کر وہ صوفے پر کودنے لگا۔ ایک تھوڑے سے خوشگوار اضطراب کی کیفیت تو پافل پیٹروچ پر بھی طاری ہو گئی تھی۔ واپس آنے والے آوارہ گردوں سے جب اس نے ہاتھ ملایا تو بڑے مربیانہ انداز میں وہ مسکرایا بھی تھا۔ باتیں ہوئیں۔ سوالات کا سلسلہ چلا۔ سب سے زیادہ باتیں ارکادی نے کیں اور کھانے پر تو اس نے باتوں کا وہ طومار باندھا کہ آدھی رات بیت گئی۔ نکولائی پیٹروچ نے شراب کی وہ بوتلیں منگا ڈالیں، جو حال ہی میں ماسکو

سے منگائی گئی تھیں اور اس افراط سے اس نے پی کہ اس کے رخسار سرخ پڑ گئے اور وہ نیم طفلانہ اور نیم سراسیمگی کے انداز میں ہنستا رہا۔ یہ انبساط کی کیفیت نوکروں تک پر اثر انداز ہوگئی تھی۔ دونیا شایوں بھاگی بھاگی پھر رہی تھی، گویا اس کے سر پر کوئی آسیب سوار ہے۔ بار بار وہ کواڑیں دھاڑ دھاڑ بند کرتی تھی اور پیاتر دن کے تین بجے سے اب تک گتار پر کاسک والز کی مشق کیے جارہا تھا۔ تاروں سے سریلی اور غمناک آواز بلند ہوکر خاموش فضا میں گونجنے لگتی تھی، لیکن ابتدا میں چند خوشگوار آوازیں جو پیدا ہو جایا کرتی ہیں، ان سے قطع نظر اس مہذب ملازم کی کوششوں کا کوئی خاص نتیجہ تو برآمد ہوا نہیں۔ فطرت کی طرف سے اس غریب کو بھی موسیقی کی صلاحیت بس اتنی ہی ودیعت ہوئی تھی، جتنی باقی دنیا کو ودیعت ہوئی ہے۔

لیکن ساتھ میں یہ بھی تھا کہ میرینو کے حالات کچھ ایسے زیادہ خوشگوار نہیں تھے۔ غریب نکولائی پیئر وچ پر برا وقت آ گیا تھا۔ فارم پر روز کوئی آفت کھڑی ہو جاتی تھی۔ کرائے والے مزدور قابو سے باہر ہوئے جارہے تھے۔ بعض یہ تقاضا کررہے تھے کہ ان کی اجرتیں طے کر دی جائیں۔ بعضوں کا مطالبہ تھا کہ اجرتوں میں اضافہ کیا جائے۔ جن مزدوروں کو پیشگی اجرت دے دی گئی تھی، وہ اسے لے کر چمپت ہوگئے۔ گھوڑے بیمار پڑ گئے۔ گھوڑوں کا ساز و سامان کچھ اس انداز سے ٹوٹا پھوٹا گویا وہ جل کر خاک ہوگیا ہے۔ کام میں لاپروائی برتی جانے لگی۔ ماسکو سے جو ایک اناج صاف کرنے کی مشین منگائی گئی تھی، وہ بہت بھاری ہونے کی وجہ سے بیکار ثابت ہوئی۔ دوسری مشین کا پہلے ہی دن ستیاناس ہوگیا۔ فارم کی ایک اندھی بڑھیا ایک جلتی ہوئی بتی اس غرض سے لیے جارہی تھی کہ اپنی گائے کے چھپر میں جا کر دھونی دے دے۔ اس وقت آندھی چل رہی تھی۔ آگ بھڑک اٹھی اور نصف تعداد میں مویشی خانے جل کر خاک ہوگئے۔ یہ درست ہے کہ بڑھیا کا استدلال یہ تھا کہ سارا قصور آقا کا ہے، جس نے نئی طرز کی چیز اور دودھ کی اشیاء تیار کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اوورسیئر نے بھی اچانک ہاتھ پیر ڈال دیئے اور چونکہ یہ دستور ہے کہ جس روسی کو گیہوں کی روٹیاں ملنے لگتی ہیں، اس پر چربی چڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ اس کی بھی توند بڑھنے لگی۔ جب دُور سے نکولائی پیئر وچ آتا دکھائی دیتا تھا، تو وہ قریب سے گزرتے ہوئے

کسی سور پر لاٹھیاں برسانے لگتا یا کسی نیم برہنہ شریر لڑکے کو ڈانٹنے ڈپٹنے لگتا' لیکن باقی وقت میں وہ بیٹھا مزے سے چادر تان کر سوتا تھا۔ جن کسانوں پر لگان لگایا گیا تھا' وہ وقت پر روپیہ ادا نہیں کرتے تھے اور جنگل کی لکڑی چرا چرا کر لے جاتے تھے۔ تقریباً روزانہ کو محافظ کسانوں کے گھوڑوں کو فارم کی گھاس چرتے ہوئے پکڑتے تھے اور کبھی کبھی انہیں زبردستی پکڑ کر بند بھی کر لیتے تھے۔ نکولائی پیئر وچ ان پر مناسب سی رقم کا جرمانہ کر دیتا' لیکن ہوتا ہمیشہ یہ تھا کہ وہ ڈھائی تین دن تک نکولائی پیئر وچ کا گھاس دانہ سونٹرتے اور پھر انہیں ان کے مالکوں کو واپس کر دیا جاتا اور قصہ ختم ہو جاتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کسانوں نے آپس میں لڑنا بھڑنا شروع کر دیا۔ بھائیوں بھائیوں میں جھگڑا ہو جاتا۔ وہ جائداد کی تقسیم کا مطالبہ کرنے لگتے۔ ان کی بیویوں کا ایک گھر میں گزر مشکل ہو جاتا اور آپس کی تُو تُو مَیں مَیں ایکا ایکی اِس انداز سے فتنے کی شکل اختیار کرتی گویا پہلے سے طے تھا کہ جب یہ اشارہ کیا جائے تو جو تم پیزار شروع کر دینا اور فوراً کے فوراً پورا گاؤں بھاگتا دوڑتا ہنڈی خانے کی سیڑھیوں پر پہنچتا اور آقا کے پیروں پڑ کے انصاف کی دہائی دیتا۔ یہ لوگ اکثر نشے میں دھت ہوتے اور ان کے چہروں پر خاک برستی ہوتی۔ پھر مجمع میں افراتفری مچ جاتی' لوگ چیخنے پکارنے لگتے' عورتوں کے رونے دھونے کی باریک آوازیں سنائی دیتیں اور مرد گالم گلوچ پر اتر آتے۔ فریقین کی شکایتیں کسی نہ کسی کو سننی ہی پڑتی تھیں اور وہ اتنا چیختا چلّاتا کہ اس کا گلا پڑ پڑ جاتا اور ساتھ میں اسے برابر یہ احساس رہتا کہ اس کا سا منصفانہ فیصلہ کوئی کر ہی نہیں سکتا..... فصل کی کٹائی کا وقت آیا تو آدمی کم پڑ گئے۔ پڑوس کے ایک ٹٹ پونجیا زمیندار نے بڑی عنایت اور مروّت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ سودا کیا کہ وہ دو روبل فی ایکڑ کمیشن پر اسے کاٹنے والے سپلائی کرے گا۔ اس سودے میں اس نے نکولائی پیئر وچ کے وہ چونا لگایا کہ بے حیائی نے بھی شرم کے پردے میں منہ چھپا لیا۔ اس کی کسان عورتوں نے اتنی اتنی رقمیں مانگیں کہ سننے والوں کے بھی ہوش اڑتے تھے اور اناج ضائع جانے لگا۔ اِدھر تو وہ اناج جمع کرنے سے انکاری تھیں اور اُدھر کونسل آف کارڈینز نے یہ دھمکیاں دینا شروع کر دی تھیں کہ پورا محصول ادا کرو اور مع سود کے......!!

نکولائی پیئر وچ نے کئی مرتبہ بڑی مایوسی کے عالم میں جھنجھلا کر کہا تھا ''میں

عاجز آ گیا ہوں۔ کچھ نہیں کر سکتا۔ میں انہیں خود تو کوڑے مارنے سے رہا۔ رہا پولیس کپتان کو بلانے کا معاملہ' سو! میرے اصول اس کی اجازت نہیں دیتے اور تم اگر کچھ کرو تو سزا کا خوف ہے۔''

پافل پیٹر وچ اس کا جواب یہی دے دیتا ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سکون سے کام کیجیے۔'' لیکن وہ بھی بڑبڑانے لگتا تھا۔ اس کی بھنویں سکڑ جاتیں اور وہ اپنی مونچھوں کو مروڑنے لگتا۔

بازاروف اِن سارے بکھیڑوں سے الگ تھلگ رہا۔ یوں بھی وہ مہمان تھا اور اسے یہ زیب نہیں دیتا تھا کہ دوسروں کے کاموں مین دخل در معقولات کرے۔ میر ینو میں پہنچنے کے دوسرے ہی دن وہ اپنے مینڈکوں اور کیمیائی تجربوں میں لگ گیا اور ایسا لگا کہ کسی دوسری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ اس کے برخلاف ارکادی یہ اپنا فرض سمجھتا تھا کہ باپ کا ہاتھ نہیں بٹا سکتے تو نہ بٹاؤ' لیکن اِتنا تو جتاتے رہو کہ ہم ہاتھ بٹانے پر آمادہ ہیں۔ وہ بڑے صبر و سکون سے باپ کی باتیں سنتا اور ایک مرتبہ تو اس نے کچھ الٹا سیدھا مشورہ بھی دے ڈالا تھا۔ اس مقصد سے نہیں کہ اس پر عمل کیا جائے' بلکہ یہ دکھانے کی غرض سے کہ آپ کے کام میں مجھے بھی دلچسپی ہے۔ فارمنگ کی تفصیلات سے اسے اکتاہٹ نہیں ہوتی تھی' بلکہ وہ تو کھیتی باڑی کے متعلق بیٹھے بیٹھے خواب دیکھا کرتا تھا' لیکن اس مرتبہ اس کے دماغ میں دوسرے ہی خیالات چکر لگا رہے تھے۔ خود ارکادی کو اس پر تعجب تھا کہ وہ ہر وقت نکولسکو کے تصور میں کیوں کھویا رہتا ہے۔ پچھلے دنوں اگر کوئی اس سے یہ کہہ بیٹھتا کہ جس گھر میں بازاروف ہو' وہاں رہ کر تمہیں خفقان بھی ہو سکتا ہے' تو وہ جواب میں کاندھے مچکا دیتا....اور گھر بھی کون سا اس کے باپ کا' لیکن اسے واقعی خفقان ہو رہا تھا اور وہ وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس نے کوشش کی کہ خوب چہل قدمی کی جائے' اتنی کہ وہ تھک کر چُور ہو جائے' لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ نکلا۔ ایک روز باپ سے باتوں باتوں میں اسے پتہ چلا کہ نکولائی پیٹر وچ کے پاس چند دلچسپ خط ہیں' جو مادام اودن تسوف کی ماں نے اس کی بیوی کو لکھے تھے۔ اس نے باپ کی تلی اکھیڑ دی اور خط لے کے چھوڑے۔ نکولائی پیٹر وچ کو ان خطوں کے لیے بیس درازوں اور بکسوں کو ٹٹولنا پڑا۔ ان تڑے مڑے خطوں پر قبضہ کرنے کے بعد

ارکادی نے اطمینان کا سانس لیا۔ گویا اس نے اُس منزل کی جھلک دیکھ پائی ہے، جہاں اسے پہنچنا ہے۔ وہ چپکے چپکے بار بار کہے جا رہا تھا ''آپ دونوں ہی سے میرا خطاب ہے''..... یہ فقرہ خود مادام نے بھی تو کہا تھا ''جو ہو سو ہو میں جاؤں گا، جاؤں گا''، لیکن اسے وہ آخری ملاقات وہ سرد مہری کا استقبال یاد آ گیا اور اس کی اس سابقہ بدحواسی اور کم ہمتی نے پھر اس پر غلبہ پالیا، لیکن آخر جوانی کے خون نے جوش کھایا اور اس چھپی ہوئی خواہش نے زور باندھا کہ چلو چل کر قسمت آزمائیں اور بے منت غیرا کیلے میں پہنچ کر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھائیں۔ ابھی میر ینو واپس آئے دس دن بھی نہ ہوئے تھے کہ اس نے یہ ڈھونگ رچایا کہ میں سنڈے سکولوں کا کام دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ کہہ گاڑی میں سوار ہو قصبے کو اڑ لیا اور وہاں سے نکولسکو کا رُخ کیا۔ کوچوان کے پیچھے اس نے مستقل طور پر تڑیائی لگا رکھی تھی اور وہ یوں اڑا چلا جا رہا تھا جیسے کوئی نوجوان سپہ سالار میدانِ جنگ کی طرف جاتا ہے۔ اس کی طبیعت شگفتہ بھی تھی اور وہ ڈر بھی رہا تھا اور بے صبری سے اس کی جان بھی نکلی جا رہی تھی۔ وہ اپنے آپ سے کہے جا رہا تھا ''گر کی بات یہ ہے کہ ـــــ آدمی کو سوچنا نہیں چاہیے۔'' کوچوان بھی کوئی جیالا جوان تھا۔ ہر ہوٹل کے سامنے وہ باگ کھینچتا اور کہتا ''پی لوں جی یا نہیں پیوں؟'' لیکن پی لینے کے بعد وہ گھوڑوں کو اتنا بھگاتا، اتنا بھگاتا کہ ساری کسر پوری ہو جاتی۔ آخر اس مشہور و معروف مکان کے سطوت وشان والے کنگرے نظر آئے۔ ارکادی کے دماغ میں ایک خیال بجلی کی طرح دوڑا ''اب کیا کروں؟ اب تو واپسی کی بھی گنجائش نہیں رہی۔'' تینوں گھوڑے قدم سے قدم اور کنوتی سے کنوتی ملائے سرپٹ اڑے جا رہے تھے۔ کوچوان سیٹی بجاتا اور چلاتا تھا ''ڈرچ بیٹا ڈرچ'' اور پھر ٹاپوں اور پہیوں کی ضربوں سے پل کانپ اٹھا اور پھر یوں معلوم ہونے لگا کہ صنوبر کی لکڑی کا پھاٹک اس کے قدم لینے دوڑا چلا آ رہا ہے.... سبز درختوں کے پیچھے سے ایک عورت کے گلابی لباس کی جھلک دکھائی دی۔ ایک چھتری کی باریک پٹی کی اوٹ سے ایک کامنی سی مورت نے جھانک کر دیکھا..... اس نے کاتیا کو پہچان لیا اور کاتیا اسے پہچان گئی۔ ارکادی نے کوچوان سے کہا گاڑی روکو۔ گاڑی سے لپک کر وہ اس کے پاس پہنچا ''اچھا تم ہو!'' وہ لہک کر بولی اور رفتہ رفتہ اس کے پورے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ ''چلو باجی کے پاس چلیں، وہ یہیں باغ میں ہیں۔ آپ کو دیکھیں گی تو باغ

باغ ہو جائیں گی۔"

کاتیا اسے اپنے ساتھ لے باغ کی طرف چلی۔ اس نے کاتیا سے ملاقات کو ایک نیک شگون سمجھا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ ایسا خوش ہوا گویا وہ اس کی عزیز رشتہ دار ہے۔ ہر بات خوب سے خوب تر ہو رہی تھی۔ نہ تو خانساماں کے قدم لینے پڑے، نہ رسمی اطلاع کا جھمیلا باقی رہا۔ ایک روش کے موڑ پر اس نے اینا سرگیونا کو دیکھ پایا۔ اس کی طرف اس کی پشت تھی۔ قدموں کی آہٹ سن کر وہ آہستہ سے مڑی۔

ارکادی پھر سٹپٹا گیا، لیکن جب اس نے اس کے الفاظ سنے تو اس کا دل ٹھکانے آیا۔ اس نے اپنی متین پیار بھری آواز میں کہا "بھگوڑے میاں واپس آ گئے۔ بہت اچھا ہوا۔" وہ مسکرا رہی تھی اور دھوپ اور آندھی سے آنکھوں کو بچانے کی کوشش میں اس کے تیور کچھ بگڑ بھی رہے تھے۔ "کاتیا یہ تمہیں کہاں مل گئے؟"

وہ کہنے لگا "اینا سرگیونا میں آپ کے لیے ایسی چیز لے کر آیا ہوں کہ آپ کو اس کا سان گمان بھی نہ ہوگا۔"

"تم اپنے آپ کو لے کر آئے ہو، یہ سب سے اچھی چیز ہے۔"

(23)

ارکادی کے کمرے سے رخصت ہوتے وقت بازاروف نے جو فقرے کہے تھے، ان میں بڑی طنزیہ قسم کی ہمدردی کا اظہار ہوا تھا۔ اس نے ارکادی کو اشاروں اشاروں میں یہ جتا دیا تھا کہ تمہارے سفر کا جو اصل مقصد تھا، اس کے بارے میں، مَیں نے مطلق دھوکا نہیں کھایا ہے۔ اس کے بعد بازاروف نے دروازہ بند کر لیا اور بالکل اکیلا رہ گیا۔ کام کا اس پر جنون سوار ہو گیا تھا۔ اب تو پافل پیئر وچ سے بھی اس کی چونچیں نہیں ہوتی تھیں، بالخصوص اس وجہ سے کہ پافل اس کی موجودگی میں اب غیر معمولی حد تک رئیسانہ ٹھسّے سے کام لیتا تھا اور اپنے خیالات کا اظہار الفاظ میں نہیں، بلکہ غیر ملفوظ آوازوں میں کرتا تھا۔ ہاں ایک موقع پر ضرور وہ حضرت انکار پسند سے الجھ پڑا تھا۔ موضوع صوبہ بالٹک کے امراء کا تھا، جس پر اس

زمانے میں بڑی گرما گرم بحثیں ہو رہی تھیں، لیکن وہ ایکا ایکی خود بخود رُک گیا اور خشک سا منہ بنا کر بڑی خوش اخلاقی سے بولا ''خیر! ہم ایک دوسرے کی بات سمجھ نہیں سکتے۔ کم از کم اِس خاکسار کو آپ کے نقطۂ نظر کے سمجھنے کا شرف حاصل نہیں ہے۔''

بازاروف تنک کر بولا ''میرے خیال میں بات یہ نہیں ہے۔ آدمی ہر بات سمجھ سکتا ہے۔۔۔۔ ایتھر کی لہروں میں لرزش کیسے پیدا ہوتی ہے اور سورج میں کیا ہو رہا ہے، لیکن یہ کہ کوئی دوسرا شخص اس سے مختلف انداز میں سانس لیتا ہے، یہ بات واقعی اس کی سمجھ سے باہر ہے۔''

''جی یہ کوئی لطیفہ ہے؟'' پافل پیئر وچ نے سوالیہ انداز میں یہ جملہ کہا اور وہاں سے چل دیا۔

لیکن بعض اوقات وہ اجازت لے کر بازاروف کے تجربات دیکھنے پہنچ جاتا تھا اور ایک مرتبہ تو وہ اپنے بہترین صابن سے دھلے ہوئے اور خوشبوؤں میں بسے ہوئے چہرے کو خردبین کے بالکل قریب لے گیا تھا اور یہ دیکھنے لگا تھا کہ انفوزوریا سبز نقطے کو کیسے نگلتا ہے۔ انفوزوریا کے گلے میں دو پتلی پتلی بہت تیز سی زبانیں نظر آ رہی تھیں، جن سے وہ اسے نگلنے میں مصروف تھا۔ نکولائی پیئر وچ کے چکر وہاں کچھ زیادہ لگتے تھے۔ جیسا کہ اس نے خود کہا تھا کہ اگر فارم کی پریشانیوں سے اسے فراغت ہوتی تو وہ وہاں 'مطالعہ' کی غرض سے روز آیا کرتا۔ اس نے بازاروف کی سائنٹفک تحقیقات کے کاموں میں رخنہ کبھی نہیں ڈالا۔ آیا، کمرے کے کسی کونے میں بیٹھ گیا اور یکسوئی سے دیکھتا رہا۔ کبھی کبھار ہمت کر کے وہ کوئی ٹھکانے کا سوال بھی کر ڈالتا تھا۔ سہ پہر اور رات کے کھانے کے درمیانی وقت میں وہ علم طبیعات یا علم طبقات الارض یا کیمسٹری کا ذکر نکال بیٹھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سیاست کی تو خیر بات ہی الگ ہے، اگر زراعت پر بھی بحث نکلی تو خواہ مخواہ میں چخ ہو جائے گی یا کم از کم آپس میں بدمزگی ضرور ہو جائے گی۔ نکولائی پیئر وچ نے قیافہ سے یہ بھی جان لیا تھا کہ اس کے بھائی کو بازاروف سے جو کد ہے، وہ معمولی نہیں ہے۔ منجملہ اور باتوں کے ایک غیر اہم سے واقعہ سے بھی اس کی قیافہ شناسی کی تصدیق ہو گئی تھی۔ اڑوس پڑوس کے مقامات پر ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی۔ خود میرینو کے دو آدمی اس کی نذر ہو گئے۔ رات کو کیا ہوا کہ پافل

میئر وچ کی حالت دگرگوں ہوگئی اور ہیضے کے آثار نظر آنے لگے۔ صبح تک وہ درد سے تڑپتا رہا، لیکن بازاروف کا علاج گوارا نہ کیا۔ جب دوسرے دن ملاقات ہوئی تو بازاروف پوچھنے لگا ''آپ نے مجھے کیوں نہیں بلالیا؟''

بازاروف کا چہرہ اب تک پیلا ہلدی پڑا تھا، لیکن شیو اور کنگھی پٹی کا اہتمام بدستور قائم تھا۔ اس نے جواب دیا ''مجھے یاد پڑتا ہے کہ آپ نے خود ہی یہ کہا تھا کہ طب کا میں قائل نہیں ہوں۔''

یوں دن گزرتے گئے۔ بازاروف اسی شدت اور تندہی کے ساتھ کام کیے گیا... اور نکولائی پیئر وچ کے گھر میں ایک مخلوق ایسی بھی تھی، جس کے سامنے اس نے اپنا دل کھول کر تو کبھی نہیں رکھا، لیکن اس سے باتیں کرنے میں اسے لطف ضرور حاصل ہوتا تھا.... یہ مخلوق فینشکا تھی۔

اس سے زیادہ تر صبح سویرے باغ میں یا فارم یارڈ میں ملاقات ہوا کرتی تھی۔ وہ اس سے ملنے اس کے کمرے پر کبھی نہیں گیا اور وہ اس کے کمرے کے دروازے پر صرف ایک مرتبہ یہ پوچھنے آئی تھی کہ وہ میٹیا کو نہلائے یا نہ نہلائے؟ صرف یہی نہیں کہ وہ اس پر اعتبار کرتی تھی، اس سے خوفزدہ نہیں تھی، بلکہ وہ اس کے ساتھ اتنی بے تکلفی اور آزادہ روی برتتی تھی، جو اس نے کبھی نکولائی پیئر وچ کے ساتھ بھی نہیں برتی تھی۔ یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ یہ صورت کیونکر پیدا ہوئی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے غیر شعوری طور پر اس کا احساس تھا کہ بازاروف میں ہر طرح کے تکلف وشائستگی کا، اس فوقیت و برتری کا جو اپنی طرف مائل بھی کرتی ہے اور جو مرعوب بھی کرتی ہے، اس میں فقدان ہے۔ اس کی نظر میں وہ ایک لائق ڈاکٹر بھی تھا اور ایک سیدھا سادا آدمی بھی۔ اس کی موجودگی میں وہ بغیر کسی تکلف کے اپنے بچے کی دیکھ بھال کرتی رہتی تھی اور ایک مرتبہ جب اچانک اسے چکر آ گیا تھا اور دردِ سر کا دورہ پڑا تھا، تو اس نے بازاروف کے ہاتھ سے چمچے میں دوائی لے کر اس کے حلق میں ڈالی تھی۔ ہاں نکولائی پیئر وچ کے سامنے وہ اس سے دُور دُور رہتی تھی۔ اس کے اِس طرز عمل میں کسی قسم کے مکروفریب کو دخل نہیں تھا۔ اس کی وجہ آداب سمجھ لیجیے۔ پافل پیئر وچ سے وہ اب کچھ اور زیادہ خوفزدہ رہنے لگی تھی۔ چند دنوں سے اس نے اس کی نقل وحرکت پر نظر رکھنا

شروع کر دی تھی۔ وہ ایکا ایکی آن وارد ہوتا۔ بس یوں معلوم ہوتا کہ ابھی اس کے پیچھے زمین شق ہو گئی تھی اور وہ اچھل کر اس میں سے نکل آیا ہے۔ کیفیت یہ ہوتی تھی کہ انگریزی سوٹ ڈاٹے ہوئے ہے، ہاتھ جیب میں ٹھنسے ہیں، خشک سپاٹ چہرہ اور کچھ چوکسی کے سے انداز۔ فینشکا دونیاشا سے شکایت کرتے ہوئے کہا کرتی تھی ''بس یوں لگے ہے جیسے کسی نے ٹھنڈے پانی کی بالٹی الٹ دی ہو۔'' اور دونیاشا جواب میں ٹھنڈا سا سانس بھرتی اور کسی دوسرے سنگدل شخص کے تصور میں گم ہو جاتی۔ بازاروف کو اس واقعہ کا سان وگمان بھی نہیں تھا، لیکن وہ اس کے دل کی نگری کا سنگدل ظالم راجہ بن چکا تھا۔

فینشکا تو بازاروف سے مانوس تھی ہی، وہ بھی اس سے اُنس رکھتا تھا۔ جب وہ اس سے بات کرتا تھا تو اس کے چہرے کی کیفیت ادبدا کر بدل جایا کرتی تھی۔ اس کا چہرہ چمک اٹھتا، اس کی وہ سرد مہری، جو اس کی عادت ثانیہ بن گئی تھی، زائل ہو جاتی اور وہ ہنس ہنس کر اس سے باتیں کرنے لگتا۔ فینشکا روز بروز خوبصورت ہوتی جا رہی تھی۔ جوان عورتوں کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ موسم بہار کے گلاب کی طرح کھل اٹھتی ہیں، گدرانے لگتی ہیں۔ فینشکا کی زندگی میں یہ وقت آ پہنچا تھا۔ ہلکے پھلکے سفید لباس میں اس کا رنگ کچھ زیادہ صبیح اور جسم کچھ زیادہ چھریرا نظر آنے لگا تھا۔ اس کی تازگی سورج کی مرہون منت تو نہیں تھی، لیکن تپش سے وہ اپنے آپ کو بچا کر کہاں لے جاتی۔ اس تپش نے اس کے رخساروں اور اس کے کانوں کے لوؤں پر سرخی کی ہلکی سی لہر دوڑا دی تھی۔ اس کا پورا جسم ایک نرم غنود آمیز کیفیت میں شرابور تھا اور اس کی خوبصورت آنکھوں میں ایک خواب آگیں اضمحلال جھلکنے لگا تھا۔ کام تو اب اس سے بالکل ہوتا ہی نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ خود بخود اپنے دامن پر جا پڑتے تھے۔ پلنگ سے وہ اب قدم کہاں اتارتی تھی۔ ٹھنڈے ٹھنڈے سانس لیتی تھی اور مضحکہ خیز قسم کی بیچارگی کے ساتھ اپنا رونا روتی رہتی تھی۔

نکولائی پیئر وچ نے اس سے کہا ''تم جلدی جلدی غسل کیا کرو'' اس نے ایک بڑا سا غسلخانہ تیار کرایا تھا، جس کے ایک حوض پر سائبان بھی تھا اور جس کے آثار ابھی باقی تھے۔

''مگر نکولائی پیئر وچ یہ بھی تو دیکھو جب تک آدمی حوض میں پہنچے اس وقت تک تو

اس کا کچومر نکل جائے گا اور واپس آتے آتے پھر کچومر نکل جاتا ہے۔ آپ یہ تو سوچتے نہیں کہ باغ میں سائبان نہیں ہے۔"

نکولائی پیئر وچ نے پیشانی کو رگڑتے ہوئے کہا "ہاں ہاں یہ سچ ہے۔ وہاں کوئی سائبان نہیں ہے۔"

ایک روز صبح سات بجے بازاروف ٹہل کر واپس آ رہا تھا۔ کنج میں اس کی فینشکا سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ کنج میں بہت دنوں سے پھول آ رہے تھے، لیکن وہ ابھی تک ہرا بھرا اور گنجان تھا۔ وہ باغ کی نشست پر بیٹھی تھی اور حسب دستور ایک سفید رومال اپنے سر پر ڈال رکھا تھا۔ اس کے پاس ہی سرخ و سفید پھولوں کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔ یہ پھول ابھی تک شبنم کی تری سے شرابور تھے۔ بازاروف نے اسے صبح بخیر کہا۔

"او یوگین وسل یوچ" اور اس نے رومال کا ایک کنارہ اٹھا کر اس کی اوٹ سے اُسے دیکھا اور اِس چکر میں اس کا بازو کہنی تک برہنہ ہو گیا۔

بازاروف اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہنے لگا "کیا کر رہی ہیں آپ یہاں؟ گجرا پرو رہی ہیں ناں؟"

"جی ناشتے کے وقت کے لیے۔ نکولائی پیئر وچ کو گجرے بہت پسند ہیں۔"

"مگر ناشتے میں تو ابھی خاصی دیر ہے۔ پھولوں کا تو آپ نے ڈھیر لگا رکھا ہے۔"

"میں نے ابھی سے توڑ لیے ہیں۔ اس وقت بڑی گرمی ہو جاتی ہے۔ باہر قدم نہیں رکھا جاتا۔ اس وقت ذرا اوسان بجا ہوتے ہیں۔ میں تو گرمی کے مارے ادھ مری ہوئی جا رہی ہوں۔ مجھے یہ ہول کھائی جا رہی ہے کہ میں چارپائی پر نہ پڑ جاؤں۔"

"یہ اچھا وہم ہے۔ لائیے آپ کی نبض دیکھوں!" بازاروف نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے اس کی باقاعدگی سے چلتی ہوئی نبض محسوس تو ضرور کی، لیکن اس کی دھڑکنیں گننی اس نے شروع نہیں کی تھیں۔ اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے وہ کہنے لگا "آپ کی عمر سو سال ہو گی۔"

وہ چونک کر بولی "ائے ہئے! خدا نہ کرے!!"

"کیوں؟ آپ طویل عمر نہیں چاہتیں؟"

''ہمارے سوسال! ہمارے پڑوس میں ایک بڑھیا رہتی تھی۔ وہ پچاسی سال کی تھی۔ غریب کا برا حال تھا۔ گندگی کی پوٹ۔ ہر وقت کھوں کھاں کرتی تھی۔ کانوں سے بہری، کمر کمان، بیچاری کو اپنا آپا بھاری تھا۔ ایسا جینا تو اجیرن ہو جاوے ہے۔''

''تو جوانی اچھی چیز ہے؟''

''تو کیا اچھی نہیں ہے؟''

''مگر کیوں اچھی ہے؟ مجھے بتائیے ناں؟''

''اس میں پوچھ گچھ کی کیا بات ہے؟ اب میں ہوں، جوان ہوں، ہر کام کر سکتی ہوں۔ چلی جاؤں، آ جاؤں، کوئی چیز لے جاؤں، کسی سے کچھ مانگنے تانگنے کی ضرورت نہیں..... بھلا اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟''

''مگر میرے لیے تو ایک ہی بات ہے۔ میں جوان ہوں یا بوڑھا ہو جاؤں۔''

''یہ آپ کیسے کہتے ہیں؟ ایک بات کیسے ہو گئی؟ یہ تو ممکن ہی نہیں۔''

''اچھا فیدوسیہ نکولا دنا آپ خود دیکھیں ناں۔ میری جوانی میرے لیے کس کام کی ہے۔ میں اکیلا پڑا رہتا ہوں..... غریب اکیلی جان.....''

''اس کا دارومدار تو آپ پر ہے۔''

''مجھ پر اس کا دارومدار بالکل نہیں ہے۔ کسی کو مجھ پر ترس کھانا چاہیے۔''

فینشکا نے نظر بھر کر اسے دیکھا، مگر کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر بعد بولی۔

''آپ کے پاس یہ کون سی کتاب ہے؟''

''یہ؟ یہ سائنس کی کتاب ہے۔ بہت مشکل ہے۔''

''آپ ابھی تک پڑھ ہی رہے ہیں؟ آپ کا اس سے جی نہیں گھبراتا اور آپ تو پہلے ہی سب کچھ جانتے ہیں۔''

''سب کچھ نہیں۔ آپ ذرا تھوڑا سا پڑھ کے دیکھیں۔''

''اجی! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ یہ کیا اول پٹال لکھا ہے۔ اس میں روسی لکھی ہے؟''

فینشکا نے وہ بھاری جلد والی کتاب اپنے ہاتھوں میں لے لی تھی۔ ''بڑی بھاری ہے۔''

''ہاں،اس میں روسی لکھی ہے۔''

''پر میرے لیے تو ایک ہی بات ہے۔ میں کیا سمجھوں۔''

''مگر میں نے آپ کو سمجھنے کے لیے تھوڑا ہی دی ہے۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ آپ پڑھیں اور میں آپ کو دیکھوں۔ جب آپ پڑھتی ہیں تو آپ کا ننھا منا نتھنا بڑی خوبصورتی سے لرزنے لگتا ہے۔''

فینشکا نے ایک مضمون کو دھیمی آواز میں ہجے کر کر کے پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ فقرہ سن کر وہ ہنس پڑی اور کتاب اٹھا کر پھینک دی......وہ نشست سے پھسل کر زمین پر جا پڑی۔

بازاروف بولا ''آپ کا ہنسنا بھی مجھے بہت پسند ہے۔''

''آپ بڑے وہ ہیں۔''

''آپ کا باتیں کرنا بھی مجھے پسند ہے۔ بس یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چھوٹا سا چشمہ بہہ رہا ہے۔''

فینشکا نے اپنا چہرہ ایک طرف ہٹا لیا۔ انگلیوں سے پھول اٹھاتے ہوئے وہ بولی ''آپ بڑی ویسی باتیں کرتے ہیں اور آپ بھلا میری باتیں کیوں سننے لگے ہیں؟ آپ نے بڑی بڑی دانا بینا عورتوں سے باتیں کی ہیں؟'

''فیدوسیا نکولا دنا آپ یقین کریں دنیا کی ساری دانا بینا عورتیں آپ کی کانی انگلی کے برابر بھی نہیں ہیں۔''

فینشکا اپنے ہاتھ باندھتے ہوئے منمنانے لگی ''لو اور سنو۔ یہ ایک اور شگوفہ چھوڑا۔''

بازاروف نے زمین سے کتاب اٹھا لی ''یہ ڈاکٹری کی کتاب ہے۔ اسے آپ نے کیوں پھینکا ہے؟''

''ڈاکٹری کی؟'' فینشکا کا رُخ پھر اس کی طرف ہو گیا ''آپ کو معلوم ہے جب سے آپ نے مجھے وہ دوائی کے قطرے دیئے تھے، یاد ہے ناں آپ کو اس وقت سے میتیا خوب آرام سے سوتا ہے۔ اللہ قسم میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں۔

مولا قسم آپ بڑے اچھے ہیں۔''

بازاروف نے مسکرا کر جواب دیا ''لیکن آپ کو ڈاکٹروں کی فیس بھی ادا کرنی چاہیے۔ آپ تو خود جانتی ہیں کہ یہ ڈاکٹر لوگ بڑے لالچی ہوتے ہیں۔''

فینشکا نے نگاہیں اٹھا کر بازاروف کو دیکھا۔ اس کے چہرے کے بالائی حصے پر جو سفیدی مائل عکس پڑ رہا تھا' اس کے اثر سے اس کی آنکھیں کچھ اور زیادہ سیاہ نظر آنے لگی تھیں۔ وہ کچھ سمجھ نہیں سکی کہ بازاروف مذاق کر رہا ہے یا سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہا ہے۔

''ہمیں تو بڑی خوشی ہوگی کہ..... میں نکولائی پیئر وچ سے کہوں گی.....''

بازاروف ٹوک کر بولا ''خوب! آپ سمجھتی ہیں کہ میں روپیہ چاہتا ہوں۔ نہیں میں آپ سے روپیہ نہیں لوں گا۔''

''تو پھر کیا لیں گے؟'' فینشکا نے سوال کیا۔

''کیا لیں گے؟'' بازاروف نے اس کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا ''سوچئے!''

''میں کیا سوچوں؟''

''اچھا میں بتاتا ہوں۔ میں..... ان میں سے ایک پھول دے دیجیے۔''

فینشکا پھر ہنس پڑی' بلکہ بازاروف کی درخواست اسے اتنی دلچسپ نظر آئی کہ اس نے ہنسنے پر ہی قناعت نہیں کی' بلکہ تالی بھی بجانے لگی۔ وہ ہنس رہی تھی اور تعریف سے کچھ پھول بھی گئی تھی۔ بازاروف ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔

اس کا پھر ذرا دم میں دم آیا اور بولی ''ضرور لیجیے!'' اور جھک کر اس نے پھول چننے شروع کر دیئے۔ ''کون سا پھول لیں گے آپ ـــــ سرخ یا سفید؟''

''سرخ اور زیادہ بڑا نہیں ہونا چاہیے۔''

وہ پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی ''یہ لیجیے!'' لیکن یہ کہتے کہتے اس نے یکا یک اپنا پھیلا ہوا ہاتھ کھینچ لیا اور ہونٹ چباتے ہوئے وہ کنج کے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔

''کیا بات ہے؟'' بازاروف پوچھنے لگا ''نکولائی پیئر وچ؟''

''نہیں..... مسٹر کرسانوف تو کھیت پر گئے ہیں..... اس کے علاوہ میں ان سے تو

کچھ ایسی ڈرتی بھی نہیں ہوں..... ہاں پافل پیئر وچ..... میں نے سمجھا....''

''کیا سمجھا؟''

''میں نے سمجھا وہ آ رہے ہیں۔ نہیں..... کوئی بھی نہیں تھا..... لیجیے!'' فینشکا نے بازاروف کو گلاب کا پھول پیش کیا۔

''پافل پیئر وچ سے آپ کیوں ڈرتی ہیں؟''

''وہ مجھے ہر وقت گھورتے جو رہتے ہیں اور مجھے کیا یہ خبر نہیں ہے کہ آپ ان سے خار کھاتے ہیں۔ یاد ہے ناں آپ کو' آپ کی ان سے ہر وقت تُو تُو مَیں مَیں رہتی تھی۔ یہ مجھے کیا پتہ کہ تُو تُو مَیں مَیں کس بات پر ہوتی تھی' مگر ہاں اتنا پتہ ہے کہ آپ ان کو یوں پٹخنیاں دیتے تھے۔'' فینشکا نے ہاتھوں سے اشارے کر کر کے بتایا کہ بازاروف پافل پیئر وچ کو کیسے پٹخنیاں دیتا ہے۔

بازاروف مسکرانے لگا ''لیکن اگر انہوں نے مجھے پیٹا تو آپ میرا ساتھ دیں گی؟''

''میں کیسے ساتھ دے سکتی ہوں؟ مگر نہیں جی آپ سے کون جیت سکتا ہے؟''

''واقعی آپ کا یہ خیال ہے؟ لیکن ایک شخص ایسا ہے جو اگر چاہے تو مجھے ہرا سکتا ہے۔''

''کون شخص؟''

''آپ اسے نہیں جانتیں؟ قسم کھائیے کہ نہیں جانتیں؟ واہ کیا خوشبو ہے۔ یہ گلاب جو آپ نے دیا ہے غضب کی خوشبو ہے اس میں۔''

فینشکا کی کامنی سی گردن آگے بڑھی اور اس کا چہرہ پھول پر جھک گیا..... رومال سر سے ڈھلک کر اس کے شانوں پر آ ٹکا۔ کالے کالے چمکدار اور اِک ذرا گھنگھریالے بالوں کا نرم جوڑا نظر آنے لگا۔

بازاروف بولا ''ٹھہریئے! ذرا میں آپ کے ساتھ ساتھ اسے سونگھنا چاہتا ہوں۔''

بازاروف یہ کہتے کہتے جھکا اور اس کے ادھ کھلے ہونٹوں کا خوب بھینچ کر ایک بوسہ لے لیا۔

وہ ہڑبڑا گئی۔ اس کے سینے پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے دھکا دیا' مگر یہ دھکا کچھ بڑی نقاہت کی کیفیت کی غمازی کرتا تھا اور چنانچہ اس نے سنبھل کر اپنے ہونٹ پھر

اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔

ببول کی جھاڑیوں کے پیچھے سے خشک سی آواز میں کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ فینشکا آن کی آن میں سرک کر نشست کے دوسرے کونے پر جا پہنچی۔ پافل پیئر وچ کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس نے اِک ذرا جھک کر سلام کیا اور کچھ پُرملال کینہ پرور انداز میں یہ کہتا ہوا واپس چلا گیا "آپ یہاں ہیں۔" فینشکا نے جھٹ پٹ اپنے گلاب کے پھول سمیٹے اور کنج سے چل دی۔ چلتے چلتے اس نے دھیرے سے ایک فقرہ کہا "یوگین وسل یوچ! آپ نے برا کیا۔" اس کی اس سرگوشی میں بڑی پُرخلوص قسم کی ملامت کا احساس جھلک رہا تھا۔

بازاروف کو اسی قسم کا ایک تازہ واقعہ یاد آ گیا۔ وہ محجوب بھی ہوا اور دل تنگ بھی، لیکن پھر اُس نے اپنا سر جھٹکا اور طنزیہ انداز میں اپنے آپ کو اس بات پر شاباشی دی کہ اس نے رنگیلے لوتھاریو کا سا کام کیا ہے اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

پافل پیئر وچ باغ سے باہر نکل گیا اور جان جان کر گھاس میں چلنے لگا۔ خاصی دیر تک وہ وہاں رہا اور جب وہ ناشتے پر پہنچا، تو نکولائی پیئر وچ بہت فکرمند ہو کر اس سے پوچھنے لگا کہ اس کی طبیعت تو اچھی ہے۔ اس کا چہرہ بڑا ملول نظر آ رہا تھا۔

پافل پیئر وچ نے شگفتہ مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا "آپ کو پتہ ہے ناں مجھے کبھی کبھی جگر کی تکلیف ہو جایا کرتی ہے۔"

(24)

دو گھنٹے بعد اس نے بازاروف کے دروازے پر دستک دی۔

"آپ کے علمی مشاغل میں دخل انداز ہونے کی معافی چاہتا ہوں۔" کھڑکی کے قریب وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ اس نے اپنی خوبصورت چھڑی پر ٹیک لیے جس کی موٹھ ہاتھی دانت کی تھی (بالعموم وہ بغیر چھڑی کے ہی چلتا تھا)۔ "لیکن میں مجبور ہوں کہ آپ سے پانچ منٹ کا وقت مانگوں..... زیادہ نہیں۔"

"میرا سارا وقت آپ کی نذر ہے۔" بازاروف نے جواب دیا۔ دراصل جس

وقت پافل پیئر وچ نے دہلیز پر قدم رکھا تھا' اسی وقت بازاروف کے چہرے کی کیفیت بڑی تیزی سے بدل گئی تھی۔

''پانچ منٹ کا وقت بہت ہے' میں بس ایک سوال تم سے کرنے آیا ہوں۔''

''سوال' کس بارے میں؟''

''کان لگا کر سنیئے میں آپ کو بتاتا ہوں۔ میرے بھائی کے یہاں آ کر جب آپ نے قیام فرمایا تھا' تو اس زمانے میں جبکہ میں نے ابھی آپ کی گفتگو سے شرف یاب ہونا ترک نہیں کیا تھا' مجھے بہت سے مسائل پر آپ کے خیالات سننے کا فخر حاصل ہوا' لیکن جہاں تک میری یاد کام کرتی ہے' تنہا مقابلہ اور عزت پر لڑ مرنے کے موضوع پر ہمارے درمیان کبھی گفتگو نہیں ہوئی اور نہ میری موجودگی میں کبھی یہ بحث چھڑی۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس بارے میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟''

بازاروف پافل پیئر وچ کے استقبال میں کھڑا ہو گیا تھا۔ اب وہ میز کے کنارے پر بیٹھ گیا اور ہاتھ باندھ لیے۔ کہنے لگا ''میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نظری اعتبار سے عزت پر لڑ مرنے کی بات محض بکواس ہے اور عملی اعتبار سے معاملہ بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔''

''یعنی آپ کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں آپ کا مطلب صحیح سمجھا ہوں کہ عزت پر لڑ مرنے کے بارے میں آپ نظری اعتبار سے کچھ ہی سوچتے ہوں' لیکن عملاً آپ یہ گوارا نہیں کریں گے کہ آپ کی کوئی اہانت کر دے اور آپ چپ چاپ اسے برداشت کر لیں۔''

''آپ نے میرا مطلب بالکل درست سمجھا ہے۔''

''بہت خوب! آپ سے یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ آپ کے اِن الفاظ نے مجھے تذبذب سے نجات دلا دی۔''

''آپ کا مطلب ہے بے یقینی سے چھٹکارا مل گیا؟''

''وہی مطلب ہوا۔ میں ایسی زبان بولتا ہوں کہ لوگ بات سمجھ لیں۔ میں.... کتاب کا کیڑا نہیں ہوں۔ آپ کے الفاظ نے مجھے ایک قدرے افسوسناک اقدام کرنے سے روک لیا ہے۔ میں نے آپ سے ڈوئل کا فیصلہ کیا ہے۔''

بازاروف کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ''مجھ سے؟''

''بلاشبہ آپ سے!''

''لیکن براہِ کرم یہ تو بتائیے کہ کیوں؟''

پافل پیئر وچ بولا ''میں آپ کو وجہ بھی بتا سکتا تھا، لیکن خیر میں اس کے بارے میں خاموش رہنا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ آپ یہاں ایک بدفاضل ہیں۔ میں آپ کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں آپ سے نفرت کرتا ہوں اور اگر آپ اس بات کو کافی نہیں سمجھتے....''

پافل پیئر وچ کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ بازاروف کی آنکھوں سے بھی شعلے برسنے لگے۔

''بہت اچھا'' وہ رضامند ہو گیا۔ ''مزید توضیحات کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو شوق چرایا ہے کہ مجھ پر اپنی حمیت و شجاعت کو آزمائیں۔ میں آپ کو اس لطف سے محروم بھی رکھ سکتا تھا، لیکن ہٹاؤ ایک ایک پانی ہو ہی جائے۔''

پافل پیئر وچ نے جواب دیا ''آپ کی طرف سے مجھ پر جو فرض عائد ہوتا ہے، اس کا مجھے احساس ہے۔ تو میں یہ بھروسہ رکھوں کہ آپ نے میرا چیلنج قبول کر لیا ہے اور مجھے کوئی تشدد آمیز اقدام کر کے اسے منوانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

بازاروف بڑے اطمینان سے بولا ''تشبیہ و استعارے کے جھمیلے پر تین حرف۔ آپ کا سیدھا سادہ اشارہ اس چھڑی کی طرف ہے ناں؟ بالکل درست ہے۔ میری اہانت فضول سی بات ہو گی، بلکہ یہ کوئی ایسا تیر بہدف قسم کا طریقہ بھی نہیں ہے۔ آپ شریف آدمی بنے رہیں..... میں بھی ایک شریف آدمی کی حیثیت سے آپ کا چیلنج قبول کیے لیتا ہوں۔''

''اچھی بات ہے۔'' پافل نے یہ کہتے ہوئے چھڑی ایک کونے میں رکھ دی۔ ''اب اپنے مقابلے کی شرائط کے سلسلے میں دو ڈھائی باتیں ہو جائیں، لیکن میں پہلے یہ جان لینا چاہتا ہوں کہ کیا آپ کے خیال میں یہ ضروری ہے کہ رسم کے طور پر ایک چلتی ہوئی سی جھڑپ ہو جائے، تاکہ میرے چیلنج کے لیے ایک بہانہ پیدا ہو جائے۔''

''نہیں! رسوم کے الجھیڑے میں نہ ہی پھنسیں تو بہتر ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بھی کچھ ایسا ضروری نہیں ہے کہ ہم

باہمی اختلاف کے اصل وجوہ کی چھان بین کریں۔ ہم ایک دوسرے کو برداشت نہیں کرسکتے۔بس کافی ہے اور کیا چاہیے؟''

''ہاں ہاں اور کیا چاہیے؟'' بازاروف نے طنزاً یہ الفاظ دُہرائے۔

''جہاں تک وقت اور موقع کا سوال ہے تو ظاہر ہے کہ ہمیں ثالث تو ملنے سے رہے اور مل بھی کہاں سکتے ہیں؟''

''بجا ہے' بھلا کہاں مل سکتے ہیں؟''

''تو میں جناب کے سامنے حسب ذیل تجویز پیش کرتا ہوں۔کل صبح چھ بجے جھاڑیوں کے پیچھے مقابلہ رہے۔لڑائی پستولوں سے ہونی چاہیے اور دس قدم کا فاصلہ رہنا چاہیے.....!!''

''دس قدم کا فاصلہ؟ درست ہے! ویسے ہم ایک دوسرے کو اتنے فاصلے پر دیکھنا نہیں چاہتے۔''

پافل پیئر وچ نے جواب دیا ''تو پھر آٹھ قدم کا فاصلہ رکھ لیجیے۔''

''رکھ لیجیے!''

''گولی دو مرتبہ چلے گی اور ہمیں ہر نتیجے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔لہٰذا ہم دونوں کو ایک ایک خط لکھ کر جیبوں میں رکھ لینا چاہیے' جس میں ہم انجام کا ذمہ دار اپنے آپ کو ٹھہرائیں۔''

بازاروف بولا ''جناب! اس بات کے حق میں' مَیں ہرگز نہیں ہوں۔اس میں کچھ فرانسیسی ناول کا رنگ پیدا ہوگیا ہے' جو ایسا زیادہ خوشگوار نہیں ہے۔''

''ممکن ہے' مگر آپ کو اس سے تو اتفاق ہوگا کہ قتل کے شبہ کا سامان پیدا کرنا خاصی ناخوشگوار بات ہوگی۔''

''اس سے مجھے اتفاق ہے' لیکن اس تکلیف دہ لعنت ملامت سے بچنے کا ایک طریقہ ہے۔ثالث تو بیشک نہیں ہوں گے' لیکن کسی شاہد کا انتظام تو کیا جاسکتا ہے۔''

''میں یہ دریافت کرسکتا ہوں کہ آپ کی نظر میں کون ایسا شخص ہے؟''

''پیاتر جو ہے!''

''کون پیاتر؟''

''آپ کے بھائی کا ملازم۔ وہ ایسا شخص ہے جو آج کل کی تہذیب سے خوب مانوس ہے اور وہ حتی المقدور دیانتداری سے یہ فرض انجام دے گا۔''

''جناب! میرا خیال ہے کہ آپ مذاق کر رہے ہیں۔''

''ہرگز نہیں۔ اگر آپ میری تجویز پر غور کریں تو آپ کو یقین آ جائے گا کہ یہ بہت سیدھی سادی معقول تجویز ہے۔ آپ چراغ کو دامن کے اندر تو نہیں چھپا سکتے' لیکن یہ کام میں اپنے ذمے لیتا ہوں کہ میں پیاتر کو مناسب طریقے سے تیار کروں گا اور اسے لڑائی کے مقام پر لے آؤں گا۔''

پافل پیئر وچ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا ''آپ ابھی تک مذاق کیے جا رہے ہیں' لیکن آپ نے جس حسن اخلاق سے آمادگی کا اظہار کیا ہے' اس کے بعد مجھے یہ کہنے کی گنجائش نہیں رہتی..... تو ہر چیز طے ہو گئی ناں..... برسبیل تذکرہ یہ بتایئے آپ کے پاس پستول تو کوئی نہیں ہے؟''

''پافل پیئر وچ صاحب! پستول میرے پاس کیوں ہونے لگا ہے۔ میں فوج میں تو نہیں ہوں۔''

''تو پھر میں آپ کو اپنا پستول پیش کر دوں گا۔ یقین کیجیے کہ اسے چلائے ہوئے مجھے پانچ سال ہو گئے ہیں۔''

''بڑی تشفی آمیز خبر ہے۔''

پافل پیئر وچ نے چھڑی اٹھائی..... ''اچھا تو حضرت کام ختم ہوا۔ اب آخر میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ اپنے مطالعہ سے لگیں۔ مجھے رخصت کی اجازت مرحمت فرمایئے۔''

''اس وقت تک کے لیے جب تک کہ پھر ہماری ملاقات ہو۔'' بازاروف یہ الفاظ کہتا ہوا اس کے ہمراہ دروازے تک گیا۔

پافل پیئر وچ باہر نکل گیا اور بازاروف منٹ بھر تک دروازے کے سامنے کھڑا رہا اور ایکا ایکی کہنے لگا ''خوب! اچھی گت بنی اپنی۔ بات دلچسپ بھی ہے اور احمقانہ بھی۔

اچھا خاصا ناٹک کیا تھا ہم نے' بس یہ کیفیت تھی جیسے سدھائے ہوئے کتے اپنے پچھلے پیروں پر کھڑے ہو کر ناچتے ہیں۔ لیکن انکار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ پر حملہ کر دیتا اور پھر....." (اِس خیال سے ہی بازاروف کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس کا سارا غرور اور تمکنت اچانک بیدار ہو گیا)....." تو نتیجہ یہ ہوتا کہ میں بلی کی طرح اس کا نرخرا چبا ڈالتا۔" وہ واپس اپنی خردبین کے پاس پہنچا' لیکن اس کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا اور مشاہدات کے لیے جس اطمینان و سکون کی ضرورت ہوتی ہے' وہ غارت ہو چکا تھا۔ وہ سوچنے لگا "اس نے آج ہمیں دیکھ پایا ہے' لیکن ایسی کون سی قیامت ٹوٹ پڑی۔ خالی خولی بوسہ ہی تو لیا تھا۔ بات کچھ اور ہی نظر آتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ جناب خود اس پر ریجھے ہوئے ہوں۔ ہاں' ہاں ضرور وہ اس پر مرتا ہے۔ یہ تو اظہر من الشّمس ہے۔ عجب اُلجھن ہے۔ عجب آفت ہے۔" آخر میں اس نے فیصلہ کیا "جس طور سے بھی دیکھو' ہے یہ کچھ بری سی بات۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ بھیجے میں گولی کھانے کا خطرہ مول لیا جائے اور جانا تو بہرصورت پڑے گا۔ پھر ارکادی ہے.....اور وہ غریب بھیگی بلی نکولائی پیئر وچ۔ بری بات ہے۔ بہت بری بات۔"

دن عجب خاموشی سے گزرا۔ ایک اضمحلال کی سی کیفیت طاری رہی۔ فنیشکا تو یوں بن گئی گویا گھر میں ہی نہیں ہے۔ اپنے چھوٹے سے کمرے میں ایسی دبکی بیٹھی رہی جیسے چوہیا اپنے بھٹے میں چھپ کر بیٹھ جاتی ہے۔ نکولائی پیئر وچ اپنی فکروں میں گھرا ہوا تھا۔ ابھی ابھی اس نے یہ خبر سنی تھی کہ اس کے گیہوں میں کیڑا لگ گیا ہے۔ اس گیہوں سے اس نے اپنی ساری امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ پافل پیئر وچ کی سرد مہری نے اور تو اور پروکوفش کے بھی حواس باختہ کر دیئے۔ بازاروف نے اپنے باپ کے نام ایک خط لکھا' لیکن پھر اسے چاک کر کے میز کے نیچے پھینک دیا۔

وہ سوچنے لگا "میں اگر مر گیا تو انہیں پتہ چل ہی جائے گا' لیکن میں مرکب رہا ہوں۔ نہیں اس دُنیا میں مجھے ابھی اور جدوجہد کرنی ہے۔" اس نے پیاتر کو ہدایت کی کہ کل صبح بڑا ضروری کام ہے۔ دن نکلتے ہی وہ اس کے پاس پہنچ جائے۔ پیاتر کو خیال پیدا ہوا کہ وہ اسے اپنے ہمراہ پیٹرسبرگ لے جانا چاہتا ہے۔ بازاروف دیر سے سویا اور رات بھر اسے

پریشان خواب ستاتے رہے..... اِن خوابوں میں مادام اوون تسوف بار بار دکھائی دیتی تھی۔ اب اس نے ماں کی حیثیت اختیار کرلی تھی اور اس کے پیچھے پیچھے ایک بلی کا بچہ لگا ہوا تھا' جس کی کالی کالی مونچھیں تھیں اور یہ بلی کا بچہ فنیشکا تھی۔ پھر پافل پیئر وچ نے ایک گھنے جنگل کی شکل اختیار کرلی' جس کے ساتھ اسے ابھی لڑنا تھا۔ پیاتر نے اسے چار بجے آ کر جگا دیا۔ اس نے جھٹ پٹ کپڑے بدلے اور اس کے ساتھ باہر ہولیا۔

صبح اپنی پوری تازگی اور شادابی سے طلوع ہو رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بادل کے ٹکڑے صاف شفاف ہلکی آسمانی فضا میں بھاپ کے پیچدار گچھوں کی شکل میں تیر رہے تھے۔ گھاس پر اور پتیوں پر شبنم کے قطرے لرز رہے تھے اور مکڑی کے جالوں پر تو وہ کچھ اس انداز سے جھلملا رہے تھے' جیسے کسی نے پگھلی ہوئی چاندی بکھیر دی ہے۔ زمین کی نم اور کالی مٹی پر گلابی صبح کے قدموں کے نشان ابھی تک باقی تھے۔ آسمان کے گرداگرد سے پرندوں کے نغمے پھوار بن بن کر برس رہے تھے۔ بازاروف جھاڑیوں تک گیا اور سائے میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس وقت کہیں جا کر اس نے پیاتر کو اس کام کی نوعیت سے مطلع کیا' جو اسے انجام دینا تھا۔ اس مہذب و شائستہ ملازم کا تو یہ حال ہوا کہ کاٹو تو جسم میں خون نہیں' لیکن بازاروف نے اسے یہ یقین دلا کر تسلی دی کہ اسے اور کوئی کام وام نہیں کرنا ہے۔ بس تھوڑے سے فاصلے پر کھڑا ہوا سب کچھ دیکھتا رہے۔ اور یہ کہ اس پر کسی بھی قسم کی ذمہ داری عائد نہیں ہوگی۔ ساتھ ہی میں اس نے یہ ٹکڑا بھی لگا دیا ''مگر تمہیں یہ بھی احساس رہنا چاہیے کہ تمہیں بہت اہم فرض انجام دینا ہے۔'' پیاتر ہاتھ جھٹک کر نیچے دیکھنے لگا اور ایک درخت پر جھک گیا۔

میر ینو سے جو سڑک آتی تھی' وہ بھونٹر کے کنارے کنارے چلی جاتی تھی۔ گرد کی ایک ہلکی تہہ اس پر بچھی ہوئی تھی۔ کل سے کسی پہیئے نے کسی قدم نے اسے مس نہیں کیا تھا۔ بازاروف کی نگاہیں غیر شعوری طور پر اس سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے گھاس کا ایک تنکا اٹھایا اور غصے سے اسے دانتوں میں چبانے لگا۔ دل ہی دل میں وہ کہتا جاتا تھا ''عجب حماقت ہے۔'' صبح کی ٹھنڈ کے اثر سے دو مرتبہ اس کے جسم میں کپکپی پیدا ہوئی..... پیاتر مایوسی کے عالم میں اسے دیکھنے لگا' لیکن بازاروف مسکرائے جا رہا تھا۔ اسے کسی قسم کا خوف نہیں تھا۔

سڑک پر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی..... درختوں کی اوٹ سے ایک کسان نکلتا دکھائی دیا۔ دو گھوڑوں کے پیر ایک رسی میں بندھے ہوئے تھے اور وہ انہیں ہانک رہا تھا اور جب وہ بازاروف کے قریب سے گزرا تو اس نے اسے ذرا تعجب سے تو ضرور دیکھا، لیکن دو پورے سلام کے نہیں اٹھے۔ پیاتر اس سے اور پریشان ہوا۔ اس نے کسان کی اس حرکت کو بدشگنی کی علامت سمجھا۔ بازاروف سوچنے لگا ''ایک شخص اور بھی سویرے سویرے گھر سے نکل پڑا ہے، لیکن وہ کام سے نکلا ہے اور ہم.....''

''لو جی وہ آ رہے ہیں۔'' پیاتر یک لخت سر سے پیر تک لرز گیا۔

بازاروف نے سر اٹھایا۔ کیا دیکھتا ہے کہ پافل پیئر وچ چلا آ رہا ہے۔ اس نے ہلکے چیک کا جیکٹ اور سفید براق پائجامہ پہن رکھا تھا۔ سڑک پر وہ بڑی تیزی سے بڑھا چلا آ رہا تھا۔ ہرے کپڑے میں لپٹا ہوا ایک بغچہ بغل میں دبا تھا۔ اس نے پہلے بازاروف کو پھر پیاتر کو سلام کیا۔ اس موقعہ پر وہ پیاتر سے بڑے ادب سے پیش آیا۔ اس وقت تو اس کی حیثیت تقریباً ایک ثالث کی تھی۔ سلام کر کے وہ کہنے لگا ''میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ میرا خیال ہے میری وجہ سے آپ کو انتظار کرنا پڑا۔ میں اپنے ملازم کو جگانا نہیں چاہتا تھا۔''

بازاروف نے جواب دیا ''کوئی ہرج نہیں۔ ہم بھی ابھی ابھی آئے ہیں۔''

''خیر! یہ اچھا ہوا۔'' پافل پیئر وچ نے اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی ''آس پاس کوئی نظر تو نہیں آتا۔ کوئی آ کر کھنڈت نہ ڈال دے۔ ہم شروع ہو جائیں ناں؟''

''ہاں ہاں شروع ہو جائیے!''

''میرا خیال ہے کہ آپ مزید توضیحات کے تو خواستگار نہیں ہیں؟''

''جی نہیں!''

بغچے میں سے پستول نکالتے ہوئے پافل پیئر وچ نے پوچھا ''آپ بھریں گے؟''

''نہیں آپ بھریئے۔ میں فاصلہ ناپتا ہوں۔ میرے ڈگ بڑے ہیں۔'' بازاروف مسکرانے لگا تھا ''ایک.....دو.....تین''

''یوگین وسل وچ'' پیاتر کی کانپتی ہوئی آواز بمشکل نکل سکی تھی (اس پر تو ایسا لرزہ

طاری تھا گویا اسے بخار آ گیا ہے) ''آپ کچھ ہی کہیں۔ میں تو یہاں سے دُور ہٹا جا رہا ہوں۔''

''چار..... پانچ.....خوب! ہاں' ہاں یار تم یہاں سے ہٹ جاؤ' بلکہ تم کسی درخت کے پیچھے کھڑے ہو جاؤ۔ کان بند کر لینا' لیکن آنکھیں بند نہ کر لینا۔ جو بھی گر پڑے دوڑ کر اسے اٹھا لینا۔ چھ.....سات.....آٹھ.....'' بازاروف رُک گیا ''ٹھیک ہے ناں؟'' اس کا خطاب پافل پیئر وچ سے تھا۔ ''یا دو قدم اور بڑھاؤں؟''

پافل پیئر وچ نے دوسری گولی رکھتے ہوئے جواب دیا ''آپ کی مرضی ہے۔''

''اچھا ہم دو قدم کا اضافہ اور کیے لیتے ہیں۔'' بازاروف نے اپنے بوٹ کی نوک سے زمین پر لکیر کھینچ دی۔ ''تو سرحد یہ ہوئی۔ اچھا یہ بھی تو بتائیے کہ سرحد سے کتنے قدم پیچھے تک ہٹا جا سکتا ہے۔ یہ بھی بڑا اہم سوال ہے۔ کل اس سوال پر گفتگو ہی نہیں ہوئی۔''

پافل پیئر وچ نے بازاروف کو دونوں پستول تھماتے ہوئے جواب دیا ''میرے خیال میں دس قدم رکھیئے اور ذرا مہربانی فرما کر ان میں سے پستول منتخب کر لیجیے۔''

''میں ضرور مہربانی کروں گا۔ مگر پافل پیئر وچ صاحب! آپ کو یہ ماننا پڑے گا کہ ہماری یہ لڑائی حماقت کی حد تک عجیب و غریب ہے۔ اس غریب ثالث کی صورت ذرا دیکھئے۔''

پافل پیئر وچ نے جواب دیا ''آپ ہر بات کا مذاق اڑانے کے قائل ہیں۔ یہ مقابلہ عجیب و غریب ہے' میں جانتا ہوں' لیکن میں آپ کو یہ جتا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ میں بڑی سنجیدگی سے یہ لڑائی لڑوں گا۔ یہ آپ خوب سمجھ لیں۔''

''مجھے اس میں کب شبہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کا کام تمام کرنے پر تلے ہوئے ہیں' لیکن ساتھ میں اگر ہنس بول بھی لیا جائے' تو کیا مضائقہ ہے۔ آپ مجھ سے فرانسیسی میں باتیں کر رہے ہیں اور میں آپ سے لاطینی میں باتیں کر رہا ہوں۔''

''میں پورے جوش سے یہ لڑائی لڑوں گا۔'' پافل پیئر وچ نے اپنی بات پھر دہرائی اور اپنی جگہ پر پہنچ گیا۔ بازاروف نے بھی لکیر سے دس قدم ناپے اور چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

پافل پیئر وچ نے پوچھا ''آپ تیار ہو گئے؟''

''بالکل!''

''تو اب ہم آگے بڑھیں؟''

بازاروف آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور پافل پیئر وچ نے بھی اس کی طرف قدم بڑھائے۔ اس کا الٹا ہاتھ جیب میں ٹھنسا ہوا تھا۔ اس نے پستول کی نوک آہستہ آہستہ بلند کی۔ بازاروف سوچنے لگا ''یہ شخص میری ناک کا نشانہ لے رہا ہے اور کمبخت کس احتیاط سے آنکھ میچ کر شست باندھ رہا ہے۔ یہ کوئی خوش گوار حسی کیفیت تو ہے نہیں اور میری نگاہیں اس کی گھڑی کی زنجیر پر ہیں۔''

کوئی چیز سنسناتی ہوئی بڑی تیزی سے اس کے کان کے پاس سے گزر گئی اور اسی لمحہ گولی چلنے کی آواز فضا میں گونجی۔ بازاروف کے دماغ میں بس ایک خیال بجلی کی طرح کوندا ''مجھے آواز آئی ہے۔ اس لیے معاملہ درست ہے۔'' اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور بغیر شست باندھے لبلبی دبا دی۔

پافل پیئر وچ ایک ذرا تڑپا اور اپنی ران کو دبوچ لیا۔ اس کے سفید پتلون پر خون کی تلی چل رہی تھی۔

بازاروف نے پستول ایک طرف پھینکا اور اپنے حریف کے قریب جا پہنچا ''آپ کے چوٹ لگ گئی کیا؟''

پافل پیئر وچ بولا ''آپ کو یہ حق پہنچتا تھا کہ آپ مجھے مقررہ سرحد کے قریب بلا لیتے، مگر خیر اب اس کا کیا فائدہ۔ معاہدے کی رُو سے ہم میں سے ہر شخص کو ابھی ایک گولی چلانے کا حق اور پہنچتا ہے۔''

''بجا ہے، لیکن یہ کسی اور وقت کے لیے ہم اٹھائے رکھتے ہیں۔'' بازاروف نے پافل پیئر وچ کو دبوچ رکھا تھا۔ پافل پیئر وچ کا رنگ زرد ہلدی ہوا جا رہا تھا۔ ''اب میں حریف نہیں رہا۔ میں اب ایک ڈاکٹر ہوں اور سب سے پہلے مجھے آپ کا زخم دیکھنا چاہیے۔ پیاتر ذرا اِدھر آنا۔ پیاتر، پیاتر ابے کہاں مر گیا؟''

''بکواس ہے..... مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔'' پافل پیئر وچ نے سر

جھٹک کر کہا ''اور ہمیں .....ایک مرتبہ پھر......'' اس نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرنا چاہا تھا' لیکن اس کا ہاتھ اسے دغا دے گیا۔ اس کی آنکھیں دھندلا گئیں اور وہ غش ہو گیا۔

پافل پیئر وچ کو گھاس پر لٹاتے ہوئے بازاروف کے منہ سے نادانستہ یہ نکلا ''لیجیے یہ نئی بات ہوئی۔ غشی کا دورہ پڑ گیا۔ اب آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے..... یہ تو دیکھوں کہ چوٹ کہاں آئی ہے۔'' اس نے رومال نکال کر اس سے خون پونچھا اور زخم کے اردگرد ٹٹولنا شروع کیا۔ ''ہڈی پر تو ضرب آئی نہیں ہے۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔ ''گولی ایسی زیادہ اندر نہیں گئی۔ بس ایک پٹھے پر کھرونچ آ گئی ہے۔ تین ہفتے کے اندر اندر اچھلنے کودنے کے قابل ہو جائے گا... اور یہ بیہوشی۔ ہوں اِن ذکی الحس لوگوں سے توبہ بھلی۔ مجھے تو ان سے نفرت ہے نفرت' مگر جلد دیکھو کتنی نرم ہے۔''

''کام تمام ہو گیا؟'' پیچھے سے پیاتر کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔

بازاروف نے گھوم کر دیکھا ''بھائی میرے ذرا لپک جاؤ اور تھوڑا سا پانی لے آؤ۔ یہ مرے نہیں ہیں۔ ہمیں مار کر مریں گے۔''

لیکن یہ جدید ملازم جانے اس کی بات سمجھا یا نہ سمجھا۔ اپنی جگہ سے ذرا جنبش نہیں کی۔ پافل پیئر وچ نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ پیاتر چپکے سے بولا ''آخری وقت ہے۔'' اور اس نے پہلو بدلنا شروع کیا۔

''درست کہتے ہو.....'' زخمی نے زبردستی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا۔

بازاروف چلّا پڑا ''ابے ملعون ذرا سا پانی لے آنا۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے.....وقتی طور پر غشی ہو گئی تھی..... مجھے ذرا بٹھا دیجیے..... ہاں ہاں بس ٹھیک ہے..... بس اِس گھاؤ کو باندھنے کے لیے کوئی پٹی مل جائے۔ اس کے بعد تو میں خود پیدل گھر چلا جاؤں گا یا اگر ٹم ٹم آ جائے تو اور بھی اچھا ہے۔ اگر آپ کی منشا ہو تو مقابلے کی بات آئندہ کے لیے ختم کر دی جائے۔ آپ نے بڑی شرافت اور مردانگی کا ثبوت دیا ہے..... مگر دیکھئے آج' آج۔''

بازاروف نے پیوند لگایا ''گڑے مردے کیوں اکھاڑتے ہو اور مستقبل کا یہ ہے کہ آپ اس کے متعلق فکر مند نہ ہوں۔ میرے جانے میں مطلق تاخیر نہیں ہوگی۔ میں آپ

کی ٹانگ پر ذرا پٹی باندھ دوں۔ گھاؤ ایسا گہرا نہیں ہے' لیکن خون کو بہنے سے روک دینا اچھا ہی ہوتا ہے' لیکن میں پہلے اس نالائق کے حواس تو درست کر دوں۔''

بازاروف نے پیاتر کا گریبان پکڑ کر اسے جھنجوڑ ڈالا اور اسے ٹم ٹم لینے کے لیے بھیج دیا۔

پافل پیئر وچ اس سے کہنے لگا ''مگر دیکھنا بھیا کو جا کر مت گڑ بڑا دینا۔ انہیں اطلاع نہ ہونے پائے۔ سمجھے!''

پیاتر تیر کی طرح وہاں سے چلا۔ وہ تو اُدھر ٹم ٹم لینے دوڑا جا رہا تھا اور اِدھر دونوں حریف زمین پر بیٹھے تھے۔ ان کی زبانوں میں تالے پڑ گئے تھے۔ پافل پیئر وچ بازاروف سے نگاہیں بچا رہا تھا۔ وہ اس سے صلح صفائی کرنے پر بہر صورت مائل نہیں تھا۔ اسے اپنے غرور و تمکنت پر اپنی ناکامی پر شرم آ رہی تھی۔ اسے اس صورتحال پر شرم آ رہی تھی' جو اس نے پیدا کر لی تھی۔ اگرچہ اسے یہ بھی احساس تھا کہ انجام اس سے زیادہ خوشگوار کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دے لی کہ ''اب کم از کم یہ تو ہوگا کہ کسی قسم کی بدنامی نہیں ہوگی اور اس کا مجھے شکر ادا کرنا چاہیے۔'' خاموشی کا وقفہ طویل ہوتا چلا گیا۔ خاموشی جو اذیت ناک بھی تھی اور کچھ بے ڈھنگی بھی۔ دونوں اکھڑے اکھڑے ہو رہے تھے۔ ہر ایک کو یہ احساس تھا کہ دوسرا فریق اس کا مافی الضمیر سمجھ گیا ہے۔ یہ صورت دوستوں کے لیے تو خوشگوار ہوتی ہے' لیکن ان لوگوں کے لیے بڑی ناخوشگوار ہوتی ہے' جو آپس میں دوست نہ ہوں' بالخصوص ایسی صورت میں کہ مفاہمت کے سارے دروازے بند ہو چکے ہوں۔

''میں نے ٹانگ زیادہ سختی سے تو نہیں باندھ دی ہے۔'' آخر بازاروف نے مہرِ سکوت توڑ ہی ڈالی۔

''نہیں! بالکل نہیں' ٹھیک بندھی ہے۔'' پافل پیئر وچ نے جواب دیا اور اک ذرا تامل کر کے پھر بولا ''میں اپنے بھائی کو صدمہ پہنچانا نہیں چاہتا۔ ہمیں ان سے یہ کہنا پڑے گا کہ سیاسی باتوں پر ہمارا جھگڑا ہو پڑا۔''

بازاروف نے جواب دیا ''بہت خوب! آپ یہ کہیے کہ میں نے سارے

انگریزیت زدہ لوگوں کی بے عزتی کی تھی۔''

''یہ بہت ہی اچھا رہے گا۔آپ کے خیال میں یہ شخص ہمارے متعلق کیا سوچتا ہوگا۔'' پافل پیئر وچ نے یہ الفاظ اس کسان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہے جو مقابلے سے چند منٹ پہلے بندھے ہوئے گھوڑوں کو بازاروف کے قریب سے لے کر نکلا تھا اور اب واپس جا رہا تھا۔ اِس مرتبہ اس نے بھلے آدمیوں کو دیکھ کر ادب سے ٹوپی بھی اتار لی تھی۔

بازاروف جواب میں بولا ''کون کہہ سکتا ہے۔ قطعی ممکن ہے کہ وہ کچھ بھی نہ سوچتا ہو۔روسی کسان تو بڑی پُراسرار نا معلوم سی شے ہے۔ مسز ایڈکلف نے اس کے متعلق بہت سی باتیں کی ہیں۔اسے بھلا کون سمجھے گا۔ وہ خود اپنے آپ کو نہیں سمجھتا۔''

''اچھا تو آپ کا خیال یہ ہے'' اور یہ کہتے کہتے وہ اچانک چلّا پڑا۔''دیکھو دیکھو اس گدھے احمق پیاتر نے کیا ہنگامہ کھڑا کیا ہے۔ وہ ہمارے بھائی صاحب لپکے چلے آرہے ہیں۔''

بازاروف مڑ کر کیا دیکھتا ہے کہ نکولائی پیئر وچ ٹم ٹم میں بیٹھا چلا آ رہا ہے۔اس کا چہرہ زرد پڑ گیا ہے۔ٹم ٹم رُکنے بھی نہ پائی تھی کہ وہ اس میں سے کود پڑا اور بھائی کی طرف دوڑا۔

سراسیمہ ہوکر بولا ''یہ کیا ہوا؟ یوگین وسل یوچ آخر آپ بتائیں ناں یہ کیا قصہ ہے؟''

پافل پیئر وچ کی طرف سے جواب ملا ''کوئی قصہ وصہ نہیں ہے۔ اِن لوگوں نے خواہ مخواہ تمہیں پریشان کیا ہے۔ مسٹر بازاروف سے میری ذرا جھڑپ ہوگئی تھی اور اس کا مجھے تھوڑا سا خمیازہ بھگتنا پڑا۔''

''مگر خدا کے واسطے بتاؤ ناں کہ جھگڑا کیا تھا؟''

''میں تمہیں کیا بتاؤں۔ مسٹر بازاروف نے اہانت آمیز انداز میں سر رابرٹ بیل کا ذکر کیا تھا۔ ہاں میں یہ بتائے دیتا ہوں کہ اس سارے قصے میں جو کچھ بھی ہوا' اس کا الزام مجھ پر آتا ہے۔ مسٹر بازاروف نے تو بڑی شرافت کا ثبوت دیا۔ میں نے انہیں للکارا تھا۔''

''مگر آپ تو خون میں لت پت ہو رہے ہیں۔ ہائے میرے مالک میں کیا کروں۔''

''تو تم یہ سمجھتے تھے کہ میری رگوں میں پانی بھرا ہوا ہے' لیکن یہ خون کا اخراج میرے لیے فائدہ مند ثابت ہوگا۔ کیوں ڈاکٹر صاحب یہی بات ہے ناں؟ اب مجھے تم ذرا ٹم ٹم میں بٹھا دو اور رنج و ملال کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کل تک میں تندرست ہو جاؤں گا۔ ہیں ناں۔ خوب! اچھا میاں کوچوان گاڑی بڑھاؤ۔''

نکولائی پیئر وچ اس سے بولا ''میری آپ سے درخواست ہے کہ جب تک کسی اور ڈاکٹر کا انتظام نہ ہو۔ آپ ان کی دیکھ بھال کریں۔''

بازاروف زبان سے تو کچھ نہ بولا البتہ سر ہلا دیا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر پافل پیئر وچ کی بڑی ہوشیاری سے مرہم پٹی کر دی گئی اور اسے بستر پر لٹا دیا گیا۔ سارے گھر میں سنسنی پھیل گئی تھی۔ فینشکا کو غش آ گیا۔ نکولائی پیئر وچ برابر ہاتھ ملے جا رہا تھا' لیکن دوسروں سے نگاہیں بچا کر اور پافل پیئر وچ ٹھٹھے لگا رہا تھا۔ ہنسی مذاق کر رہا تھا۔ خاص طور پر بازاروف سے ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ اس نے بڑے نفیس قسم کی تن زیب کی قمیض پہن رکھی تھی۔ گلے میں ایک خوبصورت گلوبند اور سر پر ٹوپی تھی۔ دریچوں کے پردے گرانے سے اس نے منع کر دیا۔ ازراہ مذاق اس نے یہ بھی شکایت کی کہ مجھ پر دانہ پانی بند کر دیا گیا ہے۔

البتہ رات کو اسے حرارت ہو گئی۔ اس کا سر درد کرنے لگا۔ قصبے سے ڈاکٹر بھی آ پہنچا تھا۔ نکولائی پیئر وچ نے بھائی کی ایک نہ سنی اور دراصل بازاروف بھی یہی چاہتا تھا۔ وہ سارے دن اپنے کمرے میں بیٹھا رہا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اس پر انتقامی جذبے کی پرچھائیاں کانپ رہی تھیں۔ بس تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے وہ مریض کے کمرے میں گیا۔ فینشکا سے دو مرتبہ اس کی مڈھ بھیڑ ہوئی' مگر وہ اسے دیکھ کر مارے خوف کے سمٹ سمٹ گئی۔ نئے ڈاکٹر نے ٹھنڈی غذا کھلانے کی ہدایت کی البتہ اس نے بازاروف کے اس دعوے کی تائید ضرور کی کہ مریض کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ نکولائی پیئر وچ نے اسے یہ بتایا کہ اس کے بھائی نے محض اتفاق سے اپنے آپ کو زخمی کر لیا ہے۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر نے ایک لمبی

سی 'ہوں' کی' لیکن جب ہاتھ کے ہاتھ چاندی کے پچیس کھنکتے ہوئے سکوں سے اس کی مٹھی گرم کردی گئی تو اس نے کہا ''آپ خواہ مخواہ یہ کہتے ہیں۔ بھئی اس میں ہے کیا؟ ایسا ہی ہو جاتا ہے اور اکثر ہوتا ہے۔''

گھر میں کسی نے نہ تو سونے کا نام لیا اور نہ کپڑے تبدیل کیے۔ نکولائی پیئر وچ پنجوں کے بل دھیرے دھیرے بھائی کے کمرے میں جاتا تھا اور پنجوں کے بل ہی پلٹ آتا تھا اور بھائی پر غنودگی کی کیفیت طاری رہی۔ کبھی کبھی وہ کراہنے لگتا تھا۔ فرانسیسی زبان میں نکولائی سے کہنے لگا۔ ''آپ جا کر آرام کریں'' اور پھر اس نے شراب مانگی۔ نکولائی پیئر وچ نے فینشکا کو دو مرتبہ لیمن کا گلاس لے لے کے وہاں بھیجا۔ پافل پیئر وچ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا اور لیمن کا ایک ایک قطرہ پی کے دم لیا۔ صبح ہوتے ہوتے بخار ذرا تیز ہو گیا اور ہلکی سرسامی کیفیت بھی پیدا ہو چکی تھی۔ پہلے تو پافل پیئر وچ نے اَنمل بے جوڑ الفاظ بولنے شروع کیے۔ پھر یکا یک اس نے آنکھیں کھول دیں۔ بھائی کو سرہانے دیکھ کر وہ کچھ بے چین ہو کر اس کی طرف جھک گیا اور کہنے لگا ''نکولائی تم نے کبھی یہ سوچا کہ فینشکا میں کچھ کچھ نیلی کی شباہت ہے؟''

''بھائی جان! کون نیلی؟''

''لو اور سنو! نیلی کو نہیں جانتے؟ وہی شہزادی رے۔ خاص طور پر چہرے کے بالائی حصے میں تو بہت ہی مشابہت ہے۔ کچھ خاندانی مشابہت سی نظر آتی ہے۔''

نکولائی پیئر وچ نے اس کا کوئی جواب تو نہیں دیا' لیکن دل ہی دل میں وہ اس پر تعجب کرتا رہا کہ انسان میں نفسانی جذبات ایسا گھر کرتے ہیں کہ نکالے نہیں نکلتے۔ ''بس اس قسم کے موقعوں پر وہ شعور کی سطح پر آ کر اپنی ایک جھلک دکھا جاتے ہیں۔''

پافل پیئر وچ نے بڑے پُرملال انداز میں اپنے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے کر لیے اور بڑبڑانے لگا۔ ''اف مجھے اس بیوقوف لڑکی سے کس قدر لگاؤ ہے'' چند منٹ بعد وہ دھیرے سے بولا ''میں یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی چھچھورا اٹھائی گیرا یہ جرأت کرے کہ......!''

نکولائی پیئر وچ نے ایک ٹھنڈا سا سانس بھرا۔ اسے یہ شبہ تک نہیں گزرا کہ یہ

الفاظ اُس کے بارے میں ہیں۔

بازاروف دوسرے دن آٹھ بجے اس کے پاس حاضر ہوا۔ اس نے اپنا سارا سامان باندھ بوندھ لیا تھا اور سارے مینڈکوں، کیڑوں مکوڑوں اور چڑوں چڑیوں کو آزادی کا پروانہ عطا کر دیا گیا تھا۔

نکولائی پیٹر وچ اٹھ کھڑا ہوا ''آپ رخصت ہونے آئے ہیں؟''

''جی!''

''مجھے آپ کی مشکل کا خوب احساس ہے۔ ساری خطا میرے بھائی کی ہے اور انہیں اس کی سزا بھی مل گئی۔ انہوں نے خود مجھ سے کہا کہ انہوں نے ایسی صورت پیدا کر دی تھی کہ آپ کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں رہ گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس مقابلے سے دامن بچانے کی آپ کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس کی..... تھوڑی بہت وضاحت اس شدید اختلاف سے ہوتی ہے جو آپ دونوں کے خیالات میں ہے۔'' (نکولائی پیٹر وچ اپنے الفاظ میں الجھنے لگا) ''میرے بھائی صاحب! پرانے مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا مزاج گرم ہے۔ ذرا ہٹ دھرم بھی واقع ہوئے ہیں..... خدا کا شکر ہے کہ نوبت یہیں تک پہنچی۔ ویسے میں نے بڑی احتیاط برتی ہے کہ اس واقعہ کو ہوا نہ دی جائے۔''

بازاروف کہنے لگا ''ممکن ہے بعد میں کچھ شور وور مچے، اس لیے میں اپنا پتہ چھوڑے جا رہا ہوں۔''

''مجھے امید ہے کہ کوئی شور وور نہیں مچے گا۔ یوگین وسل یوچ......سخت افسوس ہے کہ آپ ہمارے یہاں آ کر مہمان رہے تھے اور اس کا.....اس کا انجام یہ ہوا۔ یہ بات اس لیے اور بھی تکلیف دہ ہے کہ ارکادی......''

''میرا خیال ہے کہ میری اس سے ملاقات ہوگی۔'' بازاروف جب کسی بات کی وضاحت کرتا تھا یا کسی بات پر احتجاج کرتا تھا تو اس کی نوعیت کچھ بھی ہو اس سے ایک بے کلی کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ ''اور اگر میری ملاقات نہ ہو سکے تو میری طرف سے اسے سلام کہیے اور میری طرف سے اظہارِ افسوس کر دیجیے۔''

''اور میری درخواست ہے کہ.....'' نکولائی پیئر وچ نے جواب دینا شروع کر دیا تھا۔ لیکن بازاروف نے فقرے کے ختم ہونے کا انتظار ہی نہیں کیا اور وہاں سے چلتا بنا۔

پافل پیئر وچ کو بازاروف کے جانے کا جب پتہ چلا تو اس نے اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس سے ہاتھ ملایا' لیکن اس وقت بھی اس نے اسی قدر سرد مہری کا اظہار کیا۔ اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ پافل پیئر وچ عالی حوصلگی کے مظاہرے پر آمادہ ہے۔ فینشکا سے وہ رخصت طلب نہ کر سکا۔ بس کھڑکی پر کھڑے کھڑے اس نے آنکھیں ضرور لڑائی تھیں۔ اس کا چہرہ اسے یوں نظر آیا جیسے حسرت و یاس میں ڈوبا ہوا ہے۔ اپنے دل میں وہ کہنے لگا ''اس غریب کا دل ٹوٹ جائے گا...... مگر کیا اعتبار ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح سے اپنے دل کو سمجھا ہی لے گی۔'' البتہ پیاتر سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ اس کے شانے پر سر رکھ کر زار و قطار رونے لگا۔ آخر بازاروف نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ بھئی کیا تم نے اپنی آنکھوں میں مستقل سپلائی کا انتظام کر رکھا ہے۔ یہ سن کر اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور دونیاشا کو اپنے دل کی کیفیت چھپانے کی غرض سے جنگل کا رُخ کرنا پڑا اور وہ شخص جس کی ذات اِس تمام غم و الم کا سرچشمہ تھی' وہ گاڑی میں سوار ہوا۔ اس نے سگار سلگا لیا تھا۔ جب تیسرا میل شروع ہوا اور سڑک کے موڑ پر سے کرسانوف کا نیا مکان اور کھیت ایک قطار کی شکل میں دُور تک پھیلے نظر آ رہے تھے تو اس نے طیش میں آ کر تھوک دیا اور بڑبڑانے لگا۔ ''منحوس ملعون لوگ'' پھر اس نے اپنا کمبل ذرا اور کس کر اپنے گرد لپیٹ لیا۔

پافل پیئر وچ کی حالت جلد ہی سنبھل گئی' لیکن تقریباً ایک ہفتے تک وہ بدستور صاحب فراش بنا رہا۔ اس نے اپنی قید کے دن (وہ خود یہی کہتا تھا) خاصی مستقل مزاجی سے کاٹے۔ یہ الگ بات ہے کہ نہانے دھونے اور بننے سنورنے میں وہ بڑا اہتمام برتتا تھا۔ نکولائی پیئر وچ اسے رسالے پڑھ پڑھ کے سنایا کرتا تھا۔ فینشکا بدستور اس کی خدمت گزاری کرتی رہی۔ وہ لیمن' شوربہ' ابلے ہوئے انڈے اور چائے لے لے کر اس کے کمرے میں آیا کرتی تھی' لیکن جب بھی وہ اس کے کمرے میں داخل ہوتی' ایک بے نام خوف کی کیفیت اس پر غالب آ جاتی۔ پافل پیئر وچ کے غیر متوقع اقدام نے گھر میں ہر شخص کو چونکا دیا تھا اور سب سے زیادہ وہ چونکی تھی۔ بس ایک پروکوفش تھا' جس نے اس واقعہ

سے مطلق اثر قبول نہیں کیا۔ اس نے تو الٹی یہ تقریریں کرنا شروع کر دیں کہ اس کے زمانے میں شرفاء کس شان سے لڑا کرتے تھے' مگر یہ کہ وہ ہمیشہ شرفاء ہی سے لڑتے تھے۔ ان جیسے چرخٹوں کی بدتمیزی پر تو وہ یہ کرتے تھے کہ جاؤ بیٹا ذرا اصطبل کی ہوا کھاؤ۔

فینشکا کا ضمیر تو اسے ملامت نہیں کر رہا تھا۔ ہاں کبھی کبھی جھگڑے کی اصل وجہ کے متعلق سوچ کر اسے ضرور تکلیف ہوتی تھی اور پافل پیئر وچ بھی اسے اس عجیب وغریب انداز میں دیکھتا تھا...... کہ جب وہ اس کی طرف پشت کیے ہوئے ہوتی تھی۔ تب بھی اسے یہ محسوس ہوتا رہتا تھا کہ اس کی آنکھیں اسے گھور رہی ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ اس کی جان میں اضطراب ٹھہرنے لگا اور جسم جھٹک گیا' مگر جیسا کہ دستور ہے رنگ اس کا جتنا اڑا' اتنا ہی اور کھلا۔

ایک روز کیا ہوا' یہ واقعہ صبح کا ہے' پافل پیئر وچ کی طبیعت سنبھلی ہوئی تھی۔ وہ بستر سے اٹھ کر صوفے پر آ بیٹھا تھا۔ نکولائی پیئر وچ کو اطمینان ہو گیا کہ اس کا حال اچھا ہے۔ چنانچہ وہ کھیت پر چلا گیا۔ فینشکا چائے کی پیالی لے کر آئی اور اسے چھوٹی والی میز پر رکھ کر واپس جانے کی نیت باندھ رہی تھی۔ پافل پیئر وچ نے اسے روک لیا۔

''فیدوسیہ نکولیونا! آخر ایسی جلدی کیا ہے؟ بہت مصروف ہو کیا؟''

''جی نہیں...... مجھے جا کر چائے بنانی ہے۔''

''یہ کام دونیا شا تمہارے بغیر بھی کر سکتی ہے۔ اس غریب بیمار کے پاس بھی تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے ڈیڑھ دو باتیں بھی کرنا چاہتا تھا۔''

فینشکا چپ چاپ ایک آرام کرسی کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

پافل پیئر وچ مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کہنے لگا ''سنو! میں بہت دنوں سے تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا تھا۔ تم مجھ سے کچھ ڈری ڈری رہتی ہو؟''

''میں؟''

''ہاں تم! تم کبھی مجھ سے آنکھ سے آنکھ نہیں ملا سکتیں؟ گویا تمہارے ضمیر میں کوئی کانٹا سا کھٹکتا ہے۔''

فینشکا کا چہرہ شرم سے لال پڑ گیا' لیکن پافل پیئر وچ کی طرف اس نے ضرور

دیکھا۔ وہ اسے کچھ عجیب وغریب سا معلوم ہو رہا تھا اور اس کا دل آہستہ آہستہ دھڑکنے لگا۔

''تمہارا ضمیر مطمئن ہے؟'' اس نے فینشکا سے سوال کر ہی ڈالا۔

''مطمئن نہ ہونے کی کیا بات ہے؟'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر تم کسی کو صدمہ پہنچا سکتی ہو تو وہ آخر کون ہے؟ مجھے؟ یہ تو ممکن نہیں ہے۔ اس گھر میں اور کوئی شخص؟ یہ بھی کچھ ناممکن سی بات معلوم ہوتی ہے۔ میرا بھائی تو نہیں ہے؟ تم تم اس سے محبت کرتی ہو یا نہیں کرتیں؟''

''میں ان سے محبت رکھتی ہوں۔''

''پورے خلوص سے' تہ دل سے؟''

''میں نکولائی پیئر وچ کو دل سے چاہتی ہوں۔''

''واقعی؟ فینشکا ذرا میری طرف دیکھو۔'' (یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اسے نام سے مخاطب کیا تھا) ''تمہیں معلوم ہے۔ یہ بڑا گناہ ہے۔''

''پافل پیئر وچ! میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔ مجھے اور نکولائی پیئر وچ سے محبت نہ ہو' تو پھر جینے میں میرے لیے کون سی کشش باقی رہ جاتی ہے؟''

''اور تم کسی کی خاطر بھی اس سے قطع تعلق نہیں کرو گی؟''

''بھلا کس کی خاطر ان سے قطع تعلق کرتی؟''

''کس کی خاطر.... اچھا ان صاحب کا کیا سلسلہ تھا' جو کل پرسوں یہاں سے رخصت ہوئے ہیں؟''

فینشکا کھڑی ہو گئی ''پافل پیئر وچ! خدا کے غضب سے ڈریئے۔ آپ مجھے کیوں ستاتے ہیں؟ آخر میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟ ایسی باتیں آپ کی زبان پر آتی کیسے ہیں؟''

''فینشکا'' پافل پیئر وچ کی آواز میں حزن والم کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ میں نے دیکھ لیا تھا....''

''کیا دیکھ لیا تھا آپ نے؟''

''وہی.... کنج میں جو ہو رہا تھا۔''

فینشکا کی کان کی لویں تک سرخ پڑ گئیں اور اس سرخی نے پھیلتے پھیلتے اس کی زلفوں کو جا چھوا۔ اس کے لیے بات کرنا دوبھر ہو گیا۔ بمشکل وہ اتنا کہہ سکی ''اس میں میری کیا خطا تھی؟''

پافل پیئر وچ نے پھریری لی ''تمہاری خطا نہیں تھی؟ نہیں تھی؟ بالکل نہیں تھی؟''

''میں نکولائی پیئر وچ کو چاہتی ہوں۔ دنیا کی کسی اور ہستی سے میرا تعلق نہیں ہے۔ میں انہیں ہمیشہ چاہوں گی۔'' فینشکا ایکا ایکی گرم ہو کر چلّانے لگی تھی، مگر معلوم یوں ہو رہا تھا کہ اس کا گلا سسکیوں سے رندھا جا رہا ہے ''اور آپ نے جو دیکھا ہے تو مجھے حشر میں منہ دکھانا ہے۔ قیامت کے دن میں صاف صاف کہوں گی کہ خطا میری نہیں ہے، میری نہیں تھی اور اگر لوگ باگ میرے سرتاج نکولائی پیئر وچ کے خلاف مجھ پر ایسا ویسا شک کرنے لگیں تو میں فوراً جان دے دوں گی۔''

لیکن یہاں آ کر اس کی آواز بالکل رندھ کر رہ گئی اور عین اس موقع پر اسے یوں لگا کہ پافل پیئر وچ نے اس کا ہاتھ تھام لیا ہے اور اسے دبا رہا ہے.....اسے دیکھ کر وہ دم بخود رہ گئی۔ پافل پیئر وچ کے چہرے کا رنگ کچھ اور زیادہ زرد پڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی اور سب سے زیادہ حیرت افزا بات یہ تھی کہ ایک بڑا سا آوارہ آنسو اس کے رخسار پر ڈھلک رہا تھا۔

''فینشکا'' اس کا سرگوشی کا انداز کچھ یوں ہی عجیب سا تھا ''اسے چاہو ضرور چاہو، میرے بھائی کو، دنیا کی کوئی ہستی ہو کسی کی باتوں میں نہ آنا۔ کسی کی خاطر اس سے ناتا مت توڑنا۔ ذرا سوچو غور کرو کہ آدمی محبت کرے اور خود اس سے محبت نہ کی جائے اس سے زیادہ خوفناک بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ میرے بھائی میرے پیارے نکولائی کو چھوڑ نہ دینا، کبھی نہ چھوڑنا۔''

فینشکا کی آنکھیں خشک تھیں۔ وہ تو دراصل ہکا بکا رہ گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی وہ دہشت زدگی بھی غائب ہو چکی تھی، لیکن اس وقت اس کے احساسات کیا ہوں گے، جب پافل پیئر وچ نے ہاں خود پافل پیئر وچ نے اس کا ہاتھ اٹھا کر اپنے لبوں پر رکھ لیا تھا۔ یوں اس نے ہاتھ کا بوسہ نہیں لیا تھا، لیکن معلوم یوں ہوتا تھا کہ اس کے ہونٹ اس میں پیوست

ہو گئے ہیں، نفوذ کر گئے ہیں اور تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد بڑی شدت سے آہیں بھرنے کی آواز آتی تھی.....

''میرے مالک'' وہ سوچ رہی تھی۔ ''کہیں انہیں دورہ تو نہیں پڑ گیا؟''

اس کے نفس میں زلزلہ آ گیا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کی پامال اور ویران زندگی یکا یک جی اٹھی تھی۔

زینے پر کھٹر پٹر ہوئی۔ کوئی تیزی سے اوپر چلا آ رہا تھا..... اس نے فینشکا کو پرے ہٹایا۔ اس کا سر پیچھے کی طرف ڈھلک کر تکیے پر جا ٹکا۔ دروازہ کھلا اور نکولائی پیئر وچ ہشاش بشاش اندر داخل ہوا۔ وہی باپ والی تروتازگی میتیا پر بھی تھی۔ اس نے اکہری قمیض پہن رکھی تھی اور باپ کے کاندھے پر بیٹھا بیٹھا ہمک رہا تھا اور اپنے ننھے ننھے ننگے انگوٹھوں سے اس کے موٹے گنوار کوٹ کے بڑے بڑے بٹنوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

فینشکا بے ساختہ آگے بڑھی اور اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ اسے اور بیٹے کو دونوں کو اس نے اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔ اس کا سر ڈھلک کر اس کے شانوں پر جا ٹکا۔ نکولائی پیئر وچ بھونچکا رہ گیا۔ فینشکا، متین فینشکا جو ہمیشہ بڑی لی دی سی رہتی تھی اور جو کبھی کسی تیسرے شخص کے سامنے اس سے بغلگیر نہیں ہوئی تھی۔

''ہیں ہیں، آخر بات کیا ہے؟'' یہ کہتے کہتے اس کی نظر بھائی پر جا پڑی۔ میتیا کو اس نے فینشکا کی گود میں دیا اور پافل کے پاس جا کر پوچھنے لگا ''خیر تو ہے! طبیعت کچھ بگڑی ہوئی ہے؟''

اس نے تن زیب کے رومال میں منہ چھپا لیا۔ ''نہیں..... بالکل نہیں..... بلکہ اب تو میری طبیعت بہت سنبھل گئی ہے۔''

''یہ آپ نے کیا کیا کہ ابھی سے صوفے پر بھی آ بیٹھے اور تم کہاں جا رہی ہو جی؟'' نکولائی پیئر وچ اب فینشکا سے مخاطب ہوا تھا، لیکن وہ تو دروازے سے نکل کر جا بھی چکی تھی۔ ''میں اپنے ٹینی سورما کو آپ کے پاس لایا تھا۔ تایا تایا چلّا رہا تھا۔ مگر وہ کہاں لے گئیں اسے؟ مگر بات کیا ہے؟ آپ کے درمیان کوئی بات تو نہیں ہو گئی ہے؟''

''بھیا!'' پافل پیئر وچ نے بڑی متانت اور سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا تھا۔
نکولائی پیئر وچ چونک پڑا۔ وہ سہم گیا۔ کیوں سہم گیا' یہ وہ خود نہیں بتا سکتا تھا۔
''بھیا!'' پافل پیئر وچ پھر بولا ''وعدہ کرو کہ تم میری ایک التجا مان لو گے؟''
''کیسی التجا؟ بتائیے گا!''

''بہت اہم بات ہے۔ تمہاری زندگی کی ساری خوشیوں کا انحصار اس ایک بات پر ہے۔ کم از کم میرا خیال یہی ہے۔ اس وقت جو بات میں تم سے کہنی چاہتا ہوں' اس پر میں نے بہت سوچ بچار کیا ہے۔ بھیا میرے! یہ تمہارا فرض ہے ایک ایماندار اور عالی حوصلہ شخص کا یہ فرض ہے اس رسوائی کو ختم کرو....اس بری مثال کو جو تم نے' تم جیسے اچھے آدمی نے قائم کی ہے۔''

''بھائی جان آپ کا مطلب کیا ہے؟''

''فینشکا سے شادی کر لو.....وہ تمہیں چاہتی ہے۔ وہ تمہارے بیٹے کی ماں ہے۔''

نکولائی پیئر وچ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور ہاتھ جھٹک کر بولا ''پافل! آپ یہ کہہ رہے ہیں؟ آپ جنہیں میں نے ہمیشہ اس قسم کی شادیوں کی شدت سے مخالفت کرتے دیکھا ہے۔ آپ ایسا کہتے ہیں؟ آپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ محض آپ کا پاس ادب تھا کہ میں نے یہ اقدام جسے آپ بجا طور پر میرا فرض بتاتے ہیں' نہیں کیا ہے؟''

پافل پیئر وچ تھکے ہوئے سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا ''تم نے اس معاملے میں میرا پاس کیا' غلط کیا۔ مجھے یہ خیال پیدا ہونے لگا ہے کہ بازاروف علمیت بگھارنے کا الزام اگر مجھے دیتا تھا تو درست ہی دیتا تھا۔ نہیں' بھیا میرے! رسوم و رواج کیا کہتے ہیں' دنیا کیا کہے گی۔ ہمیں اس پر اب زیادہ سر کھپانا نہیں چاہیے۔ ہم ٹھہرے اگلے وقتوں کے غریب و مسکین لوگ۔ بہتر یہ ہے کہ ہر قسم کے غرور و تمکنت کو ہم بالائے طاق رکھیں۔ جیسا کہ تم کہتے ہو ہمیں اپنا فرض ادا کرنا چاہیے اور یہ بھی سمجھ لو یہ سودا ہمیں مہنگا نہیں پڑے گا۔ اس کے بدلے میں ہمیں اطمینان و مسرت ملے گی۔''

نکولائی پیئر وچ لپک کر بھائی کے گلے سے لگ گیا اور چلا کر بولا ''آپ نے آج میری آنکھیں کھول دیں۔ میں ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا کہ آپ بڑے دانا بینا اور بڑے رحم دل

آدمی ہیں۔ یہ بات سچ ہی نکلی، بلکہ اب تو میں یہ سوچتا ہوں کہ آپ جتنے نیک طینت ہیں، اتنے ہی معقولیت پسند بھی ہیں۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے!" پافل پیئر وچ بات کاٹتے ہوئے بولا "اپنے معقولیت پسند بھائی کی ٹانگ پر تو رحم کرو، جس کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ پچاس برس کی عمر میں آ کر ان کے نام پر لڑائی لڑی تو معاملہ طے ہو گیا ناں۔ فینشکا میری...... بھاوج بنے گی؟"

"مگر بھائی جان ارکادی کیا کہے گا؟"

"ارکادی؟ مجھ پر اعتبار کرو، وہ خوشی سے پھولا نہ سمائے گا۔ شادی اس کے اصولوں کے خلاف ضرور ہے، لیکن اس کا مساوات کا جو عقیدہ ہے، اس کی جو تسکین ہوگی اور بہر صورت طبقاتی امتیازات کی تک کیا ہے، پھر یہ کہ اس انیسویں صدی کے زمانے میں ذات پات کے امتیازات نبھ کیسے سکتے ہیں؟"

"پافل، پافل! میں ایک مرتبہ اور پیار کروں گا۔ ڈریئے مت میں احتیاط رکھوں گا۔" دونوں بھائی آپس میں بغلگیر ہو گئے۔

پافل پیئر وچ پوچھنے لگا "کیا خیال ہے تمہارا، اسی وقت اسے تم اپنے ارادے کی اطلاع کیوں نہ دے دو؟"

"ایسی جلدی کیا ہے؟ آپ کے درمیان کیا کچھ گفتگو ہوئی ہے؟"

"گفتگو ہمارے درمیان؟ چہ خوش!"

"خیر تو پھر ٹھیک ہے، پہلے آپ اچھے ہو جائیں، ابھی بہتیرا وقت پڑا ہے۔ ہمیں اچھی طرح سوچ سمجھ لینا چاہیے اور یہ لحاظ...."

"لیکن میرا خیال ہے کہ تم نے فیصلہ تو کر لیا ہے؟"

"ہاں، ہاں میرا تو فیصلہ ہے ہی اور میں تہ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب میں چلتا ہوں۔ آپ آرام کریں۔ بے چینی آپ کے لیے مضر ہے...... لیکن اس پر پھر بات ہو جائے گی۔ آپ اطمینان سے آرام کریں۔ خدا حافظ و ناصر ہے۔"

پافل پیئر وچ جب اکیلا رہ گیا تو سوچنے لگا "آخر وہ میرا اتنا احسان مند کیوں ہو رہا ہے۔ گویا یہ سب کچھ اس پر منحصر نہیں تھا۔ اس کی شادی ہوتے ہی میں تو یہاں سے چل

دوں گا۔ یہاں سے کہیں دُور چلا جاؤں گا.....ڈریسڈن کو یا فلورنس کو اور وہاں اس وقت تک رہوں گا.....''

پافل پیئر وچ نے پیشانی کو خوشبو سے نم کیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ اس کا حسین وجمیل اور نحیف سر سفید تکیے پر ٹکا ہوا تھا۔ دن کی تیز روشنی اس پر اپنا عکس ڈال رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ حسین وجمیل اور نحیف سر کسی مردے کا سر ہے.....اور واقعی وہ اب مردہ ہو چکا تھا۔

(25)

نکولسکو میں کاتیا اور ارکادی باغ میں دیودار کے ایک قدآور درخت کے سائے میں بیٹھے تھے۔ فیفی نے ان کے قریب ہی زمین پر قیام کر رکھا تھا۔ وہ اپنے چھریرے جسم کو بڑی خوبصورتی سے پیچ دے کر بیٹھا تھا۔ کتوں کے رسیا اِس انداز کو ''خرگوشیا انداز'' کہتے ہیں۔ ارکادی اور کاتیا دونوں خاموش تھے۔ ارکادی نے ایک ادھ کھلی کتاب ہاتھ میں لے رکھی تھی۔ کاتیا ایک ٹوکری میں سے روٹی کے بچے کھچے ریزے چن چن کر ان سے چڑیوں کی ایک مختصر سی ٹکڑی کو نواز رہی تھی۔ یہ چڑیاں اپنے اس مخصوص انداز میں' جس میں خوف اور ہٹ دھرمی دونوں ہی کا امتزاج ہوتا ہے' اس کے قدموں کے آس پاس پھدک رہی تھیں اور چوں چوں کر رہی تھیں۔ بادِصبا کے نرم جھونکے دیودار کی پتیوں سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے اور فیفی کی چکنی بادامی جلد پتیوں پر دھوپ کے میل سے جو مدھم سنہری دھبے پڑ گئے تھے' وہ اس کے اثر سے دھیرے دھیرے جھولا جھول رہے تھے۔ ارکادی اور کاتیا جہاں بیٹھے تھے' وہاں البتہ گھنا سایہ تھا۔ بس کبھی کبھی ایک چمکتی ہوئی دھاری کاتیا کے بالوں پر جھلملانے لگتی۔ دونوں چپ تھے' لیکن خاموشی کا یہ انداز خود اس کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ آپس میں بہت گھلے ملے ہیں۔ ایک دوسرے کے بارے میں تو شاید ان میں سے کوئی بھی نہیں سوچ رہا تھا' لیکن دل ہی دل میں وہ اِس قرب پر مگن ضرور تھے۔ اب تو ان کے چہرے ہی بدل چلے تھے۔ پچھلی مرتبہ جب ہم نے انہیں دیکھا تھا تو اس وقت ان کے چہروں پر یہ کیفیت

کہاں تھی۔ ارکادی کا چہرہ اب کچھ زیادہ ہشاش بشاش نظر آنے لگا تھا۔ کاتیا کا چہرہ بھی اب کچھ پہلے سے زیادہ ہی لودینے لگا تھا' پھر کچھ اس کے یہاں ہمت و جرأت کے آثار بھی نمایاں تھے۔

ارکادی کہنے لگا ''دیودار کو روسی زبان میں اگر ''یاسن'' کہتے ہیں تو درست ہی کہتے ہیں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟ جب ہوا چلتی ہے تو یہ درخت جس قدر منور اور شفاف نظر آنے لگتا ہے' شاید ہی کوئی دوسرا درخت نظر آتا ہو۔''

کاتیا نے نگاہیں اٹھا کر اوپر دیکھا اور بولی ''جی!'' اور ارکادی سوچنے لگا ''چلو یہ اچھا ہے کہ وہ میری شاعرانہ باتوں پر ملامت نہیں کرتی۔''

ارکادی نے ہاتھ میں ایک کتاب لے رکھی تھی۔ اسے دیکھ کر کاتیا کہنے لگی ''مجھے ہائنے کا نہ تو ہنسنا پسند ہے اور نہ رونا پسند ہے۔ البتہ جب وہ گمبھیر بن جاتا ہے یا جب اس پر افسردگی طاری ہوتی ہے' تو میں اسے پسند کرنے لگتی ہوں۔''

''اور مجھے اس کی ہنسی پسند ہے۔'' ارکادی بولا۔

''تمہیں طنز کرنے کی جو پرانی لت تھی' یہ اس کی بچی کھچی یادگار ہے'' (''بچی کھچی یادگار...'' ارکادی سوچنے لگا ''اگر بازاروف یہ سن لیتا تو؟'')

''ذرا دم لیجیے! ہم نے بھی تمہاری کایا نہ پلٹ دی تو بات نہیں ہے۔''

''کون میری کایا پلٹے گا؟ آپ؟''

''کون....؟ میری بہن! پورفری پلاتونوفش جن سے تم نے اب لڑنا بھڑنا چھوڑ دیا ہے۔ خالہ جان جنہیں تم پرسوں گرجا گھر لے کر گئے تھے۔''

''بھلا میں انکار کیسے کر دیتا اور جہاں تک اپنا سرگیونا کا معاملہ ہے تو تمہیں یاد ہوگا کہ انہوں نے بہت سی باتوں میں یوگین سے اتفاق کر لیا تھا۔''

''اس زمانے میں جس طرح تم پر ان کا اثر تھا' اسی طرح باجی جان پر بھی ان کا اثر قائم ہو گیا تھا۔''

''جس طرح مجھ پر اثر تھا؟ میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ کیا جناب نے یہ تحقیق فرمائی ہے کہ میں نے اس کا اثر دفع کر دیا ہے؟''

کا تیا چپ بیٹھی رہی۔

ارکادی نے بات کو پھر چلایا ''مجھے معلوم ہے کہ تمہیں وہ کبھی نہیں بھایا تھا۔''

''میری تو ان کے متعلق کوئی رائے ہی نہیں تھی۔''

''کاترینا سرگیونا تمہیں پتہ ہے کہ جب بھی میں یہ جواب سنتا ہوں' میں اسے ماننے سے انکار کر دیتا ہوں.....ایسا کوئی شخص تو ہے ہی نہیں' جس کے متعلق ہم میں سے ہر شخص کی کوئی نہ کوئی رائے نہ ہو۔ یہ تو گریز کا ایک طریقہ ہے۔''

''اچھا تو پھر میں یہ کہوں گی کہ میں...... یہ بات تو خیر نہیں ہے کہ ان سے میں متنفر ہوں۔ ہاں میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ وہ کسی اور ہی قماش کے آدمی ہیں اور میں ان سے مختلف ہوں.....اور تم بھی ان سے مختلف ہو۔''

''یہ کیسے؟''

''اب میں تمہیں کیسے بتاؤں؟.....وہ تو نرے جنگلی ہیں اور ہم تم ٹھہرے پالتو جانور۔''

''میں بھی پالتو جانور ہوں؟''

کا تیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ارکادی اپنا کان کھجانے لگا ''کاترینا سرگیونا میں تمہیں یہ بتائے دیتا ہوں۔ شاید تمہیں پتہ نہیں کہ یہ دراصل ایک قسم کی توہین ہے؟''

''اچھا تو تم جنگلی بننا چاہتے.....''

''جنگلی نہیں' بلکہ تنومند اور توانا۔''

''مگر اس کی تمنا بھی فضول ہی سی ہے۔ تم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ تمہارے دوست اس کی تمنا نہیں کرتے' بلکہ ان میں یہ صفت موجود ہے۔''

''ہوں! تو تمہارا خیال ہے کہ اینا سرگیونا پر اس کا بڑا اثر تھا۔''

''جی! لیکن ان پر زیادہ دیر تک کوئی بھی اپنا رنگ قائم نہیں رکھ سکتا۔'' کا تیا نے دھیرے سے جواب دیا۔

''تمہارا یہ خیال کس وجہ سے ہے؟''

''ان میں رعونت بہت ہے.....میرا مطلب یہ نہیں ہے.....انہیں اپنی آزادی اور

خود مختاری کا بڑا خیال ہے۔''

''خیال کسے نہیں ہوتا؟'' ارکادی نے سوال کیا اور ایک خیال بجلی کی طرح اس کے دماغ میں دوڑ گیا ''آخر اس کا فائدہ کیا ہے؟'' حیرت کی بات یہ ہے کہ کاتیا کے دماغ میں بھی اس وقت یہی خیال وارد ہوا ''آخر اس کا فائدہ کیا ہے؟'' جب نوجوانوں کا آپس میں ربط وضبط بڑھتا ہے تو ایک ہی قسم کے خیالات سے ان کی مڈھ بھیڑ ہوتی ہے۔

ارکادی مسکرانے لگا اور کاتیا کے ذرا قریب سرک کر چپکے سے بولا ''مان لوناں کہ تم ان سے ذرا ڈرتی ہو۔''

''کن سے؟''

''انہیں سے؟'' ارکادی نے پُرمعنی انداز میں اپنے الفاظ دہرائے۔

''اور اپنے متعلق جناب کا کیا خیال ہے؟'' کاتیا نے وہی سوال اس سے کر ڈالا۔

''میں بھی۔ ذرا غور کرو میں نے کہا کیا ہے۔ میں 'بھی'۔''

کاتیا انگلی چلاتے ہوئے کہنے لگی ''مجھے اس پر حیرت ہوتی ہے کہ باجی جان ابھی ان دنوں میں تم پر جس قدر مہربان ہوئی ہیں' پہلے کبھی نہیں ہوئی تھیں۔ جب تم پہلے پہلے آئے تھے اس کے مقابلے میں اب وہ کہیں زیادہ تم پر مہربان ہیں۔''

''واقعی؟''

''اچھا! تم نے اس پر غور نہیں کیا؟ تمہیں اس کی خوشی نہیں ہے؟''

ارکادی سوچ میں پڑ گیا۔

''میرے متعلق اینا سرگیونا کی رائے اچھی کیونکر ہوگئی؟ کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں ہے کہ میں نے تمہاری والدہ کے خط لا کر انہیں دیئے ہیں؟''

''یہ وجہ ہے اور دوسری وجوہات بھی ہیں' جن کا میں تم سے ذکر نہیں کروں گی۔''

''کیوں؟''

''میں بتاؤں گی نہیں۔''

''ہوں! میں جانتا ہوں تم بڑی ڈھیٹ ہو۔''

''ہاں' ہوں!''

''اور تیز نظر بھی ہو۔''

کاتیا نے نظر بھر کر ارکادی کو دیکھا ''یوں بھی سہی۔تم کیوں برہم ہو؟ تم سوچ کیا رہے ہو؟''

''مجھے تعجب یہ ہو رہا ہے کہ تم اتنی تیز نظر کیسے ہو گئیں۔ یوں تم بڑی شرمیلی ہو' بڑی لی دی رہتی ہو۔ آدمی کو چار کھونٹ دُور رکھتی ہو۔''

''میں زیادہ تر اکیلی ہی رہی ہوں۔ اس پر لوگ سوچ میں پڑ جاتے ہیں' لیکن کیا واقعی میں ہر ایک سے لی دی رہتی ہوں۔''

ارکادی نے شکر گزارانداز میں کاتیا کو دیکھا۔

کہنے لگا ''یہ درست ہے مگر تم جیسی حیثیت والے میرا مطلب ہے کہ جن کے حالات ایسے ہوتے ہیں' جیسے تمہارے ہیں' وہ بالعموم اس قسم کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں۔ راجاؤں مہاراجاؤں کی طرح وہ بھی حقیقت سے دُور ہی رہتے ہیں۔''

''لیکن میں امیر تو نہیں ہوں۔''

ارکادی سٹپٹا گیا۔ کاتیا کی بات فوراً اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اچانک اسے خیال آیا ''ہاں! یہ ساری جائداد تو اس کی بہن کی ہے۔'' یہ خیال اس کے لیے کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھا۔ آخر اس نے اظہار رائے کر ہی ڈالا ''واہ کس خوبی سے آپ نے یہ بات کہی ہے۔''

''کیا بات؟''

''آپ نے تو خواہ مخواہ کی شرمندگی محسوس کی' نہ ڈینگیں ماریں۔ بڑی سادگی اور صفائی سے ایک بات کہہ دی۔ بات سے بات نکلتی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ جو شخص یہ جانتا ہے اور یہ کہتا ہے میں غریب ہوں' وہ ہمیشہ ایک طرح کا فخر محسوس کرتا ہے۔''

''باجی جان کو اللہ سلامت رکھے' مجھے تو کبھی ایسے تجربے سے دوچار ہونا پڑا نہیں ہے۔ ذکر میں ذکر نکل آیا تھا' اس لیے میں نے اپنی حیثیت کا ذکر کر دیا۔''

''درست ہے' لیکن تمہیں یہ مان لینا چاہیے کہ جس فخر و غرور کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے' وہ تم میں موجود ہے۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً آپ..... جسارت کی معافی چاہتا ہوں..... آپ کسی امیر آدمی سے شادی نہیں کریں گی۔ میرا قیاس یہی کہتا ہے یا آپ کرلیں گی؟''

''بشرطیکہ مجھے اس سے بڑی محبت ہو..... نہیں میرا خیال ہے کہ اس صورت میں بھی اس سے شادی نہیں کروں گی۔''

''دیکھا' میں جو کہتا تھا۔'' ارکادی پھڑک کر بولا اور ذرا تامل کر کے کہنے لگا۔ ''اور آخر تم اس سے شادی کیوں نہیں کرو گی؟''

''اس لیے کہ عشقیہ نظموں تک میں بھی امیر اور غریب کی محبت کا انجام المناک ہی دکھایا جاتا ہے۔''

''تم حکم چلانا چاہتی ہو یا شاید......''

''نہیں جی! میں کیوں حکم چلانے لگی ہوں۔ اس کے برخلاف میں تو فرمانبرداری پر بھی آمادہ ہوں' لیکن امیری غریبی کا فرق برداشت نہیں ہوتا۔ کسی ذات کا احترام اور فرمانبرداری..... یہ بات تو میری سمجھ میں آتی ہے۔ اسے مسرت کہتے ہیں۔ لیکن.... تابعداری کی زندگی..... یہ اب زیادہ اپنے بس کی نہیں ہے۔''

''یہ اب زیادہ اپنے بس کی نہیں ہے۔'' ارکادی نے اس کا فقرہ اب لپک لیا تھا۔ ''جی! خوب' آخر کو تو تم اینا سرگیونا کی بہن ہو۔ خون تو وہی ہے تم میں بھی' اتنی ہی خودمختاری کی بو ہے' لیکن تم ذرا کم گو ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے احساسات میں کتنی ہی شدت کیوں نہ ہو اور کتنی ہی پاکیزگی کیوں نہ ہو' تم ان کے اظہار میں پہل کبھی نہیں کرو گی۔''

''آخر تم اب کیا چاہتے ہو؟'' کاتیا نے سوال کر ہی ڈالا۔

''تم بھی اتنی ہی دانا بینا ہو اور اگر زیادہ نہیں تو کم از کم اس حد تک تم میں کردار ضرور موجود ہے۔''

کاتیا نے جلدی سے بات کاٹ دی ''بس جناب رحم کیجیے! میری بہن کے ساتھ میرے موازنے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرے لیے ایک اچھی خاصی مصیبت ہے۔ آپ شاید یہ بھول رہے ہیں کہ میری بہن کے حسن اور دانشمندی اور..... اور پھر اور بھی کوئی نہیں آپ

ارکادی نکولائی وچ! آپ کو تو ایسی باتیں اور پھر ایسا منہ بنا کر نہیں کہنی چاہئیں۔"

"اور بھی کوئی نہیں آپ......اس سے تمہارا کیا مطلب ہے اور یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں مذاق کر رہا ہوں؟"

"اور کیا مذاق تو کر ہی رہے ہو!"

"تو تمہارا یہ خیال ہے؟ لیکن اگر میں دل سے یہ بات کہہ رہا ہوں تو؟ اور یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ میں نے زیادہ زوردار الفاظ میں یہ بات نہیں کہی ہے۔"

"میں تمہاری بات نہیں سمجھی۔"

"واقعی؟ اچھا تو اب پتہ چلا۔ تم اتنی تیز نظر ہو نہیں۔ میں نے تمہیں کچھ زیادہ سمجھا تھا۔"

"کیسے؟"

ارکادی نے کوئی جواب نہیں دیا اور اُدھر سے منہ پھیر لیا اور کاتیا نے ٹوکری میں سے چند اور ریزے بین کر چڑیوں کو ڈالنے شروع کر دیئے' لیکن اس نے اپنے بازو کو اتنی زور سے جھٹکا کہ وہ پھر سے اڑ گئیں۔ ان غریبوں سے اِتنا بھی تو نہ ہوسکا کہ ریزوں کو چونچوں میں دبا کر ہی اڑتیں۔

"کاترینا سرگیونا۔" ارکادی اچانک شروع ہو گیا "شاید تمہارے لیے تو یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی' لیکن مجھے تو کہہ ہی دینا چاہیے۔ ایک تمہاری بہن ہی کیا' دنیا کی ہر چیز پر میں تمہیں فوقیت دیتا ہوں۔"

وہاں سے اٹھ کر وہ اِس عجلت سے چلا گویا اس کے منہ سے جو الفاظ نکل گئے ہیں' ان سے وہ ڈر گیا ہے۔

کاتیا کے دونوں ہاتھ مع ٹوکری کے اس کی گود میں آن ٹکے۔ اس کا سر جھک گیا۔ بڑی دیر تک وہ ارکادی کو جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ رفتہ رفتہ اس کے رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی پھیلتی چلی گئی' لیکن اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے آثار مطلق پیدا نہیں ہوئے اور اس کی سیاہ آنکھوں میں تذبذب اور تذبذب کے علاوہ ایک بے نام کیفیت جھلک رہی تھی۔

اتنے میں قریب سے اینا سرگیونا کی آواز آئی "اکیلی بیٹھی ہو؟ میں سمجھی تھی کہ تم

ارکادی کے ساتھ باغ گئی ہو۔"

کاتیا نے بہت آہستگی سے نگاہیں اٹھا کر بہن کو دیکھا (بڑے اہتمام اور تکلف سے زرق برق لباس پہنے وہ راستے میں کھڑی تھی اور اپنی کھلی ہوئی چھتری کی نوک سے فیفی کے کانوں کو چھیڑ رہی تھی) اور آہستگی سے جواب دیا "جی اکیلی ہوں!"

اس نے مسکرا کر جواب دیا "اچھا تو وہ شاید اپنے کمرے میں چلے گئے ہیں۔"

"جی!"

"تم دونوں ساتھ پڑھ رہے تھے ناں؟"

"جی!"

اینا سرگیونا نے کاتیا کی ٹھوڑی تھام لی اور اس کا چہرہ اوپر کرتے ہوئے بولی "لڑائی تو نہیں ہوئی ہے ناں؟"

"نہیں!" اور یہ کہہ کر کاتیا نے بڑی آہستگی سے بہن کا ہاتھ ہٹا دیا۔

"بڑی سنجیدگی سے جواب دیتی ہو۔ مجھے تو یہ امید تھی کہ وہ یہاں ہوں گے۔ میرا مطلب تھا کہ ان سے کہتی چلئے میرے ساتھ چہل قدمی کو۔ اسی بات کی تو انہیں آرزو رہتی تھی۔ قصبے سے تمہارے لیے جوتے آئے ہیں۔ جاؤ انہیں پہن کر دیکھ لو۔ میں نے کل یہ دیکھا تھا کہ تمہارے یہ جوتے اب بہت پرانے ہو گئے ہیں۔ تمہیں تو اس کی سدھ ہی نہیں رہتی۔ تمہارے پیر ہیں بڑے ننھے منے اور خوبصورت۔ تمہارے ہاتھ بھی اچھے ہیں.... اگرچہ ذرا بڑے ہیں' اس لیے تمہیں اپنے ننھے پیروں سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیے' مگر تم سے نمائش کرنی تو آتی ہی نہیں۔"

اینا سرگیونا آگے بڑھ گئی۔ اس کے حسین و جمیل لباس کی ہلکی سرسراہٹ تھوڑی دیر تک محسوس ہوتی رہی۔ کاتیا ہائنے کی کتاب لے کر گھاس سے اٹھ کھڑی ہوئی اور وہاں سے چل دی..... لیکن اپنے جوتے لینے وہ نہیں گئی۔

"ننھے منے خوبصورت پیر" جب وہ چبوترے کی پتھر کی سیڑھیوں پر چڑھ رہی تھی تو ایک یہ خیال تھا' جو بار بار اس کے ذہن میں گونج رہا تھا اور سیڑھیوں کی کیفیت یہ تھی کہ دھوپ کی تپش سے بے طرح تپ رہی تھیں اور اس کے ذہن میں پھر ایک خیال

وارد ہوا" آپ انہیں ننھے منے خوبصورت پیر کہتی ہیں.....اچھا تو ایک دن اِن پیروں پر اس کا سر ہوگا۔"

لیکن پھر فوراً ہی وہ شرم سے عرق عرق ہوگئی اور اس نے بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔

ارکادی برآمدے سے ہوتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ خانساماں لپک کر اس کے پاس پہنچا اور بولا کہ اس کے کمرے میں بازاروف آئے ہیں۔

ارکادی کچھ بولا گیا۔ وہ بڑبڑانے لگا" یوگین! کیا آئے ہوئے بہت دیر ہوئی؟"

" جناب وہ بس ابھی آئے ہیں اور ان کا حکم یہ ہے کہ اپنا سر گیونا کو ان کے آنے کی اطلاع نہ دی جائے' بلکہ براہِ راست آپ کو بلایا جائے۔"

ارکادی سوچنے لگا" کیا گھر پر کوئی بات ہوگئی؟" اور لپک جھپک وہ سیڑھیوں کو پھلانگتا ہوا چلا اور جاکر بے تحاشا دروازہ کھولا۔ بازاروف کو دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا' حالانکہ کوئی ذرا زیادہ تجربہ کار ہوتا تو فوراً تاڑ جاتا کہ اِس اچانک نازل ہونے والے مہمان کے چہرے پر حرارت کے آثار سہی' لیکن یہ کہ وہ بہت سونت گیا اور یہ کہ اس شخص کی روح میں ضرور کوئی ہنگامہ بپا ہے۔ گرد میں اٹا ہوا ایک لبادہ کاندھوں پر ڈالے ٹوپی پہنے وہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ارکادی نے بڑے جوش وخروش سے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالے تھے' لیکن وہ پھر بھی کھڑا نہیں ہوا۔

" یار تم تو اچانک آ گئے۔ خوب آئے' کیسے آئے؟" بار بار وہ یہ فقرہ کہتا تھا اور کمرے میں کچھ اس شخص کے انداز میں سٹر پٹر کرتا پھر رہا تھا' جو اپنے آپ کو مسرور تصور کرتا ہے اور سرور کا مظاہرہ بھی کرنا چاہتا ہے۔" گھر پر تو سب خیریت ہے؟ سب ٹھیک ہی ہوں گے' ہیں نا؟"

بازاروف بولا" یوں سب خیریت ہے' مگر خیریت سے سب نہیں ہیں' خیر یہ باتیں ذرا بند کرو اور میرے لیے شراب منگا لو اور پھر آرام سے بیٹھ کر سنو۔ میں مختصر لیکن خاصے زوردار فقروں میں ساری داستان سناؤں گا۔"

بازاروف جب تک پافل پیئر وچ سے اپنے مقابلے کا ذکر کرتا رہا' ارکادی چپ

بیٹھا رہا۔ اسے حیرانی بھی ہوئی اور افسوس بھی، لیکن اس نے اس کا اظہار ضروری نہیں سمجھا۔ اس نے صرف اتنا پوچھا کہ اس کے تایا کے گہرا گھاؤ تو نہیں آیا ہے؟ جواب ملا کہ نہیں مگر معاملہ دلچسپ ضرور ہے، لیکن طبی نقطۂ نگاہ سے نہیں۔ اس پر ارکادی تکلفاً مسکرا دیا، لیکن دل میں اسے افسوس بھی ہوا اور ندامت بھی۔ بازاروف نے غالباً اس کے دل کی بات سمجھ لی تھی۔

کہنے لگا ''پیارے! دیکھ لو ان سامنتی زمانے کے لوگوں کے ساتھ رہنے کا انجام کیا ہوتا ہے۔ تم خود سامنتی زمانے کے آدمی بن کر رہ جاتے ہو اور نوابی تماشوں میں حصہ لینے لگتے ہو۔'' اور پھر بحث کو سمیٹتے ہوئے اس نے کہا ''اب میں اپنے باپ کے یہاں چلتا ہوں۔ راستے میں اتر پڑا تھا۔ سوچا تھا کہ یہ سب تمہیں سناتا چلوں، اگرچہ میں اسے محض حماقت سمجھتا ہوں۔ نہیں، میں بس یہاں اتر ہی پڑا، جانے کیوں۔ بعض وقت اس بات کی ضرورت پیش آتی ہے کہ آدمی اپنی گردن پکڑ کر اپنے آپ کو کسی فضا سے یوں منقطع کرے جیسے مولی کو کھیت سے اکھاڑ لیا جاتا ہے۔ یہی کچھ میں کرتا رہا ہوں..... لیکن جس فضا سے میں ناتہ توڑ رہا ہوں، جس کھیت سے میں اپنے آپ کو اکھاڑ رہا ہوں، اس پر ایک مرتبہ اور نظر ڈال لینی چاہتا ہوں۔''

ارکادی نے ذرا جوش میں آ کر جواب دیا ''مجھے امید ہے کہ ان الفاظ کا اشارہ میری طرف نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم مجھ سے ناتہ توڑنے کا ارادہ نہیں رکھتے ہو۔''

بازاروف ٹکٹکی باندھ کر بڑی تیز نگاہوں سے اسے گھورنے لگا ''تمہیں ایسا ہی تو اس کا غم ہوگا نا؟ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ تم نے پہلے ہی مجھے چھوڑ دیا ہے۔ ماشاءاللہ خوب چاق چوبند ہو رہے ہو..... اینا سرگیونا سے معاملہ سنٹ گیا معلوم ہوتا ہے۔''

''اینا سرگیونا سے معاملہ سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''اچھا، بچو کیا تم اس کی خاطر یہاں نہیں آئے ہو؟ ہاں سر راہے یہ تو بتاتے چلو کہ ان سنڈے اسکولوں کا کیا حال ہے؟ تم مجھ سے یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم اس سے محبت نہیں کرتے؟ یا تم اختیار اور مرضی کی منزل پر پہنچ گئے ہو؟''

''یوگین تم جانتے ہو کہ میں نے تم سے کبھی کوئی بات چھپا کر نہیں رکھی۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔''

بازاروف دبی آواز میں بولا ''ہوں' یہ ایک نیا افسانہ ہوا۔ مگر تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپن تو اِن باتوں سے مطلق بے نیاز ہو چکے ہیں۔ ایک جذباتی آدمی تو یہی کہے گا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے اور تمہارے راستے الگ ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر میں تو سیدھے سادے انداز میں یہ کہوں گا کہ ہم ایک دوسرے سے تنگ آ چکے ہیں۔''

''یوگین.....!!''

''میری جان! اس میں ایسا ہرج ہی کیا ہے۔ یہ تو خیر بات کیا ہے لوگ زندگی میں بڑی بڑی چیزوں سے اکتا جاتے ہیں اور اچھا اب ہمیں چاہیے کہ گلے ملیں اور ایک دو تین ہو جائیں' ہیں نا؟ جب سے میں یہاں آیا ہوں طبیعت کچھ منغض سی ہو رہی ہے' گویا گوگول نے لیڈی کالگا کے بارے میں جو لفاظی کی ہے' اسے میں پڑھ رہا ہوں۔ ہاں میں نے گاڑی واپس نہیں کی ہے۔''

''یہ تو تم غضب کر رہے ہو۔''

''کیوں؟''

''خیر میں تو دم مار کے بیٹھ رہوں گا' لیکن ایناسرگوینا کے ساتھ یہ بڑی بدسلوکی کا مظاہرہ ہوگا۔ وہ یقیناً تم سے ملنے کی آرزومند ہوں گی۔''

''بس یہ تمہاری چُوک ہے۔''

ارکادی نے پلٹ کر جواب دیا ''اس کے برعکس مجھے یقین ہے کہ میں درست کہہ رہا ہوں اور یہ تم کیا بہانہ بازی کر رہے ہو؟ اگر یہی بات ہے تو بولو کیا تم خود اس کی خاطر یہاں نہیں آئے ہو؟''

''ہو سکتا ہے' مگر تمہیں بہر صورت غلط فہمی ہوئی ہے۔''

لیکن ارکادی سچ کہتا تھا۔ ایناسرگیونا بازاروف سے ملنے کی خواہشمند تھی۔ اس نے خانساماں کے ہاتھ اسے بلا بھیجا۔ بازاروف نے جانے سے پہلے اپنے کپڑے بدلے۔ پتہ یہ چلا کہ اس نے اپنا سوٹ اس انداز سے سامان میں باندھا تھا کہ موقع پڑنے پر آسانی سے اسے نکال لیا جائے۔

مادام اودن تسوف اس سے اس کمرے میں نہیں ملی، جہاں اس نے قطعی غیر متوقع طور پر اس سے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ اس نے اس سے ڈرائنگ روم میں ملاقات کی۔ اس نے بڑے اخلاق سے اپنی انگلیاں اس کی طرف بڑھائیں، لیکن اس کا چہرہ ایک شدت کی کیفیت کی غمازی کر رہا تھا۔

بازاروف جھٹ سے بولا ''ایناسرگیونا! سب سے پہلے میں آپ کی پریشانی رفع کر دینا چاہتا ہوں۔ اس وقت آپ کی خدمت میں جو غریب و مسکین شخص حاضر ہوا ہے، مدت ہوئی اس کا دماغ ٹھکانے آ چکا ہے۔ مجھے امید ہے کہ دوسرے لوگ بھی اپنی حماقتوں کو فراموش کر چکے ہوں گے۔ میں بہت دنوں کے لیے یہاں سے جا رہا ہوں اور معاف کیجیے گا اگرچہ میں ایسا رقیق القلب آدمی نہیں ہوں، پھر بھی یہ خیال میرے لیے بڑا خوش کن ثابت ہوگا کہ آپ نفرت وحقارت سے مجھے یاد کرتی ہیں۔''

ایناسرگیونا نے کچھ اس انداز سے گہرا سانس لیا، جیسے کوئی کسی اونچے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر سانس لیتا ہے۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے پھر بازاروف کی طرف ہاتھ بڑھایا اور جواباً اس کے ہاتھ کو دبایا۔

کہنے لگی ''گڑے مردے کیوں اکھیڑتے ہو۔ جو ہوا سو ہوا۔ آپ سے زیادہ میں معذرت پر آمادہ ہوں، اس لیے کہ میرا ضمیر یہ کہتا ہے کہ غلطی میری بھی تھی۔ اسے نخریا پاپن سمجھ لیجیے یا کچھ اور... قصہ مختصر اب ہمیں پہلے کی طرح پھر دوست بن جانا چاہیے۔ وہ ایک خواب ہی تو تھا، نہیں تو اور کیا تھا؟ اور خوابوں کو کون یاد رکھتا ہے؟''

''انہیں کون یاد رکھتا ہے؟''

''انہیں کون یاد رکھتا ہے؟ اور اس کے علاوہ محبت..... آپ جانتی ہیں کہ بس ایک خودساختہ سا جذبہ ہے۔''

''واقعی؟ یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی۔''

اس انداز میں ایناسرگیونا نے گفتگو کی اور اس انداز میں بازاروف نے گفتگو کی۔ دونوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ وہ سچ بول رہے ہیں۔ کیا ان کے الفاظ میں سچائی، پوری سچائی موجود تھی؟ خود یہ لوگ یہ نہیں بتا سکتے تھے۔ غریب مصنف تو خیر کس گنتی میں ہے، لیکن ان

کے درمیان گفتگو قطعی طور پر اس انداز میں ہوئی گویا کہ وہ ایک دوسرے کی بات کو پورے طور پر مانتے ہیں۔

اینا سر گیونا نے منجملہ اور باتوں کے بازاروف سے یہ بھی پوچھا کہ کرسانوف کے یہاں وہ کیا کرتا رہا تھا۔ پافل پیئر وچ سے مقابلے کی بات اس کے منہ پر آ گئی تھی۔ مگر وہ پھر یہ سوچ کر رُک گیا کہ کہیں اینا سر گیونا کو یہ خیال پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے ذکر میں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے یہی جواب دے دیا کہ میں ہر وقت کام میں غرق رہتا تھا۔

اینا سر گیونا نے جواب دیا ''اور میری سنئے' پہلے تو مجھ پر افسردگی کا دورہ پڑا۔ یہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ کیوں۔ میں نے تو سیر و سیاحت کے منصوبے باندھے تھے۔ ذرا غور کیجیے..... مگر پھر بات آئی گئی ہو گئی۔ آپ کے دوست ارکادی نکولائچ آ گئے۔ میں اپنے پچھلے روزمرہ کے کاموں میں پھر پڑ گئی اور اپنے اصلی راستے پر پھر آ گئی۔''

''میں یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ وہ اصلی راستہ کون سا ہے؟''

''ماں' خالہ' بزرگ —— بس کچھ بھی سمجھ لو۔ ہاں آپ کو پتہ ہے کہ میں نے آپ کی اور ارکادی نکولائچ کی گاڑھی دوستی کی طرف کبھی توجہ نہیں کی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ یہ تو یونہی سا ہے' لیکن اب مجھے اس سے ذرا زیادہ واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ وہ تو خاصا عقلمند..... اور پھر وہ نوجوان ہے۔ وہ نوجوان ہے..... یہ بڑی بات ہے.... یوگین وسل یوچ! وہ ہماری آپ کی طرح نہیں ہے۔''

بازاروف نے سوال کیا ''کیا وہ آپ کے سامنے اب تک جھینپتا ہے؟''

''اچھا تو وہ جھینپتا تھا؟''..... اینا سر گیونا نے تھوڑی دیر تامل کیا اور پھر کہنے لگی ''اس میں اب زیادہ خود اعتمادی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ مجھ سے باتیں کرتا ہے۔ پہلے تو وہ مجھ سے کچھ دُور دُور رہتا تھا۔ اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ میں بھی اس کا قرب نہیں چاہتی تھی۔ اس کی دراصل کاتیا سے زیادہ بنتی ہے۔''

بازاروف کو بہت تاؤ آیا۔ وہ سوچنے لگا ''عورت کمبخت کبھی چھل فریب سے باز نہیں رہ سکتی۔'' پھر اس نے بڑی پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بلند آواز میں کہا ''آپ کہتی

ہیں وہ آپ سے دُور دُور رہتا تھا، لیکن غالباً یہ بات تو آپ سے چھپی ہوئی نہیں ہوگی کہ وہ آپ کے عشق میں گرفتار تھا؟''

اور اینا سرگیونا کے منہ سے بے ساختہ نکلا ''اچھا تو وہ بھی؟''

بازاروف نے بڑی انکساری سے جھک کر جواب دیا ''جی وہ بھی! گویا آپ تو جانتی ہی نہیں ہیں اور میں نے آپ سے کوئی نئی بات کہی ہے۔''

اینا سرگیونا کی آنکھیں جھک گئیں۔ ''یوگین وسل یوچ! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''میں تو یہی خیال کرتا ہوں کہ مجھے کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہوئی ہے، لیکن غالباً مجھے اس کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' پھر وہ دل میں کہنے لگا ''اور آئندہ کبھی مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرنا۔''

''آخر کیوں نہیں؟ لیکن میرا خیال ہے کہ یہاں بھی آپ ایک وقتی سے تاثر کو بہت زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔ مجھے یہ شک ہونے لگا ہے کہ آپ مبالغہ بہت کرتے ہیں۔''

''اینا سرگیونا! ہم یہ گفتگو ہی نہ کریں تو زیادہ اچھا ہو۔''

''آخر کیوں؟'' اس نے پلٹ کر جواب دیا، لیکن وہ خود ذکر دوسری طرف لے گئی۔ دراصل وہ بازاروف کی موجودگی میں اب تک کچھ بے کلی سی محسوس کر رہی تھی۔ اگرچہ اس نے اس سے یہی کہا تھا اور یہی یقین دلایا تھا کہ ساری پچھلی باتیں فراموش کر دی گئی ہیں۔ معمولی سے معمولی فقرہ کہتے وقت، بلکہ اس سے مذاق کرتے وقت بھی اس کے دل میں دہشت کی ایک ہلکی سی پرچھائیں کانپ جاتی تھی۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ سمندر میں چلتے ہوئے سٹیمر میں لوگ بڑی بے فکری سے ہنستے بولتے ہیں، ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ گویا کوئی بات ہی نہیں ہے، گویا وہ خشکی پر سفر کر رہے ہیں، لیکن ایک ذرا سا جھٹکا لگ جائے، معمول سے ہٹ کر ایک خفیف سی بات ہو جائے۔ پھر دیکھئے فوراً چہرے پر خوف و دہشت کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ خطرے کے ڈر سے ان کا دم نکلا جا رہا ہے۔

اینا سرگیونا سے بازاروف کی گفتگو زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ وہ خیالات کی رو میں بہنے لگی۔ کھوئے کھوئے انداز میں اس نے جواب دینے شروع کیے اور آخر کہنے لگی کہ ہال میں چلیئے۔ وہاں شہزادی صاحبہ اور کاتیا سے مڈھ بھیڑ ہوگئی۔ وہ پوچھنے لگی ''مگر ارکادی نکولا ئچ کہاں ہیں؟'' جواب ملا کہ ایک گھنٹہ ہوگیا حضرت نے صورت نہیں دکھائی ہے۔ اس نے یہ سن کر اسے بلا بھیجا۔ آسانی سے اس کا پتہ نہیں ملا۔ باغ کے ایک سب سے زیادہ گنجان حصے میں وہ جا چھپا تھا۔ اس نے ہاتھ باندھ کر ان پر اپنی ٹھوڑی ٹکالی تھی اور خیالات میں گم تھا۔ ان خیالات میں گمبھیرتا تھی، شدت تھی، لیکن حزن کی کیفیت نہیں تھی۔ اسے پتہ تھا کہ اینا سرگیونا بازاروف کے ساتھ اکیلی بیٹھی ہے۔ اسے پہلے تو اس پر رشک ہوتا تھا، لیکن آج اسے مطلق رشک نہیں ہوا۔ اس کے برخلاف اس کے چہرے پر آہستہ آہستہ ایک چمک پیدا ہوتی چلی گئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی خاص بات پر حیران بھی ہے، خوش بھی ہے اور عزم بھی کر رہا ہے۔

(26)

مرحوم اودن تسوف کو جدت طرازیوں کا ایسا شوق تو نہیں تھا، لیکن وہ تھوڑی بہت حد تک تو فنونِ لطیفہ کو برداشت کر ہی لیتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے باغ میں جھیل اور گرم خانے کے درمیان یونانی معبد کی طرز پر روسی اینٹوں سے ایک عمارت تعمیر کرائی تھی۔ اس مندر یا نگار خانے کے عقب میں سیاہ دیوار کے برابر مجسّمے نصب کرنے کے لیے چھ چبوترے بنائے گئے تھے اور اودن تسوف نے باہر سے اِن مجسّموں کے منگانے کا آرڈر بھیج دیا تھا۔ اِن مجسّموں میں خلوت، خاموشی، مراقبہ، افسردگی، عصمت اور احسان مندی کے تصورات کو پیش کیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک مجسمہ تو آ کر نصب بھی ہوگیا تھا۔ یہ خاموشی کی دیوی تھی، جس نے اپنی انگلی ہونٹوں میں داب رکھی تھی، لیکن اسی دن چند لڑکوں نے اس کی ناک شہید کر ڈالی اور اگرچہ پڑوس کے معمار نے یہ ذمہ لے لیا تھا کہ پرانی ناک سے اچھی ناک بنا دوں گا، لیکن اودن تسوف نے اسے وہاں سے ہٹوانے کا حکم دے ہی دیا۔ کھتے کے قریب ایک

کونے میں اب تک یہ مجسمہ دیکھا جا سکتا تھا۔ جانے کتنے سال اسے یہاں رکھے رکھے بیت گئے تھے' بلکہ اب تو وہ گاؤں کی توہم پرست عورتوں کے لیے ایک خوف و دہشت کی چیز بن کر رہ گیا تھا۔ مندر کے آگے کے حصے میں برسوں سے اونچی اونچی گھاس کھڑی تھی۔ ستونوں کی چوٹیاں بس گھاس سے اُوپر اُبھری ہوئی تھیں۔ مندر کی حالت یہ تھی کہ دوپہر کے وقت بھی سرد خانہ بنا رہتا تھا۔ اینا سرگیونا نے جب سے یہاں ایک سانپ دیکھ لیا تھا' اس وقت سے پھر اس نے اس طرف کا رُخ نہیں کیا' لیکن کاتیا اکثر و بیشتر اِدھر آ نکلتی تھی اور مجسمہ کے چبوتروں میں سے ایک چبورتے کے نیچے چوڑی سی سنگین نشست پر بیٹھ جایا کرتی تھی۔ یہاں اِس سایہ دار ٹھنڈے گوشے میں بیٹھ کر وہ پڑھنے لکھنے کا کام کرتی تھی یا پھر سکون و آسودگی کی اس کیفیت میں غرق ہو جاتی تھی' جس کی لذت سے ہم سب آشنا ہیں اور جس کی لذت کی کیفیت یہ ہے کہ آدمی وارفتہ سا ہو جاتا ہے اور گم سم بیٹھا زندگی کے اس بہتے ہوئے دھارے کے راگ کو سنتا رہتا ہے' جو ہمارے اردگرد اور ہمارے نفس کے اندر ہمیشہ موجزن رہتا ہے۔

بازاروف کی آمد کے دوسرے دن کا ذکر ہے کہ کاتیا اپنی اسی محبوب نشست پر بیٹھی تھی اور اس کے برابر ارکادی بیٹھا تھا۔ اس نے کاتیا کے ساتھ مندر چلنے کی درخواست کی تھی۔

کھانے میں ابھی گھنٹہ بھر کی دیر تھی۔ شبنمی صبح رخصت ہو چکی تھی اور اب گرمی زور باندھ رہی تھی۔ ارکادی کے چہرے پر اب تک وہی کیفیت باقی تھی' جو کل اس پر نظر آئی تھی۔ کاتیا صورت سے کچھ مصروف اور منہمک دکھائی دیتی تھی۔ صبح کی چائے کے فوراً بعد اس کی بہن نے اسے پہلے تو لپٹایا چپٹایا (کاتیا بہن کے اِس اقدام سے کچھ سہم جایا کرتی تھی) پھر نصیحت کی کہ دیکھو ارکادی سے زیادہ ملنے جلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خاص طور پر اس کے ساتھ اکیلے بیٹھ بیٹھ کر باتیں کرنا درست نہیں ہے۔ ورنہ خالہ جان اور گھر کے دوسرے لوگ دیکھیں گے اور انگلیاں اٹھائیں گے۔ اس کے علاوہ پچھلی شام کو بھی اینا سرگیونا کی طبیعت ذرا مکدر تھی اور خود کاتیا کا بھی دم الٹ الٹ کر آ رہا تھا۔ گویا اسے یہ احساس ستا رہا تھا کہ اس میں کوئی کمی ہے' کوئی خامی ہے۔ ارکادی کی منتوں کے آگے اس نے سر جھکا ہی دیا' لیکن

دل کو یہ تسلی دی کہ بس یہ آخری دفعہ ہے۔

''کاترینا سرگیونا'' یوں اس نے اپنی دانست میں بڑی بے تکلفی سے بات شروع کی تھی، مگر اس میں جھجک کا بھی رنگ شامل تھا۔ ''چونکہ مجھے آپ کے ساتھ ساتھ ایک ہی گھر میں رہنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے' اس لیے تم سے بہت سی باتوں پر گفتگو ہوئی' لیکن ایک ایسا سوال ہے بڑا اہم..... میرے لیے..... جس کا میں نے ابھی تک ذکر نہیں چھیڑا ہے۔ کل تم کہہ رہی تھیں کہ یہاں آ کر تم بدل گئے ہو۔'' کاتیا جس سوالیہ انداز میں اسے تک رہی تھی' اسے وہ تاڑ بھی رہا تھا اور اس سے نگاہیں بھی بچا رہا تھا' لیکن بولے چلا جا رہا تھا ''میں واقعی بہت بدل گیا ہوں اور دوسروں کی نسبت تم اس سے زیادہ واقف ہو۔ تم جس کی وجہ سے مجھ میں یہ ساری تبدیلی ہوئی ہے۔''

''میں؟..... میری وجہ سے؟.......''

''جب میں یہاں آیا تھا تو ایک فریب خوردہ لڑکا تھا' لیکن اب میں وہ فریب خوردہ لڑکا نہیں ہوں۔'' ارکادی پھر چل نکلا۔ ''عمر عزیز کے یہ 23 سال میں نے بھاڑ جھونکنے میں تو ضائع نہیں کیے ہیں۔ پہلے کی طرح اب بھی میری دلی خواہش یہی ہے کہ مفید بنوں' سچائی کے لیے اپنی ساری صلاحیتیں وقف کر دوں' لیکن میرے آدرشوں کا مقام اب بدل گیا ہے۔ وہ مجھے اب قریب..... بہت زیادہ قریب نظر آتا ہے۔ اب تک تو میں اپنے آپ ہی کو نہیں سمجھا تھا۔ میں ایسے کاموں میں الجھ گیا تھا' جن کے کرنے کی مجھ میں سکت نہیں تھی..... لیکن ایک خاص جذبے کو دعا دیجیے کہ اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں..... شاید میری باتیں کچھ الجھی ہوئی ہیں' لیکن میرا خیال ہے کہ تم میری بات سمجھ لو گی۔''

کاتیا کی نگاہیں ابھی تک اوپر نہیں اٹھی تھیں۔ وہ تو یوں بنی بیٹھی تھی گویا اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ وہ ابھی کسی اور بات کی منتظر تھی۔

ارکادی نے پھریری لی اور پھر شروع ہو گیا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم دنگ رہ جاؤ گی۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ اس جذبے کا تعلق..... ایک طور پر..... ایک طور پر..... تم سے ہے۔ تمہیں یاد ہو گا کل تم مجھ پر خفا ہو رہی تھیں کہ تم میں سنجیدگی کا فقدان ہے۔'' ارکادی غریب کی وہ حالت ہو رہی تھی' جیسے کوئی شخص دلدل میں پھنس گیا ہے اور جتنا وہ آگے بڑھتا

ہے، اتنا ہی اور نیچے دھنس جاتا ہے، لیکن اس امید میں دمادم آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے کہ وہ اب پار ہوا، اب پار ہوا۔'' اس خفگی کا شکار تو نوجوان اکثر بنتے ہیں۔ ایسی صورت میں بھی جب وہ اس کے مستحق نہ رہے ہوں اور اگر مجھے اپنے اوپر تھوڑا سا بھروسہ اور ہوتا......!''

(ارکادی مایوس ہو کر سوچ رہا تھا ''مدد، خدا کے لیے میری مدد کرو۔'' لیکن کاتیا نے سر اٹھا کر بھی نہ دیکھا) ''اگر مجھے یہ امید ہوتی.....''

اسی لمحہ اینا سرگیونا کی آواز سنائی دی ''جو کچھ آپ فرماتے ہیں، کاش مجھے اس کا یقین آ سکتا۔''

ارکادی کو تو بس فوراً سانپ سونگھ گیا اور کاتیا کا رنگ فق پڑ گیا۔ مندر کے برابر برابر جھاڑیوں کا جو ایک پردہ سا حائل تھا، اس کے برابر میں ایک چھوٹی سی پگڈنڈی چلی گئی تھی۔ اینا سرگیونا بازاروف کے ساتھ ساتھ چلی جا رہی تھی۔ کاتیا اور ارکادی انہیں دیکھ تو نہیں سکے، لیکن ان کا ایک ایک لفظ انہیں سنائی دے رہا تھا، بلکہ کپڑوں کی سرسراہٹ اور سانس کی آواز تک سنائی دے رہی تھی۔ وہ چند قدم چل کر رُک گئے، بلکہ یوں لگتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر مندر کے سامنے کھڑے ہو گئے ہیں۔

اینا سرگیونا کہہ رہی تھی ''دیکھئے! میں نے اور تم نے ایک غلطی کی ہے۔ اٹھتی ہوئی جوانی کا طوفان ہم دونوں کے سر سے گزر گیا ہے۔ بالخصوص میری صورت تو یہی ہے۔ ہم نے زندگی دیکھی ہے۔ ہم اس سے اکتا چکے ہیں اور بننا بنانا فضول بات ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم دونوں عقلمند ہیں۔ پہلے ہمیں ایک دوسرے سے دل بستگی ہوئی۔ اشتیاق پیدا ہوا.....اور پھر.....!!''

بازاروف بات کاٹتے ہوئے بولا ''اور پھر مجھ میں باسی پن پیدا ہو گیا۔''

''تمہیں معلوم ہے کہ ہماری غلط فہمی کی اصل وجہ یہ نہیں تھی۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو، تان تو یہاں آ کر ٹوٹتی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ضرورت مند نہیں ہیں۔ ہم میں کچھ بہت زیادہ.....مجھے کیسے یہ بات کہنی چاہیے ہم میں کچھ بہت زیادہ باہمی یکسانیت تھی۔ اس وقت فوراً اس کا احساس ہمیں نہیں ہوا۔ اب ارکادی......!!''

''آپ کو اس کی ضرورت ہے؟'' بازاروف نے پوچھا۔

''ہشت! یوگین وسل یوچ!! آپ تو مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ وہ تمہاری طرف سے بے اعتنائی نہیں برتتا اور مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا ہے کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اب میری وہ عمر ہے کہ اس کی خالہ کہلاؤں' لیکن میں تم سے یہ بات چھپانا نہیں چاہتی کہ مجھے اکثر و بیشتر اس کا خیال آیا ہے۔ اس طرح کی امنگوں بھرے تازہ جذبے میں ایک خاص کشش ہوتی ہے.....''

بازاروف بات کاٹتے ہوئے بولا ''اس موقع پر 'جادو' کا لفظ زیادہ موزوں رہے گا۔'' اس کی آواز رندھی ہوئی ضرور تھی' لیکن اس میں ایک ٹھہراؤ تھا اور اس آواز میں غصہ اور طیش بھی صاف جھلک رہا تھا۔ ''ارکادی کل مجھ سے کچھ چھپا رہا تھا۔ اس نے نہ تو آپ کی بات کی اور نہ آپ کی بہن کی باتیں کیں.......یہ خطرناک علامت ہے۔''

اینا سرگیونا نے جواب دیا ''کاتیا کے ساتھ اس کا بھائی کا سا معاملہ ہے اور مجھے اس کی یہ بات پسند ہے۔ اگرچہ شاید مجھے ان دونوں میں اس حد تک ربط و ضبط بڑھنے نہیں دینا چاہیے تھا۔''

''اس خیال کی تہ میں.....بہن کا جذبہ کام کر رہا ہے؟'' بازاروف ذرا آواز کو کھینچ کر بولا۔

''یقیناً.....لیکن ہم یہاں جمے کیوں کھڑے ہیں؟ آگے بڑھیں ناں۔ کیسی عجیب عجیب باتیں ہم کر رہے ہیں۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ میں اس طرح آپ سے باتیں کروں گی۔ آپ جانتے ہیں کہ میں آپ سے ڈرتی ہوں.....اور اسی کے ساتھ ساتھ مجھے آپ پر بھروسہ بھی ہے' اس لیے کہ آپ اصل میں بڑے اچھے آدمی ہیں۔''

''اوّل تو یہ کہ مجھ میں ذرّہ بھر بھی اچھائی نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اب میں آپ کی نظروں سے اُتر چکا ہوں اور آپ کہتی ہیں کہ آپ اچھے ہیں......یہ تو ایسی بات ہوئی کہ جنازے پر پھولوں کے ہار چڑھائے جائیں۔''

''یوگین وسل یوچ! اس کی ذمہ داری ہم پر تو نہیں ہے کہ.....'' اینا سرگیونا نے جانے کیا کہنا شروع کیا تھا کہ اتنے میں ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اس کی وجہ سے درخت کے

پتوں میں وہ کھلبلی پڑی کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دی۔ ''خیر! آپ کو اختیار ہے....''
بازاروف نے ایک ذرا تامل کے بعد اعلان کیا۔ اِن الفاظ کے علاوہ اور کچھ سنائی نہ دے سکا۔ واپس ہوتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی..... چاروں طرف ایک سکوت، ایک سناٹا چھا گیا۔

ارکادی کاتیا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اسی طرح بیٹھی تھی۔ ہاں اس کا سر اب ذرا اور نیچے جھک گیا تھا۔ ''کاترینا سرگیونا'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر سختی سے بھینچ لیں ''میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں کسی سے نہیں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم سے یہ پہلی اور آخری بات ہے۔ میں تم سے یہی کہنا چاہتا تھا۔ اپنے متعلق تمہاری رائے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میں ایسا امیر کبیر تو ہوں نہیں اور میں ہر قسم کی قربانی کے لیے آمادہ ہوں...... تم جواب نہیں دیتیں؟ تمہیں؟ مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟ تمہارا خیال ہے کہ میں یونہی بات کر رہا ہوں؟ لیکن ان پچھلے دنوں کو یاد کرو۔ کیا تم نے یہ محسوس نہیں کیا کہ میں ہر قسم کے اثر سے پاک ہو چکا ہوں۔ میری طرف دیکھو۔ بس ایک لفظ کہہ دو..... مجھے محبت ہے...... مجھے تم سے محبت ہے...... میرا یقین کرو۔''

کاتیا نے خوشی سے چمکتی ہوئی گمبھیر نگاہوں سے ارکادی کو دیکھا اور بڑے تذبذب کے بعد اک ذرا خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی ''جی!''

ارکادی اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑا ہو گیا ''جی! تم نے 'جی' کہا۔ جانتی ہو تم نے کیا کہا یعنی کہ یہ کہا کہ تم مجھے چاہتے ہو اور میں تمہارا اعتبار کرتی ہوں..... یا..... یا..... اب میں اس سے آگے کچھ نہیں کہہ سکتا.....''

''جی!'' کاتیا نے پھر کہا اور اس مرتبہ وہ اس کی پوری بات سمجھ گیا۔ اس نے اس کے حسین و جمیل ہاتھوں کو اپنی طرف کھینچا اور جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اس سے کھڑا ابھی مشکل ہی سے ہوا جا رہا تھا۔ بس بار بار یہی کہتا تھا ''کاتیا..... کاتیا.....'' اور وہ بڑے بھولپن سے رونے لگی اور پھر وہ اپنے آنسوؤں کو دیکھ کر مسکرا پڑی، جس کسی نے محبوب کی آنکھوں میں ایسے آنسو نہیں دیکھے، انہیں کیا پتہ کہ آدمی ایسے موقعوں پر منوں احسان کے نیچے دب جاتا ہے اور بس یہ سمجھنے لگتا ہے کہ پوری دنیا میں اس سے زیادہ خوش کوئی نہیں ہے۔

دوسرے دن صبح ہی صبح ایناسرگیونا نے بازاروف کو اپنے کمرے میں بلا بھیجا اور دبی دبی سی ہنسی ہنستے ہوئے ایک تہ کیا ہوا رقعہ اسے پکڑا دیا۔ یہ ارکادی کا رقعہ تھا۔ اس میں اس نے اس کی بہن سے شادی کی درخواست کی تھی۔

بازاروف نے دیکھتے دیکھتے سارا خط پڑھ ڈالا اور اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے سینے میں یکا یک جو بغض کی آگ بھڑک اٹھی ہے، اس کا اظہار ہو جائے۔ اس نے اس پر یوں تبصرہ کیا ''تو یہ بات ہے۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ کل ہی آپ یہ کہہ رہی تھیں کہ وہ کاتریناسرگیونا کو بھائیوں کی طرح چاہتا ہے۔ اب آپ کا ارادہ کیا ہے؟''

''آپ کا کیا مشورہ ہے؟'' ایناسرگیونا اب تک ہنسے جا رہی تھی۔

''میرا خیال یہ ہے۔'' بازاروف نے بھی ہنس کر ہی جواب دیا۔ اگرچہ وہ خوش ہرگز نہیں تھا۔ اس کے دل میں خواہ کوئی جذبہ کروٹ لے رہا ہو، بہر صورت وہ مسرت کا جذبہ نہیں تھا۔ پھر ہنسنے کا معاملہ بھی یہ تھا کہ جس حد تک ایناسرگیونا ہنس رہی تھی، اس سے زیادہ ہنسنے پر وہ مائل نہیں تھا۔ ''میرا خیال یہ ہے کہ تم دولہا دلہن کے پھولنے پھلنے کی دعا مانگو۔ ہر لحاظ سے یہ اچھا جوڑ ہے۔ کرسانوف کا کھاتا پیتا گھر ہے۔ اکلوتا بیٹا ہے۔ رہے والد صاحب تو وہ اللہ میاں کی گائے ہیں۔ وہ کسی قسم کی اڑچن نہیں لگائیں گے۔''

مادام اوون تسوف کمرے میں اُدھر جاتی تھی، اِدھر آتی تھی۔ اس کے چہرے پر کبھی تو سرخی دوڑ جاتی تھی اور کبھی رنگ زرد پڑ جاتا تھا۔ کہنے لگی ''تمہارا یہ خیال ہے۔ مجھے بھی کسی قسم کی دقت نظر نہیں آتی۔ کاتیا کی مجھے خوشی ہے..... اور ارکادی نکولائی وچ بھی۔ ہاں میں اس کے والد صاحب کے جواب کا ضرور انتظار کروں گی۔ میں خود اسے ان کی خدمت میں بھیجوں گی۔ مگر دیکھئے آپ کل میں آپ سے کہہ رہی تھی کہ ہم دونوں بوڑھے ہو گئے ہیں۔ وہ بات سچ ہی نکلی ناں..... میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہے کہ یہ ہوا کیسے۔ مجھے اسی پر تو رہ رہ کر حیرانی ہو رہی ہے۔'' ایناسرگیونا پھر ہنس پڑی اور جلدی سے اپنا منہ موڑ لیا۔

''نئی پود کے لوگ بڑے کائیاں ہو گئے ہیں۔'' یہ فقرہ کہہ کر بازاروف بھی ہنس پڑا۔ تھوڑے تامل کے بعد بولا ''اچھا رخصت! آپ معاملات کو خوش اسلوبی سے طے کریں

گی اور ہم دور بیٹھے بیٹھے خوش ہولیں گے۔''

مادام اودن تسوف جلدی سے مڑی ''آپ جا تو نہیں رہے ہیں؟ 'اب' آپ کیوں نہیں ٹھہرتے؟ ٹھہریئے گا.... آپ سے باتیں کرنے میں عجب اضطرابی کیفیت ہو جاتی ہے..... یوں معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کسی کھائی کے کنارے کنارے چل رہا ہے۔ شروع میں تو بیشک دل کانپنے لگتا ہے، لیکن جتنا آگے بڑھو، ہمت بندھتی چلی جاتی ہے۔ ٹھہریئے گاناں۔''

''اینا سرگیونا! آپ کی تجویز کا شکریہ!! اور آپ نے میرے باتونی ہونے پر جو داد دی ہے، اس کا بھی شکریہ، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ یہ میرا میدان نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں اس میں بہت دُور نکل آیا ہوں۔ مچھلیاں لاکھ اڑنے کی کوشش کریں، مگر وہ فضا میں ٹِک کتنی دیر سکتی ہیں۔ بالآخر انہیں پھر واپس پانی میں ہی غوطہ لگانا پڑتا ہے۔ تو مجھے بھی اب اجازت دیجیے۔ میں اپنی کھال میں واپس جاؤں۔''

مادام اودن تسوف بازاروف کو دیکھنے لگی۔ اس کے زرد چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی ''یہ شخص مجھ سے محبت کرتا تو تھا۔'' اسے اس پر ترس آ گیا اور بڑی ہمدردی اور رحم کے جذبے کے ساتھ اس نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

لیکن وہ بھی اس کی نیت کو تاڑ گیا تھا۔ ''نہیں!'' یہ کہتے ہوئے وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ''میں غریب آدمی ضرور ہوں، لیکن میں نے خیرات آج تک نہیں لی ہے۔ اچھا رخصت۔ آپ شاد رہیں، آباد رہیں۔ ہم چلے، الوداع۔''

اور نادانستہ طور پر اینا سرگیونا کے منہ سے نکلا ''مجھے یقین ہے کہ یہ ملاقات ہماری آخری ملاقات نہیں ہے۔''

بازاروف نے جواب دیا ''کیا ٹھکانا ہے کل کیا ہو!'' یہ کہہ کر اس نے سلام کیا اور یہ جا وہ جا۔

اسی دن اُس نے ارکادی سے یہ الفاظ کہے تھے ''اچھا تو تم اپنا گھر بسانے کی فکر میں ہو؟'' اس وقت وہ زمین پر بیٹھا اپنا صندوق بند کر رہا تھا۔ ''خیر بات تو معقول ہے، مگر اس میں اتنی بہانہ بازیوں کی کیا ضرورت تھی۔ دراصل میں کسی دوسرے میدان میں تم سے

ہنگامے کی توقع کر رہا تھا۔ غالبًا اس صورتحال نے تمہیں بھی اچانک ہی آلیا ہے؟''

ارکادی نے جواب دیا'' دراصل تم سے جدا ہوتے وقت مجھے بھی اس کی توقع نہیں تھی، مگر اسے 'معقول بات' کہہ کر تم خود کیوں بہانہ بازی کر رہے ہو۔ گویا مجھے خبر ہی نہیں ہے کہ شادی کے متعلق تمہارے خیالات کیا ہیں؟''

بازاروف بولا'' میری جان! تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ تم دیکھتے ہو میں کیا کر رہا ہوں۔ بکس میں کچھ جگہ خالی رہ گئی ہے، میں واں گھاس ٹھونس رہا ہوں۔ ہماری زندگی کے صندوق کا بھی یہی حال ہے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ خلا رہ جائے۔ خالی جگہ میں ہم کوئی نہ کوئی چیز ضرور ٹھونس لیتے ہیں۔ اس میں خفا ہونے کی بات نہیں ہے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ کارترینا سرگیونا کے متعلق میری رائے شروع ہی سے کیا تھی۔ بہت سی عورتیں محض اس وجہ سے عقلمند کہلاتی ہیں کہ وہ عقلمندی سے آہیں بھر سکتی ہیں۔ لیکن تمہاری عورت میں خوبی یہ ہے کہ وہ آہوں کو ضبط کر سکتی ہے اور اس خوبی سے ضبط کرے گی کہ تم کھڑے بیٹھے اس کا کلمہ پڑھو گے۔ مگر خیر یہ تو ہوا ہی کرتا ہے۔''اس نے صندوق بند کیا اور زمین سے اٹھ کھڑا ہوا۔''اور اب میں ایک مرتبہ پھر کہتا ہوں الوداع، اس لیے کہ اپنے آپ کو فریب دینا ایک بیکار سی بات ہے۔ ہم ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے ہیں۔ تم خود بھی یہ بات جانتے ہو..... تم نے بڑی عقلمندی کا کام کیا ہے۔ یہ کڑوی کسیلی تنہائی کی زندگی تو ہمارے مقدر میں ہے۔ تمہارا خمیر اس مٹی سے نہیں ہے۔ تم میں ولولہ نہیں ہے، نفرت کا جذبہ نہیں ہے، لیکن تم میں جوانی کا من چلا پن ہے۔ جوانی کی آگ ہے۔ تم ٹھہرے اشراف لوگ، تمہارے بس کا ہے کیا۔ شائستہ قسم کی اطاعت یا شائستہ قسم کا غصہ۔ اس کے علاوہ تم اور کیا کر سکتے ہو اور اس کا کوئی مصرف نہیں ہے۔ تم لڑنے سے کتراتے ہو اور سمجھتے ہو اپنے آپ کو سورما.... لیکن ہم نے لڑنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ہماری خاک سے تمہاری آنکھوں میں کھٹک پیدا ہو جائے گی۔ ہماری گرد تمہارے دامنوں کو آلودہ کر دے گی۔ تم دراصل ہمارے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ خودستائی تمہاری طبیعتوں میں رچ گئی ہے۔ تمہیں اپنے آپ پر ملامت کرنے میں بھی لطف آتا ہے، لیکن ہم اس چیز سے تنگ آچکے ہیں۔ ہم کچھ اور چاہتے ہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کو پیس ڈالیں۔ تم اچھے آدمی ہو، لیکن بہرصورت تم ایک جذبات پرست

اعتدال پسند زمیندار کے لاڈلے ہو۔''

ارکادی درد بھرے لہجے میں کہنے لگا ''یوگین! تم ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہورہے ہو۔ کیا تمہارے پاس مجھ سے کہنے کے لیے اور کوئی بات نہیں ہے؟''

بازاروف گردن کھجانے لگا ''ہاں' ہاں ارکادی کہنے کی اور باتیں بھی ہیں' مگر میں وہ باتیں نہیں کہوں گا' اس لیے کہ وہ محض جذبات پرستی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ نجاست ہے' گندگی ہے اور تم اب بیاہ جلد کر ڈالو اور اپنا گھر بساؤ اور پیٹ بھر کر بچے پیدا کرو۔ ان میں اس حد تک تو عقل ہوگی کہ وہ بہتر زمانے میں پیدا ہوں گے۔ ہم تم تو غلط وقت پر پیدا ہوئے ہیں۔ اچھا گھوڑے تیار ہیں۔ اچھا بھئی! وقت ہوگیا۔ میں ہر ایک سے رخصت ہولیا ہوں.... اب کیا باقی رہ جاتا ہے گلے ملنا؟''

ارکادی بڑھ کر اپنے سابق رہنما اور دوست کے گلے سے لپٹ گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

بازاروف بڑے اطمینان سے بولا ''اسے کہتے ہیں نوجوانی' لیکن مجھے کاترینا سرگیونا پر بھروسہ ہے۔ دیکھنا وہ کتنی جلدی تمہاری ڈھارس بندھاتی ہے۔ اچھا بھائی رخصت!!'' یہ الفاظ اس نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد کہے تھے۔ اصطبل کی چھت پر کووں کا ایک جوڑا بیٹھا تھا۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا ''یہ تمہارے کام کی بات ہے۔ اس کی پیروی کرو۔''

کیا مطلب ہے اس کا؟'' ارکادی نے پوچھا۔

''ہیں؟ نیچرل ہسٹری میں تم اتنے کمزور ہو۔ بھول گئے کہ کوا بڑا گھریلو قسم کا جانور ہوتا ہے۔ یہ تمہارے لیے ایک نمونہ ہے۔ اچھا پیارے سلام!!''

گاڑی کے پہیئے چوں چوں بولتے ہوئے چلنے لگے۔

بازاروف نے سچ ہی کہا تھا۔ اس شام کو جب وہ کاتیا سے باتیں کر رہا تھا تو اس کے ذہن سے اپنے سابق معلم کا خیال بالکل اتر چکا تھا۔ اس نے کاتیا کی تقلید شروع کر دی تھی۔ کاتیا کو اس کا احساس تھا' لیکن وہ اس پر متعجب نہیں تھی۔ دوسرے دن اسے نکولائی پیئر وچ سے ملنے میرینو جانا تھا۔ اینا سرگیونا ویسے یہ چاہتی تو نہیں تھی کہ لڑکی لڑکے کی

ملاقات میں مخل ہو، لیکن محض آداب کا لحاظ کرتے ہوئے بہت دیر تک وہ ان کے پاس بیٹھی رہی۔ یہ اس کی عالی حوصلگی تھی کہ اس نے خالہ جان کو ان کے راستے سے دُور ہی دُور رکھا۔ انہیں جب مجوزہ شادی کی اطلاع ملی تو وہ تو جلتے انگاروں پر لوٹنے لگیں۔ ایناسرگیونا کو شروع میں یہ اندیشہ ہوا تھا کہ کہیں ان کی خوشی وشادمانی اس کے لیے ایک آزمائش نہ بن جائے، لیکن صورت اس کے بالکل برعکس پیدا ہوئی۔ اس منظر سے اسے اذیت تو کیا پہنچتی، وہ تو الٹی اس سے دلچسپی لینے لگی اور آخرکار اس کا دل موم ہو گیا۔ ایناسرگیونا کو اس پر خوشی بھی ہوئی، افسوس بھی ہوا۔ وہ سوچنے لگی ''ثابت یہ ہوا کہ بازاروف درست ہی کہتا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک اشتیاق کی کیفیت تھی۔ اشتیاق کی اور سہل انگاری اور انانیت کی محبت.....''

وہ بلند آواز سے بولی'' بچّو! تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا محبت محض ایک خودساختہ جذبہ ہے؟''

لیکن اس کی بات نہ تو کاتیا سمجھی نہ ارکادی سمجھا۔ اس کے سامنے وہ دونوں جھینپے جھینپے رہتے تھے۔ گفتگو کے وہ اِکّا دُکّا فقرے جو اتفاقاً ان کے کانوں میں پڑ گئے تھے، وہ ان کے ذہن میں البتہ ابھرنے لگے تھے، لیکن ایناسرگیونا نے جلد ہی ان کی پریشانی رفع کر دی۔ اس کے لیے یہ ایسی مشکل بات تو تھی نہیں، آخر اس نے اپنی پریشانی بھی تو رفع کی ہی تھی۔

(27)

بیٹا کیا آیا بوڑھے ماں باپ تو جی اٹھے۔ بازاروف بالکل اچانک آن درآمد ہوا تھا۔ اِس چیز نے ان کی خوشی میں اور اضافہ کر دیا۔ اریناولاسیونا کے اضطراب کی یہ کیفیت تھی کہ آنگن میں ناچی ناچی پھرتی تھیں۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر واسلی آئونووچ نے انہیں مرغی سے تشبیہ دے ڈالی۔ ان کے کٹے چھنٹے کوٹ کی مختصر ٹیل نے واقعی کچھ ان کا ایسا حلیہ بنا دیا تھا کہ ان پر مرغی کا شبہ گزرتا تھا۔ وہ خود اپنے پائپ کو دانتوں میں دباتے تھے، پھر کچھ

بڑبڑانے لگتے تھے یا پھر وہ اپنی گردن انگلیوں میں دبوچ لیتے تھے اور سر کو چاروں طرف گھما کر دیکھتے تھے۔ پھر یکا یک وہ اپنا چوڑا سا منہ کھول دیتے اور خاموشی کے ساتھ ہنسنے لگتے۔

بازاروف نے ان سے کہا "بڑے میاں میں پورے چھ ہفتوں کے لیے یہاں آیا ہوں۔ میں کام کرنا چاہتا ہوں، لہٰذا مجھے دق مت کرنا۔"

واسلی آئونووچ نے جواب دیا "اگر تم اسے ہی دق کرنا سمجھتے ہو تو دیکھ لینا، میں تمہاری نگاہوں سے ایسا اوجھل ہوں گا کہ تم میرا چہرہ مہرہ بھی بھول جاؤ گے۔"

انہوں نے اپنا قول نبھایا تو سہی، پہلے کی طرح انہوں نے اپنے بیٹے کو اپنے مطالعہ کے کمرے میں پہنچا دیا اور پھر وہ اس کی نگاہوں سے تقریباً اوجھل ہی ہو گئے۔ انہوں نے بڑی بی تک کو رقیق القلبی کے فضول مظاہرے کرنے سے روک دیا تھا۔

"بڑی بی یوگین جب پہلے آیا تھا تو ہم نے اسے بہت دق کیا تھا۔ اِس مرتبہ ہمیں ذرا سمجھداری سے کام لینا چاہیے۔"

ولاسیونا بڑے میاں کی بات مان ضرور گئی تھیں، لیکن ان کی تشفی نہیں ہوتی تھی۔ غریب کو صرف کھانے پر بیٹے کی صورت دیکھنا نصیب ہوتی تھی اور اب تو وہ اس سے بات کرتے ہوئے بھی ڈرنے لگی تھیں۔ کبھی کبھی وہ کہہ اٹھتیں "اینوشکا" اور ابھی وہ گردن اٹھا کر دیکھنے بھی نہ پاتا کہ وہ گھبراہٹ میں اپنے بٹوے کی جھالر پر انگلیاں پھیرنا شروع کر دیتیں اور کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگتیں "کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے صرف....."

اور پھر وہ واسلی آئونووچ کے پاس پہنچتیں، ہاتھ پر اپنا رخسار رکھتیں اور مشورہ لینے لگتیں "یہ تو ذرا معلوم کرو کہ اینوشا کے کھانے میں آج کیا ہو؟ کرم کلے کی ترکاری یا چقندر کا شوربہ؟"

"لیکن خود تم نے کیوں نہیں پوچھ لیا؟"..... "میں اسے کیوں دق کروں؟"

لیکن بازاروف کی کمرے میں بند پڑے رہنے کی عادت آپ ہی آپ ختم ہو گئی۔ کام کا جنون اترنے لگا۔ ایک مبہم قسم کے اضطراب اور ایک خوفناک قسم کی بیزاری نے اس کی جگہ لے لی۔ اس کی ساری حرکات وسکنات میں ایک عجیب وغریب قسم کی تھکن کا احساس جھلکنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کی چہل قدمی میں جوزور شور اور سرگرمی ہوا کرتی تھی، اس

میں بھی تبدیلی پیدا ہو چلی۔ اس نے اکیلا ٹہلنا بند کر دیا۔ اب وہ لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے پر مائل ہونے لگا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر چائے پیتا تھا۔ واسلی آئونووچ کے ہمراہ ترکاری کے کھیتوں میں چہل قدمی کرنے نکل جاتا تھا اور چپ چاپ سگریٹ پیتا رہتا۔ ایک مرتبہ اس نے فادر الیکسی تک کی خیر و عافیت پوچھ لی تھی۔ واسلی آئونووچ پہلے تو اس تبدیلی پر بہت خوش ہوئے، لیکن یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ ایک روز انہوں نے چپکے چپکے بیوی سے کہا کہ ''بڑی بی! اینوشا کو دیکھ دیکھ کر میرا دل کٹتا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ اسے کسی طرح کی بے اطمینانی ہو یا غصہ ہو۔ یہ تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اداس اداس رہتا ہے۔ اسے کوئی غم لگ گیا ہے۔ یہ ہے خطرناک بات۔ زبان کو تالا لگ گیا ہے۔ کبھی جو بولتا چالتا ہو' ارے بھئی اور کیا ہے' ہمیں برا بھلا ہی کہہ لیا کرتا۔ سوکھ کر کانٹا ہوا جا رہا ہے۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا ہے۔''

بڑی بی کھسر پھسر کرنے لگیں ''الٰہی رحم! الٰہی ہمارے حال پر رحم کھا۔ میں اس کی گردن میں ایک تعویذ ڈال دیتی' مگر وہ مجھ دکھیاری کو ہاتھ بھی نہ لگانے دے گا۔''

واسلی آئونووچ نے کئی مرتبہ ڈرتے ڈرتے بڑی احتیاط سے بازاروف سے اس کے کام کے بارے میں' اس کی صحت کے متعلق اور ارکادی کے سلسلے میں اس سے پوچھ پچھ کرنے کی کوشش کی' لیکن بازاروف نے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے بات کو ٹال دیا اور ایک مرتبہ جب اس نے یہ دیکھا کہ اس کا باپ باتوں باتوں میں کسی خاص موضوع کو چھیڑ دینے کے لیے زمین ہموار کر رہا ہے' تو اس نے جھلّا کر اس سے کہا ''آپ ہر وقت میری ٹوہ لینے کی فکر میں کیوں رہتے ہیں؟ یہ طریقہ تو اس پہلے طریقے سے بھی زیادہ برا ہے۔''

غریب واسلی آئونووچ نے جلدی سے جواب دیا ''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

اسی طرح ان کے ڈپلومیٹک قسم کے اشاروں کنایوں کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ایک دن انہوں نے زرعی غلاموں کی آزادی اور ترقی کا ذکر اس امید میں چھیڑا تھا کہ شاید ان کا بیٹا کچھ نرم پڑ جائے' مگر اس نے بڑی سرد مہری سے جواب دیا ''کل میں مویشی خانے کے پاس سے گزر رہا تھا' کیا دیکھتا ہوں کہ کسانوں کے لونڈے گلا پھاڑ

پھاڑ کر گا رہے ہیں۔ کوئی معقول قسم کا پرانا نغمہ نہیں، بلکہ ایک سستا بازاری گانا۔ یہ ہوئی ہے آپ کے یہاں ترقی!''

کبھی کبھی بازاروف گاؤں میں نکل جاتا اور اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں کسی کسان سے باتیں کرنے لگتا۔ ''آؤ مقدم! ذرا وضاحت تو کرو زندگی کے متعلق تمہارا نقطۂ نظر کیا ہے۔ یار لوگ کہتے ہیں کہ روس کا مستقبل روس کی ساری طاقت تمہاری مٹھی میں ہے۔ تم تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کرو گے۔ تم ہمیں ایک مستند زبان عطا کرو گے، ہمیں قوانین بخشو گے۔''

کسان یا تو گم متھان بنا بیٹھا رہتا، یا پھر کچھ اس قسم کے پھول اس کی زبان سے جھڑنے لگتے ''ہاں جی! ہمن جندگی کو جی..... پر یو بات ہے جی کہ..... ہمرا تو یو ہے جی کہ.....''

بازاروف بیچ میں ٹوک دیتا ''اماں بس تم اتنا ضرور بتادو کہ یہ تمہارا ''میرؔ'' کیا بلا ہے؟ یہ وہی ''میرؔ'' ہے ناں جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ تین مچھلیوں پر سوار رہتا ہے۔''

کسان بڑی سادگی سے اور بڑے بزرگانہ اور مشفقانہ انداز میں جواب دیتا۔ ''جو تین مچھلیوں پر سوار رہوے ہے، وے تو دھرتی ہے۔ وے ہماری باپ ہے۔ پر ہمارا ''میرؔ'' تو مالک کی مرضی پہ ہے اور جی مالک کی مرضی میں جتنی سختی ہووے ہے، اتنا ہی کسانوں کے لیے اچھا ہووے ہے۔''

اس قسم کا جواب سن کر ایک روز بازاروف نے بڑے حقارت آمیز انداز میں کاندھے مچکائے اور وہاں سے چل دیا۔ غریب کسان سر جھکا کر گھر کی طرف ہولیا۔

''کیا بات تھی رے؟'' یہ سوال ایک دوسرے کسان نے اس سے کہا۔ ''یہ شخص ادھیڑ عمر کا تھا۔ اس کی تیوری تنی ہوئی تھی، وہ دُور اپنے جھونپڑے کے دروازے پر کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ بقایا کی بات تھی رے؟''

''بقایا، نہیں مقدم۔'' پہلے کسان نے جواب دیا اور اب اس کی آواز کا وہ بزرگانہ لہجہ باقی نہیں رہا تھا۔ اس کے برخلاف اب اس میں ایک حقارت و نفرت کی جھلک پیدا ہو چلی تھی۔ ''اجی بس اوّل پٹال بکے تھا۔ بس جی واکو تو اپنی۔ جیب ہلانی تھی۔ بابو لوگن تھا

جی۔ وا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔"

"وا کی سمجھ میں کچھو کا ہوکو آنے لگو تھا"۔ دوسرے نے جواب دیا۔ پھر ان دونوں نے اپنی ٹوپیوں کو اک ذرا جھٹکا دیا اور اپنی پیٹیاں نیچے کھسکائیں اور پھر انہوں نے اپنے کام کاج پہ بحث کرنا شروع کر دی۔ بازاروف..... وہ بازاروف جو بڑے حقارت آمیز انداز میں کاندھے مچکا دیا کرتا تھا' وہ بازاروف جو کسانوں سے گفتگو کرنے کا قرینہ جانتا تھا (پافل پیٹروچ سے لڑائی میں بھی اس نے یہ شیخی ماری تھی) افسوس ہے کہ وہ بازاروف اپنی خود اعتمادی میں ایسا گرفتار تھا کہ اسے یہ احساس بھی نہ ہوا کہ یہ لوگ اسے مسخرا قسم کی ایک چیز سمجھتے تھے۔

آخر اسے اپنے لیے مشغلہ مل ہی گیا۔ ایک روز واسلی آئونووچ نے ایک کسان کے زخمی پیر کی مرہم پٹی کی' لیکن بڑے میاں کے ہاتھوں میں رعشہ آ گیا تھا' وہ مرہم پٹی کا کام سنبھال نہ سکے۔ ان کے بیٹے نے ان کا ہاتھ بٹایا۔ وقتاً فوقتاً وہ ان کے طبی مشاغل میں شریک ہو جاتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ جو علاج وہ تجویز کرتا تھا' اس پر بھی اور اپنے باپ پر بھی وہ خوب طنز و تعریض کرتا تھا اور باپ کی حالت یہ تھی کہ اِدھر اس نے علاج تجویز کیا اور اُدھر وہ اس پر عمل کرنے پر آمادہ ہو گیا' لیکن بازاروف کے طعنے بالآخر بے اثر بن کر رہ گئے۔ پریشان ہونا تو درکنار' اب تو واسلی آئونووچ کو ان سے تسکین ہوتی تھی۔ اپنے پیٹ پر وہ میلے چکنے ڈریسنگ گاؤن کو دو انگلیوں سے تھام لیتے اور منہ سے پائپ لگا کر بڑے اطمینان سے وہ بازاروف کی باتیں سنتے۔ بازاروف کے طعنے جتنے زیادہ زہر بھرے ہوتے اتنی ہی خندہ پیشانی سے اس کا ہنس مکھ باپ کھی کھی کرنے لگتا اور اس بری طرح کھی کھی کرتا کہ اس کے سیاہ دانت ایک ایک کر کے گن لیجیے۔ کبھی کبھی وہ اِن سپاٹ اور بے معنی فقروں کو دُہرانے بھی لگتے تھے۔ مثال کے طور پر وہ کئی دن تک بلاوجہ بے سبب مستقل طور پر یہ فقرہ دُہراتے رہے "اس میں کیا رکھا ہے" اور محض اس وجہ سے کہ ایک روز صبح انہیں گرجا گھر کو جاتے دیکھ کر بیٹے نے یہ فقرہ کہہ دیا تھا۔

انہوں نے چپکے سے اپنی بڑی بی سے کہا "اس پاک پروردگار کی شان کے قربان' اب اس کی طبیعت بحال ہو گئی ہے۔ آج تو اس نے مجھے وہ کھری کھری سنائی ہیں کہ بس کیا

کہوں!!"

اس کے علاوہ اس قسم کے مددگار کی موجودگی کے خیال ہی سے انہیں اتنی خوشی تھی کہ جامے میں پھولے نہ سماتے تھے اور مارے غرور کے زمین پر قدم نہ رکھتے تھے۔ کبھی کبھی جب کوئی کسان عورت مرد کا لبادہ اوڑھے اور ٹوپی پہنے ان کے پاس آتی تو وہ کسی عرق کی بوتل یا سفید مرہم کی ڈبیا اس کے ہاتھ میں تھماتے اور کہنے لگتے "ہاں ہاں! بڑی بی خدا کا شکر ادا کرو کہ میرا بیٹا یہاں موجود ہے۔ اب سائنس کے بالکل نئے طریقوں سے تمہارا علاج ہوگا۔ تم کیا جانو اس بات کو۔ فرانسیسیوں کا بادشاہ نپولین تھا نہیں، اسے بھی اس سے اچھا ڈاکٹر نصیب نہیں ہوا تھا۔" اور وہ کسان عورت جو بالعموم یہ شکایت لے کر آتی کہ اس کا سارا جسم ٹوٹ رہا ہے (ان الفاظ کا صحیح مطلب وہ خود بھی نہیں بتا سکتی تھی) اس کا سر اور جھک جاتا اور جھک جاتا، یہاں تک کہ اس کے سینے سے جا لگتا۔ اس جگہ پر جہاں تولیہ کے ایک کنارے میں فیس کے طور پر وہ چار انڈے باندھ کر لاتی تھی۔

ایک مرتبہ تو بازاروف نے ایک چلتے پھرتے پھیری والے بزّاز کا ایک دانت بھی نکالا تھا اور اگرچہ یہ دانت بہت معمولی قسم کا تھا، پھر واسلی آئونووچ نے ایک عجیب چیز سمجھ کر اسے احتیاط سے رکھا اور جب انہوں نے اسے فادر الیکسی کو دکھایا تو بس بار بار یہی کہتے تھے "دیکھئے تو سہی! کس ستم کا دانت ہے۔ یوگین میں بڑا دم ہے۔ بزّاز تو تڑپ گیا۔ اجی یہ تو دانت ہے، زیتون کا درخت بھی ہوتا تو وہ اسے بھی اسی طرح اکھاڑ پھینکتا۔"

"ہاں صاب ترقی کرے گا"۔ فادر الیکسی کو آخر میں یہی کہنا پڑتا تھا۔ ان کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ اور کیا کہا جائے اور اس جذباتی بوڑھے سے کیسے دامن چھڑایا جائے۔

ایک روز پڑوس کے ایک گاؤں سے ایک کسان اپنے بھائی کو واسلی آئونووچ کے پاس لے کر آیا۔ اسے ٹائیفائڈ ہو گیا تھا۔ بیچارہ تنکوں کی چٹائی پر چت لیٹا دم توڑ رہا تھا۔ اس کے جسم پر کالے کالے دھبے پڑ گئے تھے۔ اس کے ہوش و حواس بہت دیر ہوئی رخصت ہو چکے تھے۔ واسلی آئونووچ اس پر بہت افسوس کرنے لگے کہ طبی امداد حاصل کرنے میں اس قدر تاخیر برتی گئی اور انہوں نے قطعی طور پر اس کی زندگی سے مایوسی کا اعلان کر دیا اور

یہ واقعہ بھی ہے کہ کسان اپنے بھائی کو گھر بھی واپس نہ لے جا سکا' گاڑی میں ہی اس کا انتقال ہو گیا۔

تین دن بعد بازاروف باپ کے کمرے میں آیا اور پوچھنے لگا کہ اس کے پاس تھوڑا سا کاسٹک تو نہیں ہے؟

''ہاں ہے! تمہیں کیا ضرورت پڑ گئی؟''

''تھوڑا سا چاہیے.....ایک زخم کو جلانا ہے۔''

''کس کے لیے؟''

''اپنے لیے!''

''تمہارے لیے؟ کیوں؟ کس قسم کا زخم ہے؟ کہاں ہے؟''

''یہ دیکھئے میری انگلی پر ہے۔ میں آج گاؤں گیا تھا' وہ کسان تھا ناں جسے ٹائیفائڈ ہو گیا تھا' اسے بھی وہاں لایا گیا تھا۔ کسی وجہ سے وہ اس کی لاش چیرنا چاہتے تھے اور مجھے بہت دنوں سے اب اس کی کوئی مشق نہیں رہی ہے۔''

''اچھا تو؟''

''تو یہ کہ میں نے ڈاکٹر سے اس کی اجازت لی اور پھر میں نے لاش کی چیر پھاڑ کر ڈالی۔''

واسلی آئیونووچ کے جسم میں کاٹو تو لہو نہیں۔ سفید پھدق پڑ گئے۔ ان کی زبان سے تو ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ وہ سوچتے ہوئے اپنے مطالعہ کے کمرے میں پہنچے اور وہاں سے تھوڑا سا کاسٹک لے کر فوراً پلٹے۔ بازاروف تو بس یہ نیت باندھ رہا تھا کہ کاسٹک لے کر وہاں سے چل پڑے' لیکن واسلی آئیونووچ نے اسے ٹوک دیا ''خدا کے لیے تم رہنے دو میں کرتا ہوں۔''

بازاروف مسکرا دیا ''کیا بات ہے آپ کی ڈاکٹری کی۔''

''یہ ہنسی ونسی چھوڑو۔ لاؤ اپنی انگلی دکھاؤ۔ زخم گہرا تو ہے نہیں۔ میرے چھونے سے تکلیف ہوتی ہے؟''

''ہاں ہاں اور دبائیے ڈریئے مت!''

واسلی آلوئنو وچ ٹھٹک گئے۔ ''یوگین کیا خیال ہے تمہارا گرم لوہے سے اسے کیوں نہ جلائیں؟''

''یہ تو ہمیں پہلے کرنا چاہیے تھا۔ اب تو دراصل کاسٹک کا بھی کوئی فائدہ نہیں نکلے گا۔ اگر مجھ پر واقعی اثر ہو گیا ہے تو اب بہت دیر ہو چکی ہے۔''

''کیسے.....بہت دیر....'' واسلی آلوئنو وچ کی زبان سے یہ الفاظ بمشکل ادا ہو سکے۔

''میرا خیال تو یہی ہے۔ چار گھنٹے سے زیادہ ہونے کو آئے۔''

واسلی الوئنو وچ نے زخم کو ایک ذرا آنچ اور دی ''لیکن کیا ڈاکٹر کے پاس کاسٹک نہیں تھا؟''

''نہیں؟''

''کاسٹک نہیں تھا۔ غضب خدا کا اتنی ضروری چیز اور ڈاکٹر کے یہاں نہ نکلے۔ ستم ہے' تعجب ہے۔''

''آپ اس کی الماریاں جا کر دیکھ لیتے۔'' بازاروف اتنا کہہ کر وہاں سے چل دیا۔

اس روز رات تک اور دوسرے روز صبح سے شام تک واسلی آلوئنو وچ کسی نہ کسی بہانے سے بیٹے کے کمرے میں بار بار پہنچتے رہے۔ زخم کا ذکر تو انہوں نے اشارے کنائے میں بھی نہیں کیا۔ بلکہ وہ تو ایسی باتیں کرتے رہے جن کا اس بات سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا' لیکن اس کے چہرے کو وہ بار بار دیکھتے تھے اور اس بدحواسی سے اسے تکتے تھے کہ بازاروف آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے یہاں تک دھمکی دے ڈالی کہ بس میں یہاں سے جاتا ہوں۔ واسلی آلوئنو وچ نے اس سے وعدہ کر لیا کہ اب میں تمہیں بالکل دق نہیں کروں گا۔ یہ وعدہ انہیں اس وجہ سے اور بھی کرنا پڑا کہ ایرینا ولاسیونا سے یہ بات چھپا کر رکھی گئی اور اب بڑی بی کا ماتھا ٹھنک رہا تھا کہ آخر بڑے میاں سوتے کیوں نہیں ہیں' انہیں کیا ہو گیا ہے؟

پورے دو دن تک وہ ضبط کرتے رہے' حالانکہ بیٹے کو دیکھ دیکھ کر ان کا برا حال ہو رہا تھا اور چھپ چھپ کر وہ اسے دیکھنے لگتے.....لیکن تیسرے دن کھانے پر ان سے ضبط

نہ ہوسکا۔ بازاروف نظریں نیچی کیے بیٹھا تھا۔ کھانے کو اس نے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔

''یوگین کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ کھانا تو میرے خیال میں اچھا پکا ہے۔'' بے اعتنائی کو کمال کی حد تک اپنے آپ پر طاری کر کے انہوں نے یہ فقرے کہے تھے۔

''جی نہیں چاہتا' اس لیے نہیں کھاتا۔''

''کیا بھوک نہیں ہے؟ اور یہ تمہارے سر کو کیا ہو گیا ہے؟'' انہوں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ''کیا درد ہو رہا ہے؟''

''ہاں ہو تو رہا ہے۔ ہونا ہی چاہیے۔''

ماں کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''یوگین! خفا کیوں ہوتے ہو؟'' واسلی آئونووچ کہہ رہا تھا ''نبض مجھے دیکھنے دو گے نان؟''

بازاروف اٹھ کھڑا ہوا ''نبض دیکھ کر کیا کیجیے گا؟ میں آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ مجھے بخار ہو رہا ہے۔''

''جاڑے کے ساتھ آیا تھا؟''

''جی ہاں جاڑا ابھی ہے۔ اب میں چل کر لیٹتا ہوں۔ آپ مجھے لیموں کی چائے بھیج دیں۔ مجھے ضرور ٹھنڈ لگ گئی ہے۔''

اریناولاسیونا بولیں ''ہاں ضرور ٹھنڈ لگی ہے۔ میں نے کل رات تمہارے کھانسنے کی آواز بھی سنی تھی۔''

''مجھے ٹھنڈ لگ گئی ہے۔'' بازاروف نے وہ فقرہ پھر دہرایا اور وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

اریناولاسیونا تو لیموں کی چائے تیار کرنے میں لگ گئیں اور واسلی آئونووچ دوسرے کمرے میں جا کر چپ چاپ مایوسی کے عالم میں سر تھام کر بیٹھ گئے۔

بازاروف پھر سارے دن نہیں اٹھا اور رات بھر اس پر نیم بیہوشی کی کیفیت طاری رہی۔ رات کے ایک بجے بڑی کوشش سے اس نے آنکھیں کھولیں۔ کیا دیکھتا ہے کہ چراغ جل رہا ہے اور باپ کا پیلا ہلدی چہرہ اس پر جھکا ہوا ہے۔ ان سے کہا کہ آپ جائیے۔

بوڑھے باپ نے حکم کی تعمیل تو ضرور کی، لیکن بہت جلد وہ پھر پلٹے اور پنجوں کے بل دھیرے دھیرے چل کر دروازے کے پیچھے کھڑے ہو گئے اور ٹکٹکی باندھ کر بیٹے کو دیکھنے لگے۔ ایرینا ولاسیونا کی آنکھوں میں بھی نیند نہیں تھی۔ کمرے کی کواڑوں میں جو ایک پتلی سی دراڑ تھی، وہ بار بار اس کے پاس آ کر کان لگا دیتیں اور یہ دیکھتیں کہ ''اینوشا سانس کیسے لے رہا ہے۔'' اور واسلی آئونووچ کیا کر رہے ہیں، مگر ان کی بے حس و حرکت خمیدہ کمر کے سوا انہیں اور کچھ بھی دکھائی نہ دیتا۔ اس سے بھی ان کی کچھ نہ کچھ ڈھارس بندھ ہی جاتی تھی۔ صبح کو بازاروف نے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ نکسیر بہہ نکلی۔ وہ پھر لیٹ گیا۔ بڑے میاں چپ چاپ سرہانے بیٹھے رہے۔ ایرینا ولاسیونا نے ان سے جا کر پوچھا ''اینوشا اب کیسے ہیں؟'' جواب دیا ''اب اچھے ہیں۔'' اور یہ کہہ کر انہوں نے دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کر کے بڑی بی کو باہر جانے کے لیے کہا۔ بڑی بی نے ہونٹ دانتوں میں دبا لیے کہ کہیں ان کی چیخ نہ نکل جائے اور واپس چلی گئیں۔

گھر میں اچانک اندھیرا چھا گیا۔ گھر کا ہر فرد غم کی تصویر بنا ہوا تھا۔ ہر طرف ایک عجیب و غریب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایک مرغا آنگن میں بے طرح شور مچا رہا تھا۔ اسے پکڑ کر گاؤں بھیج دیا گیا اور مرغے کی سمجھ میں نہ آئی کہ آخر اس سے یہ سلوک کیوں کیا جا رہا ہے۔ بازاروف دیوار کی طرف منہ کیے چپ چاپ پڑا رہا۔ واسلی آئونووچ نے قسم قسم کے سوال کر کے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی، لیکن بازاروف سوالات سے اکتا گیا اور بڑے میاں چپ چاپ اپنی آرام کرسی پر دراز ہو گئے۔ بس کبھی کبھی اپنی انگلیاں چٹخانے لگتے تھے۔ چند منٹ کے لیے وہ باغ میں گئے اور وہاں بت بن کر کھڑے ہو گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ غم والم کی ایک ناقابل بیان کیفیت نے انہیں آ دبوچا ہے (حیرانی کی کیفیت تو ان کے چہرے کی مستقل کیفیت بن کر رہ گئی تھی)۔ وہاں سے وہ پھر بیٹے کے پاس جا پہنچے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح بڑی بی کے سوالوں سے پہلو بچا لیں، مگر آخر کار بڑی بی نے انہیں آ دبوچا اور بڑے جوش میں آ کر، بلکہ کچھ بگڑ کر، پوچھنے لگیں ''اسے کیا ہو گیا ہے؟'' اس وقت وہ اپنے آپے میں آئے اور جواب میں انہوں نے بڑی کوشش سے مسکرانا چاہا، لیکن یہ صورت خود ان کے لیے بڑی وحشت انگیز تھی کہ بجائے مسکراہٹ

کے ان پر ہنسی کا دورہ سا پڑ گیا۔ پو پھٹتے ہی انہوں نے ڈاکٹر کو بلا بھیجا۔ پھر انہوں نے سوچا کہ کہیں بیٹے کو غصہ نہ آ جائے' لہٰذا یہ ضروری ہے کہ پہلے اسے بتا دیا جاتا۔ بازاروف نے اچانک صوفے پر کروٹ لی اور پانی مانگا۔ باپ کو وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

واسلی آئونووچ نے اسے تھوڑا سا پانی دیا۔ پانی دیتے دیتے انہوں نے اس کی پیشانی کو چھوکر دیکھا' پیشانی آگ کی طرح پھنک رہی تھی۔

''باواجان'' بازاروف نے بڑی دھیمی مضمحل آواز میں کہنا شروع کیا ''میرا وقت آ گیا ہے۔ مجھ میں زہر سرایت کر گیا ہے۔ بس ایک دو دن میں آپ کو میرے کفن دفن کا سامان کرنا پڑے گا۔''

واسلی آئونووچ کی ٹانگیں تھر تھر کانپنے لگیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے ان کی ٹانگوں میں تان کر ایک گھونسہ رسید کر دیا ہے۔

''یوگین'' ان کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''کیسی بات زبان سے نکالتے ہو.... خدا تمہیں حفظ وامان میں رکھے..... تمہیں صرف ٹھنڈ لگ گئی ہے۔''

''چپ بھی رہئے!'' بازاروف نے رُکتے رُکتے آہستہ آہستہ سے انہیں ٹوکا۔ ''ڈاکٹروں کو تو اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ زہر سرایت کر جانے کی ساری علامات موجود ہیں۔ آپ خود سمجھتے ہیں۔''

''زہر سرایت کرنے کی علامات؟ یوگین..... کہاں ہیں علامات؟ کیا کہہ رہے ہو؟''

''یہ کیا ہے؟'' اور بازاروف نے قمیض کی آستین اکسا کر باپ کو وہ منحوس سرخ سرخ داغ دکھائے جو اس کے شانے پر ابھر آئے تھے۔

واسلی آئونووچ سر سے پیر تک کانپ گئے۔ مارے دہشت کے ان کا جسم ٹھنڈا برف پڑ گیا۔

آخر بڑی مشکل سے وہ بولے ''فرض کر لو.... یہی فرض کر لو.... اگر کوئی ایسی بات ہے بھی....''

''پائیمیا'' بیٹا بات کاٹ کر بولا۔

''اچھا.... اچھا...... کوئی جلدی بیماری.....''

''پائیمیا'' بازاروف بڑی تیزی سے بولا ''آپ تو نصاب کی کتابوں کے سبق تک بھول گئے۔''

''اچھا' اچھا تمہاری بات ٹھیک سہی...... بہر حال ہم تمہیں اچھا کر دیں گے۔''

''جانے دیجیے۔ یہ سب فضول باتیں ہیں' مگر خیر سوال یہ نہیں تھا۔ مجھے یہ امید نہیں تھی کہ میں اتنی جلدی مر جاؤں گا۔ سچ پوچھئے تو یہ بڑا المناک واقعہ ہے۔ اب آپ اور اماں جان اپنے مذہبی عقیدے کو کام میں لائیں۔ دراصل اب وقت ہے آپ اسے آزما دیکھیں۔'' اس نے تھوڑا سا پانی پیا ''میں آپ سے ایک بات کہنی چاہتا تھا..... ابھی تو میرے اوسان بجا ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ کل پرسوں میرے ہوش و حواس جواب دے جائیں گے۔ مجھے اب بھی یہ یقین ہے کہ میں ٹھیک باتیں کر رہا ہوں۔ میں یہاں لیٹا ہوں اور مجھے یوں معلوم ہو رہا ہے کہ سرخ کتوں نے مجھے گھیر لیا ہے اور آپ انہیں مجھ پر لہکار رہے ہیں۔ گویا میں کوئی جنگلی مرغا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ میں نے نشہ کر رکھا ہے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں ناں؟''

''یوگین! یقین جانو تم بالکل ٹھیک باتیں کر رہے ہو۔''

''چلئے اچھا ہی ہے۔ آپ کہتے تھے کہ آپ نے ڈاکٹر کو بلایا ہے۔ اپنے اطمینان کے لیے آپ نے بلایا ہے..... ہاں میرے اطمینان کے لیے بھی۔ کسی کو پیام دے کر ذرا بھیجئے.....''

بڑے میاں بیچ میں بول اٹھے ''ارکادی نکولائچ کے پاس؟''

''ارکادی نکولائچ کون؟'' بازاروف نے یوں کہا گویا وہ شش و پنج میں ہے....

''اچھا' ہاں وہ مرغی کا بچہ۔ اسے گولی مارو۔ وہ تو اب کوا بن گیا ہے۔ آپ حیران نہ ہوں۔ میں ابھی بڑبڑا نہیں رہا ہوں۔ یوں کیجیے کہ ایک آدمی کو مادام اودن تسوف اینا سرگیونا کے پاس بھیج دیجیے۔ یہاں سے قریب ہی ایک صاحبہ رہتی ہیں۔ ان کے جائداد..... آپ جانتے ہیں؟'' (واسلی آئونووچ نے اثبات میں سر ہلایا)۔ ''یہ کہہ دیجیے کہ یوگین بازاروف

آپ کو سلام کہتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اس دنیا سے جا رہا ہوں۔ آپ یہ کریں گے ناں؟''

''ہاں ہاں کیوں نہ کروں گا..... مگر یوگین! تم سدھار جاؤ گے؟ کیا یہ ہوسکتا ہے؟..... ذرا سوچو تو سہی۔ خدا کے یہاں پھر انصاف تو رہے گا نہیں۔''

''یہ میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ تو بس یہ کریں کہ کسی آدمی کو بھیج دیں۔''

''ابھی بھیجتا ہوں اور میں خود ایک خط بھی لکھے دیتا ہوں۔''

''نہیں جی! کیا ضرورت ہے۔ بس میرا اسلام کہلا بھیجئے کافی ہے اور اب میں پھر کتوں سے جا کر الجھتا ہوں۔ عجب بات ہے۔ میں اپنے خیالات سمیٹ کر موت پر مرکوز کر دینا چاہتا ہوں، لیکن اس کا تصور جانے کہاں گم ہو گیا ہے۔ بس ترمرے سے دکھائی دیتے ہیں..... باقی کچھ نظر نہیں آتا۔''

درد والم کی ایک کیفیت کے ساتھ اس نے پھر دیوار کی طرف کروٹ لے لی اور واسلی آئونووچ مطالعہ کے کمرے سے باہر نکلے اور بڑی مشکل سے بڑی بی کے کمرے تک پہنچے اور دھم سے زانو تہ کر کے مقدس تصویروں کے سامنے جھک گئے۔

''ایوینا دعا کرو، رحم کی دعا مانگو!'' ان کا گلا رندھ گیا تھا۔ ''ہمارا لال، ہمارا لخت جگر دنیا سے جا رہا ہے۔''

ڈاکٹر وہی ڈسٹرکٹ ڈاکٹر جس کے یہاں ماشہ بھر کاسٹک نہیں نکلا تھا، آیا اور مریض کو دیکھ داکھ کے تیمارداری اور معالجہ کے متعلق ہدایتیں کیں۔ اس موقع پر اس نے شفایابی کے امکان کے بارے میں بھی چند ایک الفاظ کہے۔

''آپ نے کبھی یہ دیکھا ہے کہ کوئی شخص میرے جیسے مرض میں مبتلا ہو اور پھر جنت کے لیے اس کا بستر بوریا نہ بندھے؟'' بازاروف نے یہ کہہ کر اچانک اس بھاری میز کے پائے کو پکڑ لیا، جو اس کے صوفے کے پاس بچھی ہوئی تھی۔ اس نے پائے کو ہلا کر پیچھے دھکیل دیا۔ پھر وہ بڑبڑانے لگا۔ ''ابھی دم ہے۔ ابھی دم باقی ہے۔ ابھی پوری قوت موجود ہے، مگر پھر بھی میں مر جاؤں گا۔ بوڑھے لوگوں کو تھوڑی سی مہلت تو مل جاتی ہے۔ زندگی کے ناتہ توڑنے کے خیال سے وہ کسی نہ کسی طرح سمجھوتہ کر ہی لیتے ہیں، لیکن میں...... ہاں جاؤ اور موت کو جھٹلانے کی کوشش کرو۔ موت تمہیں جھٹلائے گی۔ اسے لکھ لو۔ اسے حرفِ آخر

سمجھو۔ یہ کون رو رہا ہے؟'' اور ذرا تامل کے بعد بولا ''اماں جان! بیچاری کی قسمت۔ اب غریب چقندر کا لذیذ شوربہ کسے کھلایا کرے گی؟ آپ باوا جان! آپ بھی رو رہے ہیں شاید۔ عیسائیت تو آپ کے کچھ کام نہ آئی۔ آپ فلسفی بن جائیے، جوگی بن جائیے۔ بہر حال جو جی چاہے بن جائیے، آپ یہ دون کی کیوں نہیں لیتے کہ آپ فلسفی ہیں؟''

''اچھا فلسفی ہوں میں!'' واسلی آلوئنووچ رونے لگے اور آنسوؤں کی ایک گنگا ان کے رخساروں پر بہہ نکلی۔

بازاروف کی حالت دگرگوں ہونے لگی۔ کمبخت بیماری بھی آندھی دھاندی آئی تھی، مگر جراحی کے سلسلے میں جب زہر سرایت کر جاتا ہے، تو پھر بالعموم یونہی ہوتا ہے۔ ابھی وہ ہوش میں تھا اور باتوں کو سمجھ لیتا تھا۔ وہ ابھی تک ہاتھ پیر مارے جا رہا تھا۔ اس نے مٹھیاں بھینچ لی تھیں اور بڑبڑا رہا تھا۔ ''میں اپنے اوسان خطا نہیں ہونے دوں گا۔ یہ محض بکواس ہے۔'' اور پھر فوراً کہنے لگتا ''دس میں سے آٹھ نکال لو، پھر رہ کیا جاتا ہے؟''

واسلی آلوئنووچ یوں بھاگے بھاگے پھر رہے تھے، جیسے ان کے سر پر کوئی بھوت سوار ہے۔ پہلے ایک علاج تجویز کرتے تھے، پھر دوسرا علاج سوچتے تھے اور پھر علاج کو چھوڑ چھاڑ بیٹے کے پاؤں پکڑ کر بیٹھ جاتے تھے۔ ''برف کی گیلی پٹی باندھنی چاہیے..... قے کی دوا..... پیٹ پر پلاستر..... فصد.....'' بس اس قسم کے فقرے وہ کہے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر کی خوشامد درامد کر کے انہوں نے روک لیا تھا۔ وہ ان کی ہاں میں ہاں ملائے جا رہا تھا۔ مریض کے لیے وہ بار بار لیمن منگاتا تھا اور اپنے لیے کبھی پائپ اور کبھی گرمانے والی کوئی چیز یعنی واڈکا مانگتا۔ ایرینا ولاسیونا دروازے کے قریب ایک نیچے سے سٹول پر بیٹھی تھیں۔ بس کبھی کبھار عبادت کے لیے وہ اٹھ کر جاتی تھیں۔ چند دن پہلے کا ذکر ہے ان کے ہاتھ سے آئینہ گر کر ٹوٹ گیا تھا اور اس چیز کو انہوں نے ہمیشہ بدشگنی تصور کیا تھا۔ اس وقت انفوشکا کی سمجھ میں بھی کچھ نہ آتا تھا کہ ان سے کیا کہے۔ تموفش مادام اوون تسوف کے پاس گیا ہوا تھا۔

رات بازاروف پر سخت گزری..... بخار کی کیفیت یہ تھی کہ چنے سے بھن رہے تھے۔ صبح کو کہیں جا کر اس کی طبیعت ایک ذرا سنبھلی۔ ایرینا ولاسیونا سے کہنے لگا کہ میرے

بالوں میں کنگھی کردو۔ ان کے ہاتھ کو اس نے بوسہ بھی دیا تھا اور پھر دو گھونٹ چائے پی۔ واسلی آئونووچ کی ذرا جان میں جان آئی۔

انہیں بس ایک رٹ لگی ہوئی تھی ''الٰہی تیرا شکر ہے' آفت ٹل گئی' آفت گئی۔''

بازاروف بڑبڑانے لگا ''سوچنے کی بات ہے' لفظ بھی کیا ستم ڈھاتے ہیں۔ انہوں نے کہا 'آفت' اور انہیں اطمینان ہو گیا ہے۔ یہ اچنبھے کی بات کہ آدمی لفظوں پر کیسے ایمان لے آتا ہے۔ مثلاً اس سے یہ کہہ دیجیے کہ تم ڈیوٹ ہو۔ اب اگر تم اسے چھڑی بھی نہ چھواؤ تو بھی وہ کانٹوں پر لوٹتا رہے گا۔ اس سے کہہ دو یار تم تو عقل کا پتلا ہو۔ اب اگر تم اس سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرو' تو بھی اس کے دل میں لڈو پھوٹنے لگیں گے۔''

بازاروف کی یہ مختصر سی تقریر سن کر واسلی آئونووچ کو اس کی پرانی فقرہ بازیاں یاد آ گئیں اور ان پر رقت کی کیفیت طاری ہو گئی۔

''ماشاء اللہ کیا کہنے ہیں۔ خوب بات کہی ہے۔'' انہوں نے یہ فقرے کچھ اس طرح جوش میں آ کر کہے۔ گویا وہ خوش ہو کر تالی بجا رہے ہیں۔

بازاروف عجب غم آلود انداز میں مسکرایا۔ کہنے لگا ''تو آپ کا کیا خیال ہے آفت ٹل گئی یا آنے والی ہے؟''

''میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری طبیعت اس وقت سنبھلی ہوئی ہے۔ بس یہ دیکھ دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی ہے۔''

''خوب! اچھی بات ہے۔ خوشی جب بھی ہوتی ہے غلط نہیں ہوتی اور وہاں آپ نے آدمی بھیج دیا؟ آپ کو یاد ہے ناں؟''

''ہاں ہاں بھیج دیا۔''

یہ سنبھلی ہوئی کیفیت کیا تھی' چراغ کا آخری سنبھالا تھا۔ بیماری نے حملہ پھر کیا۔ واسلی آئونووچ بازاروف کے پاس بیٹھے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی خاص صدمہ ہے' جو بڑے میاں کو کھائے جا رہا ہے۔ کئی مرتبہ انہوں نے بات کرنے کی ہمت بھی باندھی تھی' لیکن پھر ٹھنڈے پڑ گئے۔

''یوگین'' آخر وہ بول ہی پڑے ''بیٹا! میرے لال' میرے جگر کے ٹکڑے۔''

نئی کتاب:

عورت کتھا

غیر ملکی زبانوں کے خواتین ادیبوں کے افسانے

(اردو تراجم)

انتخاب و ترتیب: یاسر حبیب

اس کتاب میں براعظم افریقا، ایشیا، جنوبی امریکا اور آسٹریلیا کی ممتاز خواتین ادیبوں کے 44 افسانے شامل ہیں۔

خطاب کرنے کے اس نامانوس انداز نے بازاروف کو بہت متاثر کیا۔ غشی کا بوجھ اس وقت پوری شدت کے ساتھ اس پر امنڈ پڑنا چاہتا تھا اور وہ اس سے پوری قوت کے ساتھ کشتم کشتا کر رہا تھا۔ اسی عالم میں اس نے ذرا اپنی گردن موڑی اور بڑی مشکل سے بولا ''باواجان کیا بات ہے؟''

''یوگین'' اور یہ کہتے کہتے بڑے میاں بازاروف کے قدموں پر گر پڑے۔ بازاروف کی آنکھیں پھر بند ہو گئی تھیں۔ باپ کو وہ اس کیفیت میں نہیں دیکھ سکتا تھا ''یوگین! اس وقت تمہاری طبیعت بحال ہے۔ اللہ نے چاہا تو تم ضرور اچھے ہو جاؤ گے' مگر اس وقت سے تھوڑا سا فائدہ اٹھالو۔ اپنی دکھیاری ماں کا لحاظ کرو۔ اپنے بوڑھے باپ کا پاس کرو۔ اگر تم ایک عیسائی بن کر عبادت کر لو تو ہمارے دل کو بڑی تسکین ہو گی۔ کلیجے پر پتھر رکھ کر میں تم سے یہ الفاظ کہہ رہا ہوں۔ اُف قیامت ہے' لیکن اس سے بھی بڑی قیامت ہو گی..... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے..... یوگین! ذرا سوچو کہ.....''

بڑے میاں کی آواز نے یہاں آ کر دم توڑ دیا۔ بیٹے کی آنکھیں بدستور بند تھیں' لیکن اس کے چہرے پر ایک عجیب و غریب کیفیت پیدا ہو چلی تھی۔ آخر بڑے تامل کے بعد اس کی زبان سے نکلا ''اگر اس سے آپ کی تسکین ہوتی ہے' تو میں انکار نہیں کروں گا' لیکن سوچتا ہوں کہ ایسی جلدی کیا ہے۔ آپ خود کہہ رہے ہیں کہ میری طبیعت اب سنبھل چلی ہے۔''

''ہاں' ہاں یوگین! تمہاری حالت یقیناً سنبھلی ہوئی ہے۔ مگر کون جانے' یہ تو سب خدا کے اختیار میں ہے اور عبادت کرنے میں....''

بازاروف بات کاٹتے ہوئے بولا ''...نہیں' میں تھوڑا انتظار کروں گا۔ میں آپ کی بات مانتا ہوں کہ آفت کی گھڑی آن پہنچی ہے' لیکن اگر ہمیں غلط فہمی ہوئی ہے مگر خیر!''

''یوگین! میں تمہارے پیروں پڑتا ہوں۔''

''میں تھوڑا انتظار کروں گا اور اب میں سو جانا چاہتا ہوں۔ مجھے پریشان نہ کیجیے۔'' اور اس نے اپنا سر پھر تکیے پر ٹکا دیا۔

بڑے میاں اٹھ کر آرام کرسی پر جا بیٹھے۔ کبھی وہ اپنی داڑھی کو مٹھی میں بھینچتے تھے

اور کبھی اپنی انگلی کاٹنے لگتے تھے۔

اچانک ایک ہلکی پھلکی تیز رفتار گاڑی کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز دیہات کی سنسان ویران فضا میں کچھ بہت ہی عجیب تاثر پیدا کرتی ہے۔ پہیوں کی آواز قریب سے قریب تر ہوتی گئی اور پھر گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز بھی آنے لگی.....واسلی آلوئنووچ لپک کر ڈیوڑھی پر پہنچے۔ اس چھوٹے سے مکان کے احاطے میں ایک پالکی کھڑی تھی، جس میں دو نشستیں تھیں اور چار گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ سوچنے کی تو ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ آخر بات کیا ہے۔ وہ تو خوشی سے دیوانے ہو گئے اور سیڑھیوں کی طرف دوڑے..... ایک باوردی خادم پالکی کا دروازہ کھول رہا تھا اور ایک خاتون سیاہ برقعہ اوڑھے چہرے پر سیاہ نقاب ڈالے اس میں سے اتر رہی تھی۔

وہ کہنے لگی "میرا نام مادام اودن تسوف ہے، یوگین وسل یوچ تو ابھی زندہ ہیں؟ آپ ان کے والد ہیں؟ میرے ہمراہ ایک ڈاکٹر بھی ہیں۔"

واسلی آلوئنووچ چلّا کر بولے "رحمت کی دیوی" یہ کہہ کر انہوں نے بے تحاشا اس کا ہاتھ تھاما اور بڑے جوش میں آ کر اسے ہونٹوں سے لگالیا۔ اینا سرگیونا کے ہمراہ جو ڈاکٹر آیا تھا، وہ بڑے تکلف سے پالکی سے اترا۔ یہ ایک ٹھگنا سا آدمی تھا۔ کاٹھی جرمنوں کی سی تھی۔ عینک لگا رکھی تھی۔ واسلی آلوئنووچ ہاتھ کو بوسہ دینے کے بعد پھر چلّائے۔ "ابھی زندہ ہے میرا یوگین ابھی زندہ ہے اور اب اس کی جان بچ جائے گی۔ بڑی بی، بڑی بی.....دیکھو یہ آسمان سے ایک فرشتہ اترا ہے....."

"الٰہی خیر! بات کیا ہے؟" اور بڑی بی ہلتی کانپتی کمرے سے نکلیں۔ بات کو جاننے اور سمجھنے کی انہوں نے بھی کوشش نہیں کی۔ وہ بے تحاشا دوڑ کر اینا سرگیونا کے قدموں پر گر پڑیں اور بالکل باولوں دیوانوں کی طرح اس کے لباس کو چومنے لگیں۔

"یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟" اینا سرگیونا نے احتجاج کیا، لیکن ایرینا ولاسیونا بھلا کب سنتی تھیں اور واسلی آلوئنووچ بھی بس وہی اپنی ہانکے جا رہے تھے۔ "فرشتہ، فرشتہ!"

آخر ڈاکٹر سے صبر نہ ہو سکا۔ وہ بول ہی پڑا "صاحب آخر مریض کہاں ہے؟"

اب واسلی آلوئنووچ نے اپنے آپ کو سنبھالا "یہاں ہیں یہاں، آئیے!" ان کے

حافظے کے کسی کونے کھدڑے میں جو اِکا دُکا جرمن الفاظ پڑے رہ گئے تھے انہیں بھی وہ اس موقع پر کام میں لے ہی آئے' چنانچہ ''معزز رفیق'' انہوں نے جرمن زبان ہی میں کہا تھا ''میرے معزز رفیق' تشریف لائیں!''

مگر جرمن بزرگ نے بہت ناک بھوں چڑھائی اور 'اچھا' کہہ کر ساتھ ہو لیے۔ واسلی آئونووچ اسے مطالعہ کے کمرے میں لے گئے۔ بیٹے کے بالکل کان پر جھک کر وہ بولے ''محترمہ اینا سرگیونا اودن تسوف کے ڈاکٹر صاحب تشریف لائے ہیں۔ وہ خود بھی آئی ہیں۔''

بازاروف نے ایکا ایکی آنکھیں کھول دیں ''کیا کہا آپ نے؟''

''میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اینا سرگیونا آئی ہوئی ہیں اور تمہارے لیے ان صاحب کو ڈاکٹر صاحب کو ہمراہ لائی ہیں۔''

بازاروف نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا ''وہ یہاں ہیں..... میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں' ہاں ان سے بھی مل لینا یوگین' لیکن پہلے ذرا ڈاکٹر صاحب سے ایک ڈیڑھ بات ہو جائے۔ جس وقت سید ورسد درچ (یہ ڈسٹرکٹ ڈاکٹر کا نام تھا) گئے ہیں اس وقت سے لے کر اب تک کی تمہاری پوری کیفیت انہیں سنائے دیتا ہوں اور پھر ہم ذرا مشورہ کریں گے۔''

بازاروف نے جرمن شخص کو دیکھا اور کہنے لگا ''جی ہاں' جلدی باتیں کر لیجیے' مگر لاطینی میں نہ کیجیے۔ 'نزع' کو لاطینی میں کیا کہتے ہیں' یہ میں جانتا ہوں۔''

ڈاکٹر واسلی آئونووچ سے پوچھنے لگا ''حضرت! میرے خیال میں جرمن زبان سے تو آپ واقف ہوں گے؟''

بڑے میاں بولے ''ہاں صاب کچھ..... شدھ بدھ تو ہے...... مگر روسی زبان ہی میں کیوں بات نہ کر لیں؟''

''ہاں' ہاں..... ضرور'' اور مشورہ شروع ہو گیا۔

آدھ گھنٹے بعد واسلی آئونووچ اینا سرگیونا کو کمرے میں پہنچا آئے۔ ڈاکٹر نے

موقع پا کر اس کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ اب مریض کی شفایابی کے متعلق سوچنا ہی فضول سی بات ہے۔

بازاروف کو دیکھ کر وہ دروازے میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ بازاروف کا چہرہ سوج گیا تھا۔ اس پر موت کی پر چھائیاں کانپتی نظر آ رہی تھیں۔ اس کی دھندلی آنکھیں اوون تسوف پر جم کر رہ گئی تھیں۔ اس منظر سے وہ بہت متاثر ہوئی' بلکہ وہ کچھ سہم سی گئی۔ اس کے جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی اور خوف کے مارے اس کا دم بند ہونے لگا اور یک لخت ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں دوڑ گیا' اگر مجھے اس سے محبت ہوتی تو اس قسم کا احساس میرے سینے میں ہرگز نہ جاگتا۔

بازاروف نے بڑے درد کے ساتھ کہا ''شکریہ! مجھے اس کی توقع ہرگز نہ تھی۔ آپ نے بڑا کرم کیا' تو آپ نے جو وعدہ کیا تھا اس کے مطابق ایک مرتبہ پھر ہماری ملاقات ہو ہی گئی۔''

''اینا سرگیونا نے بڑی عنایت کی'' واسلی آ لُونووچ نے ابھی کہنا شروع ہی کیا تھا....

''باوا جان آپ ذرا ہمیں تنہائی کا موقع دیں۔ اینا سرگیونا اب تو آپ میرے خیال میں اس کی اجازت دیں گی۔ اب تو.....'' اور اس نے سر کے اشارے سے اپنے نحیف و نزار جسم کی بیچارگی کا اظہار کیا۔

واسلی آلُونووچ باہر چلے گئے۔

بازاروف نے پھر کہنا شروع کیا ''تو آپ کا بہت بہت شکریہ! یہ تو دراصل ایک شاہانہ اقدام ہے۔ سنتے ہیں کہ نزع کے وقت راجہ مہاراجہ بھی عیادت کو آ جایا کرتے ہیں۔''

''یوگین آلُونووچ' مجھے امید ہے کہ....''

''اینا سرگیونا' آخر ہم سچ بات ہی کیوں نہ کہہ ڈالیں۔ میرا قصہ تو اب ختم ہو ہی لیا۔ موت نے مجھے آ لیا ہے۔ تو ثابت یہ ہوا کہ مستقبل کے متعلق سوچنا ہی سرے سے بے سود تھا۔ موت یوں ایک پرانا مذاق ہے' مگر جو بھی اس کی زد میں آتا ہے' وہ اسے نئی چیز ہی

سمجھتا ہے۔ مجھے کسی قسم کا ہراس تو ہرگز نہیں ہے..... لیکن بے ہوشی طاری ہوتی جا رہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سارے قصے ختم ہو جائیں گے.....'' اس نے بڑے مضمحل انداز میں ہاتھ ہلائے ''جی! تو میں آپ سے کیا کہنا چاہتا تھا..... میں آپ سے محبت کرتا تھا۔ اس بات کی تُک تو اس وقت بھی نہیں تھی...... اور اب تو بالکل ہی اس کی تُک نہیں ہے۔ محبت ایک جسمانی چیز ہے اور میرا جسم ختم ہو رہا ہے۔ مجھے کہنا یوں چاہیے کہ آپ کتنی حسین و جمیل ہیں اور آپ یہاں کھڑی ہیں۔ کتنا خوبصورت.....''

قطعی غیر ارادی طور پر اینا سرگیونا کو ایک جھرجھری سی آئی۔

''آپ فکر نہ کریں، مطلق پریشان نہ ہوں...... آپ اُدھر بیٹھیں میرے قریب نہ آیئے گا۔ آپ کو پتہ ہوگا میری بیماری اُڑ کر لگنے والی ہے۔''

اینا سرگیونا نے تیزی سے کمرے کو عبور کیا اور بازاروف کے صوفے کے قریب والی آرام کرسی پر جا بیٹھی۔

وہ ہولے ہولے کہنے لگا ''عنایت، نوازش، اف یہ قرب اور یہ جوانی اور یہ زندہ و تابندہ اور پاکیزہ..... اس گندے کمرے میں..... اچھا الوداع۔ تم سلامت رہو ہزار برس اور یہ بڑی بات ہے۔ ابھی وقت باقی ہے۔ فائدہ اٹھا لیجیے۔ آپ دیکھ تو رہی ہیں کیسا ہیبت ناک منظر ہے۔ ایک ادھ مرا کیڑا ہے۔ آدھا کچلا گیا ہے، مگر دُم بل کھائے جا رہی ہے اور ایک وقت تھا کہ میرے دماغ میں بھی یہ خناس سمایا ہوا تھا کہ میں معرکے ماروں گا۔ میں چیزوں کو فنا کروں گا۔ خود فنا نہیں ہوں گا اور مجھے فنا نہیں ہونا چاہیے۔ بہت سے مسائل ہیں جو اپنا حل چاہتے ہیں اور میں دیو قامت شخصیت ہوں اور اب اس دیو کے سامنے لے دے کر سب سے بڑا مسئلہ ایک یہ رہ گیا ہے کہ خوبصورتی سے مرنے کا طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔ مگر اس سے کسی کے لیے کیا فرق پڑتا ہے...... خیر! آپ فکر نہ کریں۔ میں کتوں کی طرح دُم نہیں دباؤں گا۔''

بازاروف چپ ہو گیا اور ہاتھ سے گلاس ٹٹولنے لگا۔ اینا سرگیونا نے اسے تھوڑا سا پانی پلایا، مگر حالت یہ تھی کہ ہاتھوں سے اس نے دستانے نہیں اتارے تھے اور خوف کے مارے اس کا تنفس تیز ہو گیا تھا۔

''آپ مجھے بھول جائیں گی؟'' وہ پھر شروع ہوگیا ''زندہ اور مردوں کا کیسا ساتھ۔ میرا باپ آپ سے کہے گا کہ روس کی سرزمین ایک زبردست شخصیت سے محروم ہوگئی ہے...... یہ بکواس ہے۔ مگر بڑے میاں کی بات کی تردید نہ کرنا' بچے کا دل بہلنا چاہیئے کھلونا کیسا بھی ہو اور اماں جان سے بھی ذرا مروّت برتنا۔ اگر چراغ لے کر بھی دنیا میں ڈھونڈو گی تو ایسے لوگ نہیں ملیں گے......روس کو میری ضرورت تھی.....نہیں۔ یہ تو ظاہر ہوگیا کہ اسے میری ضرورت نہیں تھی۔ پھر کس کی ضرورت ہے؟ موچی کی ضرورت ہے' درزی کی ضرورت ہے۔ قصائی ......ہمیں گوشت دیتا ہے.....قصائی......ذرا ٹھہریئے۔ میرا دماغ چل نکلا ہے...... یہاں کوئی جنگل ہے...''

بازاروف نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ لیا۔

اینا سرگیونا اس پر جھک گئی ''یوگین! یہاں تو میں ہوں.....''

اس نے فوراً اپنا ہاتھ ہٹالیا اور پھریری سی لی۔

''الوداع'' ایکا ایکی اس میں ایک طاقت پیدا ہوگئی تھی اور اس کی آنکھوں میں آخری مرتبہ روشنی کی رمق جھلمائی۔ ''الوداع.....سنو.....تم جانتی ہو کہ میں نے اس وقت تمہارا بوسہ نہیں لیا تھا.....بجھتے ہوئے چراغ پر پھونک مارو اور اسے گل کردو.....''

اینا سرگیونا نے اپنے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیئے۔

''کافی ہے!'' اس نے دھیرے سے کہا اور اس کا سر تکیے پر ڈھلک گیا۔ ''اب.....تاریکی.....''

اینا سرگیونا آہستہ سے باہر چلی گئی۔

''جی'' واسلی آئونووچ نے دبی سی آواز میں اس سے پوچھا۔

''انہیں نیند آ گئی ہے۔'' اور یہ جواب اس نے اتنی آہستگی سے دیا کہ مشکل ہی سے سنا جاسکتا تھا۔ بازاروف کو ایسی نیند آئی کہ پھر اسے جاگنا نصیب نہ ہوا۔ شام ہوتے ہوتے اس پر مکمل طور پر غشی طاری ہوچکی تھی اور دوسرے دن وہ اس دنیا سے سدھار گیا۔ آخری وقت میں جو مذہبی رسوم سرانجام دی جاتی ہیں' انہیں فادر الیکسی نے انجام دیا۔ جب متبرک تیل نے اس کے سینے کو مس کیا' تو اس کی ایک آنکھ کھلی اور یوں معلوم دیا کہ پادری

اوراس کے چنغے کو دیکھ کراور خوشبوؤں کے دھوئیں اور مجسمہ کے سامنے والی روشنی کو دیکھ کر اس کے موت سے مرجھائے ہوئے چہرے پر خوف ودہشت کی ایک کپکپی سی دوڑ گئی ہے۔
آخرکاراس کی روح جسم کے جھمیلے سے آزاد ہوگئی اور گھر بھر میں ایک کہرام مچ گیا اور واسلی آلوئنووچ کو اچانک ایک دورہ پڑا ''میں کہتا ہوں مجھے بغاوت کرنی چاہیے'' ان کا گلا رندھ گیا تھا' لیکن وہ چیخے جا رہے تھے۔ ان کے چہرے سے آگ کے شعلے برس رہے تھے۔ چہرے کے خطوط مسخ ہو گئے تھے۔ مکّا تان کر دہ فضا میں جنبش دے رہے تھے۔ گویا کسی کو للکارا جا رہا ہے۔ ''اور میں بغاوت کرتا ہوں' میں باغی ہوں۔'' لیکن ایرینا ولاسیونا زاروقطار رو رہی تھیں اور ان کی گردن میں انہوں نے ہاتھ ڈال دیئے تھے اور دونوں زمین پر گر پڑے تھے۔

انفوشکا نے بعد میں نوکروں کے کوارٹر میں جا کر بیان کیا کہ ''ان بیچاروں کے سر ڈھلک کر برابر برابر یوں مل گئے' جیسے دوپہری میں بھیڑوں کے سر ڈھلک کر مل جایا کرتے ہیں۔''

لیکن دوپہری کی تپش بھی گزر ہی جاتی ہے اور پھر شام آتی ہے اور پھر رات آتی ہے اور پھر پُرسکون جھونپڑے کی طرف واپسی ہوتی ہے۔ جہاں تھکے ماندے مصیبت زدہ لوگ چادر تان کر سوتے ہیں........

(28)

چھ مہینے گزر گئے۔ کڑکڑاتا جاڑا آ پہنچا۔ بدرنگ نیلا آسمان ایک یکساں کیفیت کے ساتھ اونگھتا رہتا اور بادل کا نشان دُور دُور تک اس کی پیشانی پر دکھائی نہ دیتا اور پالا ایک دہشت ناک سکوت کے ساتھ پڑتا رہتا۔ برف کی دبیز ٹھساٹھس تہیں جم گئی تھیں۔ درختوں پر شبنم کے لرزاں قطروں نے انجماد کی حدوں کو چھو لیا تھا۔ چمنیوں سے بل کھاتا ہوا دھواں نکلتا رہتا اور جب لمحہ بھر کے لیے کسی دروازے کا پٹ کھلتا' تو بھاپ کے بادل تیزی سے امنڈتے دکھائی دیتے اور وہ شاداب چہرے جو یوں نظر آتے گویا جاڑے

نے انہیں ڈس لیا ہے اور وہ دوڑتے ہوئے گھوڑے، جن کے جسم سردی کے اثر سے سُن ہوکر رہ گئے تھے۔

جنوری کا مہینہ تھا۔ شام ہوتی جارہی تھی۔ فضا ساکت تھی اور اس سکوت نے ٹھنڈ میں دوگنی چوگنی شدت پیدا کردی تھی۔ شفق کی لال دھاریاں تیزی سے معدوم ہوتی جارہی تھیں اور میرینو کی کھڑکیوں میں شمعیں جھلملا رہی تھیں۔ پروکوفش نے ایک سیاہ فراک کوٹ اور سفید دستانے پہن رکھے تھے۔ بڑے خاص اہتمام سے وہ سات آدمیوں کے لیے دسترخوان بچھا رہا تھا۔ ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے کہ یہاں ایک چھوٹے سے گرجا گھر میں دوشادیوں کی رسم ادا ہوئی تھی، جن میں نہ تو عام شادیوں کا سا دھوم دھڑکا تھا اور نہ براتیوں کی چہل پہل تھی۔ کاتیا کارکادی سے اور فینشکا کا نکولائی پیئر وچ سے دامن بندھ گیا تھا اور آج نکولائی پیئر وچ اپنے بھائی کو الوداعی پارٹی دے رہا تھا۔ وہ کسی کام سے ماسکو جارہا تھا۔ اینا سرگیونا بھی اس رسم کے ادا ہوتے ہی دولہا دلہن کو قیمتی تحائف دینے کے بعد وہاں سے چلی گئی تھی۔

ٹھیک تین بجے یہ سب لوگ دسترخوان پر بیٹھے۔ میٹیا کی نشست کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ اس کے ہمراہ ایک نرس آئی تھی، جس نے کارچوبی کے کام کی ایک چمکدار ریشمیں ٹوپی پہن رکھی تھی۔ پافل پیئر وچ کاتیا اور فینشکا کے بیچ میں ٹھنسا بیٹھا تھا اور 'شوہر لوگ' اپنی اپنی دلہنوں کے برابر براجمان تھے۔ ہمارے ان احباب میں اب کچھ دنوں سے ایک تبدیلی آچکی تھی۔ وہ سب اب کچھ زیادہ توانا اور زیادہ خوبصورت ہوگئے تھے۔ البتہ پافل پیئر وچ ذرا جھٹک گیا تھا، مگر اس چیز نے اس کے چہرے سے ٹپکتے ہوئے وقار اور دبدبے میں کچھ اور اضافہ کردیا تھا......اور اب تو فینشکا کا چولا بھی بدلا ہوا تھا۔ بر میں نیا ریشمیں جوڑا، سر پر نرم مخملی رومال، گلے میں سونے کی چین اور یوں وہ بڑے ادب سے جھکی ہوئی چپ چاپ بیٹھی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود اپنا ادب کررہی ہے اور آس پاس کی دوسری تمام چیزوں کا بھی اور یوں مسکرارہی تھی گویا کہہ رہی ہو کہ ''گستاخی کی معافی چاہتی ہوں۔ اس میں قصور میرا نہیں ہے۔'' اور ایک وہی کیا سب کے سب ہی کچھ اس انداز سے مسکرارہے تھے گویا معذرت کررہے ہوں۔ یہ سب لوگ اک ذرا اکھڑے اکھڑے ہورہے تھے، اک ذرا افسردہ بھی تھے اور

دراصل وہ بہت خوش تھے۔ یہ سب ایک دوسرے کی خاصی مضحکہ خیز انداز میں تواضع کر رہے تھے۔ گویا انہوں نے یہ طے کیا تھا کہ آؤ ہم سب مل کر کوئی پھوہڑ سا سوانگ رچا ڈالیں۔ ان میں ایک کاتیا ایسی تھی، جو بڑی متانت سے بیٹھی تھی۔ اس کی نگاہوں میں خوداعتمادی کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی اور یہ تو خیر پتہ چل ہی رہا تھا کہ نکولائی پیئر وچ بہو کا والہ وشیدا بن چکا ہے۔ کھانے کے بعد وہ گلاس ہاتھ میں لیے اٹھ کھڑا ہوا اور پافل پیئر وچ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

''بھائی جان! آپ ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہیں.....آپ چھوڑ کر جا رہے ہیں.... خیر تو یہ یقین ہے کہ آپ زیادہ دنوں کے لیے نہیں جا رہے۔ پھر بھی میں اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں......کہ ہم کتنے......ہمیں کس قدر......حادثہ یہ ہے کہ ہم تقریریں کرنا نہیں جانتے۔ ارکادی تم کچھ کہہ دو۔''

''نہیں ابا جان۔ میں نے بالکل تیاری نہیں کی ہے۔''

''گویا میں نے بڑی تیاری کر رکھی ہے۔ اچھا تو بھائی جان! میں صرف اتنا کہوں گا کہ آپ ہم سے گلے مل لیں۔ خدا آپ کو اپنی حفظ و امان میں رکھے اور آپ جلد از جلد بخیریت واپس آئیں۔''

پافل پیئر وچ سب سے گلے ملا، پیار کیا اور ان سب میں میتیا بھی شامل تھا۔ جب فینشکا کی باری آئی تو اس نے اس کے ہاتھ کو بھی بوسہ دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ بوسے کے لیے ہاتھ بڑھانے کا طریقہ فینشکا نے ابھی اچھی طرح نہیں سیکھا تھا۔ پافل نے اپنا گلاس ختم کرتے ہوئے جو دوبارہ بھر دیا گیا تھا، ٹھنڈا سا سانس لے کر کہا ''دوستو خوش رہو! الوداع!!'' یہ آخری لفظ اس نے انگریزی میں بولا تھا، جس کی طرف کسی نے دھیان ہی نہیں دیا۔ پھر بھی سب کا دل بھر آیا۔

کاتیا جب ارکادی کے گلاس سے گلاس ملا رہی تھی، تو بہت آہستہ سے اس نے شوہر کے کان میں کہا ''بازاروف کے نام کا جام''۔ ارکادی نے اس کے جواب میں بڑی گرمجوشی سے اس کا ہاتھ دبایا، لیکن یہ فقرہ اس نے بلند آواز سے دہرانے کی جرأت نہیں کی۔

ختم شد؟.......کہانی بظاہر یہاں آ کر ختم ہو جاتی ہے، لیکن شاید ہمارے کسی قاری کو یہ کرید ہو کہ یہ سارے کردار، جنہیں ہم نے متعارف کرایا ہے، آج کل اس زمانے میں کیا کر رہے ہیں؟ تو لیجیے ہم ان کی تشفی کا سامان کیے دیتے ہیں۔

اینا سرگیونا نے ابھی پچھلے دنوں بیاہ رچایا ہے، مگر عشق سے سرشار ہو کر نہیں، بلکہ محض اخلاقاً۔ اور بیاہ کس سے کیا ہے، روس کے ایک ہونے والے لیڈر سے۔ آدمی ذہین ہے۔ وکالت کرتا ہے۔ دنیوی سوجھ بوجھ غضب کی ہے۔ ارادے کا دھنی ہے۔ لچھے دار تقریریں کرتا ہے۔ ابھی نوعمر ہے، ملنسار ہے، مگر جوش طبع کے نام ٹھنڈا برف ہے۔ دونوں کی قسمت میں راوی نے چین لکھ دیا ہے۔ آپس میں شیر و شکر ہیں۔ مکمل مسرت کا مقصد بھی حاصل کر ہی لیں گے۔ کیا عجب ہے کہ محبت کی نعمت سے مالا مال ہو جائیں۔ خالہ جان اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ جنازہ اٹھتے ہی لوگ انہیں بھول بسر بھی گئے۔ کرسانوف باپ بیٹے میرینو میں رہتے ہیں۔ ان کی بگڑی اب بن چلی ہے۔ ارکادی بڑی تندہی سے جائداد کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ فارم سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔ اصلاحات کے سلسلے میں جو پنچ مقرر ہوئے ہیں، ان میں ایک نکولائی پیئر وچ بھی ہے۔ بڑی عرق ریزی سے کام کرتا ہے۔ خون پسینہ ایک کر رکھا ہے۔ جب دیکھو ضلع کا دورہ کر رہا ہے، لمبی لمبی تقریریں جھاڑ رہا ہے۔ اس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ پسماندہ کسانوں میں شعور پیدا کرنا چاہیے، یعنی وہی پٹے پٹائے لفظ بار بار ان کے کانوں میں انڈیلے جائیں۔ یہاں تک کہ ان کا پسینہ چھوٹ نکلے۔ مگر سچ پوچھئے تو اس سے نہ تو مہذب طبقے کے وہ اشراف لوگ پورے طور پر مطمئن ہیں، جو اصلاحات کا ذکر بڑے جوش میں آ کر یا بہت افسردہ ہو کر کرتے ہیں۔ (یہ لوگ 'اصلاحات' کے آخری ٹکڑے کو ناک میں بول کر اسے کچھ فرانسیسی لہجہ عطا کر دیتے ہیں) اور نہ غیر مہذب طبقہ کے اشراف لوگ اس سے مطمئن ہیں۔ 'مردود اصلاحات' پر وہ دل کھول کر تبرا بھیجتے ہیں۔ یہ بیچارہ تو ایسا گئو ہے کہ اس کا گزارا نہ اِس کیمپ میں ہے، نہ اُس کیمپ میں۔

کاترینا سرگیونا کی گود میں ننھا نکولائی ہے اور میتیا اچھلتا کودتا پھرتا ہے اور فر فر باتیں کرتا ہے۔ فینشکا یعنی فیدوسیہ نکولیونا شوہر اور بیٹے کے بعد بہو پہ جان چھڑکتی ہے۔ بہو

جب کبھی پیانو پہ بیٹھ جاتی ہے تو پھر تو وہ اس کے کولہے سے ایسی لگ کے بیٹھتی ہے کہ سارا سارا دن گزر جاتا ہے اور اس کا سرکنے کو جی نہیں چاہتا۔ پیاتر کی بھی سنتے چلئے۔ حماقت اور رکھ رکھاؤ کا یہ پتلا ہمیشہ گردن اکڑائے رکھتا ہے، لیکن بیاہ اس کا بھی ہو گیا ہے۔ دلہن کے ساتھ ساتھ اس نے جہیز پہ بھی خوب ہاتھ مارا ہے۔ قصبے کے مالی کی بیٹی اس کے ساتھ بندھی ہے۔ مالی نے دو اچھے خاصے امیدواروں کو محض اس لیے ٹھکرا دیا کہ ان غریبوں کے ہاتھ میں گھڑی نہیں تھی اور پیاتر کے پاس صرف ہاتھ کی گھڑی ہی نہیں تھی بلکہ بکرے کی کھال کا ایک جوڑی جوتا بھی تھا۔

ڈریسڈن میں بردل ٹیریس پر دو اور چار بجے کے درمیان (چہل قدمی کے لیے یہ سب سے مناسب وقت ہوتا ہے۔) آپ کو ایک شخص نظر آئے گا۔ عمر پچاس کے لگ بھگ۔ بدرنگ بال۔ دیکھنے میں یوں لگتا ہے کہ گٹھیا کا مارا ہے، لیکن چہرے مہرے کی دلکشی باقی ہے۔ لباس میں تکلف موجود ہے اور وہ مخصوص آن بان قائم ہے جو مدت تک بڑے لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ شخص پافل پیٹر وچ ہے۔ ماسکو سے وہ اپنی صحت کے خیال سے غیر ملکی سفر پہ نکل گیا تھا اور اب وہ ڈریسڈن میں رہ پڑا ہے۔ یہاں انگریز اور روسی آنے جانے والوں کے ساتھ اس کی بیٹھک رہتی ہے۔ انگریزوں سے وہ بڑی سادگی سے بلکہ اک ذرا جھک کر ملتا ہے، لیکن وقار اور رکھ رکھاؤ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ وہ لوگ اسے ذرا بور ضرور سمجھتے ہیں، لیکن اس کی عزت بھی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صاحب آدمی کیا ہے، شرافت و تہذیب کا پتلا ہے۔ روسیوں کے ساتھ وہ زیادہ بے تکلف ہو جاتا ہے۔ خوب خوب جلی کٹی سناتا ہے۔ اپنے آپ پہ بھی طنز کرتا ہے۔ ان پہ بھی فقرے کستا ہے، لیکن یہ بات وہ بہت خوبی، نفاست اور بے نیازی سے کرتا ہے۔ سلافیل خیالات رکھتا ہے۔ یہ تو خیر سب جانتے ہیں کہ بڑے لوگوں میں اسے بڑی ممتاز اور معزز شخصیت سمجھا جاتا ہے۔ روسی کی وہ کوئی چیز نہیں پڑھتا، لیکن اس کے لکھنے کی میز پر راکھ جھاڑنے کی ایک چاندی کی پیالی رکھی ہے جو بالکل ایک کسان کی مڑی تڑی جوتی کی شکل کی ہے۔ سیاح اس کے پیچھے پیچھے بہت پھرتے ہیں۔ ماتف اِلیچ کولیازین کچھ دنوں کے لیے سیاست میں پڑ کر اس کا مخالف ہو گیا تھا مگر پھر بھی وہ اس سے ملنے کے لیے آیا اور مقامی لوگ تو جن سے وہ کبھی

کبھار ہی ملتا ہے اس کے سامنے ناک رگڑتے ہیں۔ کورٹ چیپل کے لیے اور لیسز میں جس پھرتی سے ہر بیرن راں کرسانوف کو ٹکٹ مل جاتا ہے اتنی پھرتی سے کسی کو بھی نہیں ملتا۔ اب بھی جتنا اس کے مقدور میں ہے وہ کوئی نہ کوئی ٹھکانے کی بات کرتا رہتا ہے۔ تھوڑا بہت ہنگامہ تو اب بھی وہ کیے جاتا ہے۔ آخر کوئی بات تو تھی کہ ایک زمانے میں محفلوں میں اس کی اتنی دھوم تھی، لیکن اب زندگی اس کے لیے ایک بوجھ بن کر رہ گئی ہے اور جتنا بھاری یہ بوجھ ہے اس کا احساس خود اسے بھی نہیں ہے۔ کوئی روسی گرجا میں جا کر اسے ذرا دیکھے۔ کسی کونے میں دیوار سے کمر ٹیک کر وہ کھڑا ہو جاتا ہے اور گھنٹوں بے حس و حرکت کھڑا رہتا ہے اور خیالات کی رو میں جانے کدھر کدھر بہ جاتا ہے۔ بڑے تلخ انداز میں وہ اپنے ہونٹوں کو بھینچ لیتا ہے اور پھر یکا یک وہ چونکتا ہے اور غیر محسوس طور پر کراس کا نشان بنانے لگتا ہے.........

مادام کوکشین بھی باہر چلی گئی تھی۔ وہ ہائیڈل برگ میں ہے اور آج کل طبیعات نہیں بلکہ تعمیرات کا مطالعہ کر رہی ہے اور خود اس کی روایت کے مطابق اس نے تعمیرات میں چند نئے اصول دریافت کیے ہیں۔ طلباء سے اب بھی وہ بہت یارانہ گانٹھتی رہتی ہے اور بالخصوص ان نوجوان روسی طلباء سے جو طبیعات اور کیمسٹری پڑھ رہے ہیں۔ ہائیڈل برگ میں ان طلباء کی بڑی ریل پیل ہے۔ سیدھے سادے جرمن پروفیسر پہلے تو ان کی کوڑھ مغزی اور نالائقی پر حیران ہوتے ہیں۔ اس قماش کے دو تین نوجوان کیمسٹ ہیں۔ جو بیچارے نائٹروجن اور آکسیجن میں بھی تمیز نہیں کر سکتے، لیکن جو قنوطیّت اور خودداری کی پوٹ بنے پھرتے ہیں۔ ستینی خوف ان کے ساتھ پیٹرسبرگ کے گلی کوچوں کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔ وہ بھی بڑا بننے کے لیے پر تول رہا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ بازاروف کے 'مشن' کو آگے بڑھا رہا ہے۔ سنتے ہیں کہ کسی نے پکڑ کے وہ مار بجائی کہ حضرت کی طبیعت ہری ہو گئی، مگر اس نے بھی اس سے خوب انتقام لیا۔ اس نے کسی گمنام اخباری چیتھڑے میں ایک چھوٹا سا مضمون لکھ مارا جس میں یہ اشارہ کیا گیا تھا کہ جس شخص نے اس کی مزاج پرسی کی تھی، وہ بڑا بزدل آدمی تھا۔ وہ اسے طنز بتاتا ہے۔ اس کا باپ اب بھی اس کی ناک میں دم کیے رکھتا ہے اور اس کی جورو سمجھتی ہے کہ گاؤدی ہے.....ادیب ہے۔

روس کے ایک دور دراز علاقے میں کسی گاؤں کے قریب ایک چھوٹا سا قبرستان ہے۔ ہمارے تقریباً سارے قبرستانوں کی طرح اس پہ بھی روگ برس رہے ہیں۔ اس کے گرداگرد جو کھائیاں کھدی ہوئی تھیں' ان میں اب لمبی لمبی گھاس کھڑی ہے۔ لکڑی کے خستہ حال کراس اب جھک چلے ہیں۔ جن کنگروں پہ وہ نصب تھے اور جن پہ کبھی روغن کی چمک دمک بھی تھی' اب ان کے ساتھ لٹکے لٹکے وہ دیمک کی غذا کا کام دے رہے ہیں۔ پتھر کی سلیں بھی سب اپنی جگہ سے سرکی ہوئی ہیں گویا کسی نے پیچھے سے انہیں دھکیل دیا ہے۔ دو تین چھدرے درخت کھڑے ہیں جن کی وجہ سے تھوڑا بہت سایہ تبرک کے طور پر نظر آ جاتا ہے۔ بھیڑ بکریاں قبروں کے درمیان منہ اٹھائے پھرتی ہیں...... لیکن ایک قبر ان میں ایسی ہے جسے نہ کسی انسان کے ہاتھوں نے میلا کیا ہے اور جسے نہ کسی جانور نے روندا ہے۔ البتہ جب پو پھٹتی ہے تو چند ایک چڑیاں اس پہ آ بیٹھتی ہیں اور میٹھی آواز میں چہچہانے لگتی ہیں۔ اس کے گرداگرد ایک آہنی کٹہرا بنا ہوا ہے۔ دو چھوٹے چھوٹے درخت اس کی آنتی پائینتی کھڑے لہراتے ہیں۔ اس قبر میں یوگین بازاروف پڑا سوتا ہے۔ اکثر اس چھوٹے سے گاؤں سے جو یہاں سے ایسا دور نہیں ہے' دو نحیف و نزار بوڑھے اس قبر پہ آتے ہیں...... ایک شوہر ایک بیوی۔ ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہلتے کانپتے وہ یہاں پہنچتے ہیں۔ کٹہرے کے پاس پہنچ کر وہ گھٹنوں کے بل گر پڑتے ہیں اور پھوٹ پھوٹ کر گھنٹوں روتے رہتے ہیں۔ ان کے دل میں ایک کسک پیدا ہوتی ہے اور پھر وہ ٹکٹکی باندھ کر اس گونگے پتھر کو تکنے لگتے ہیں جس کے بوجھ تلے ان کا بیٹا آرام کر رہا ہے۔ ان میں آپس میں ایک آدھ بات ہوتی ہے۔ پتھر سے گرد کو صاف کرتے ہیں۔ درخت کی کسی شاخ کو پکڑ کر سیدھا کر دیتے ہیں اور ان کے ہاتھ پھر دعا کے لیے اٹھ جاتے ہیں۔ یہ جگہ ان کے قدم تھام لیتی ہے۔ ان کا دامن پکڑ لیتی ہے۔ یہاں وہ اپنے بیٹے سے قریب تر ہوتے ہیں۔ یہاں انہیں اس کی پچھلی باتیں یاد آنے لگتی ہیں........

کیا یہ ہوسکتا ہے کہ ان کی دعائیں' ان کے آنسو بے سود ہوں؟ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ محبت' مقدس والہانہ محبت ہمہ گیر طاقت کی حامل نہ ہو؟ نہیں نہیں۔ اس قبر میں جو دھڑکتا ہوا دل مدفون ہے' اس میں کتنی ہی تیزی تندی ہو' کتنا ہی وہ معصیت آلود رہا ہو' کتنی ہی اس

میں بغاوت کی آ گ بھری ہو لیکن لحد پر جو پھول کھلتے ہیں وہ تو بڑی معصومانہ نگاہوں سے ہمیں ڈالیوں کی اوٹ سے جھانکتے رہتے ہیں۔ وہ محض امر شانتی کی ''بے نیاز'' فطرت کی امر شانتی کی کہانی ہی نہیں سناتے ہیں۔ وہ ہم سے جاوداں تسلیم ورضا اور اتھاہ زندگی کا افسانہ بھی کہتے ہیں۔

☆......☆☆......☆

نئی کتاب:

عورت کتھا

غیر ملکی زبانوں کے خواتین ادیبوں کے افسانے

(اردو تراجم)

انتخاب و ترتیب: یاسر حبیب

اس کتاب میں براعظم افریقا، ایشیا، جنوبی امریکا اور آسٹریلیا کی ممتاز خواتین ادیبوں کے 44 افسانے شامل ہیں۔

کتاب کی خریداری کے لیے رابطہ کریں۔

سٹی بک پوائنٹ، نوید اسکوائر، اردو بازار، کراچی۔

رابطہ نمبر 03122306716 (واٹس ایپ یا کال)

انتظار حسین

مجموعہ:
چراغوں کا دھواں (آپ بیتی)
دِلی تھا جس کا نام
اجملِ اعظم
بوند بوند
جنم کہانیاں
قصہ کہانیاں

ناول:
بستی
تذکرہ
چاند گہن
آگے سمندر ہے

افسانے:
خیمے سے دور
زمین اور فلک اور
آخری آدمی
کنکری
دن اور داستان
خالی پنجرہ
گلی کوچے
کچھوے
شہر افسوس
شہرزاد کے نام
ملاقاتیں
نظریئے سے آگے

تراجم:
گھاس کے میدانوں میں (ناول) چیخوف
فلسفہ کی نئی تشکیل (فلسفہ) جان ڈیوی
An Unwritten Epic & other Stories
نئی پود
ناؤ: اور دوسری منتخب کہانیاں

سفرنامے:
نئے شہر پرانی بستیاں
زمین اور فلک اور

Rs. 250.00

www.sang-e-meel.com
ISBN 969-35-1723-7
9 789693 517231